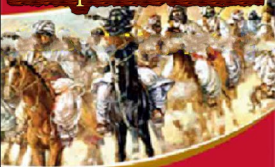


بلوچ قوم

2

تاریکی اور جائیدادی مہم

www.paknovels.com



ڈاکٹر شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

بلوچ قوم

2

قبائلی اور جاگیرداری عہد

زعیم بخاری نے
گوشہ ادب سے شائع کی

کتاب : بلوچ قوم: قبائلی اور جاگیرداری عہد
مصنف : شاہ محمد مری
اشاعت : 2014ء
قیمت : 390 روپے

شاہ محمد مری

اسٹاکسٹ:
سیلز اینڈ سروسز
کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کونڈہ۔

فون: 092-81-2843229، فیکس: 092-81-2837672

گوشہ ادب
جناح روڈ، کونڈہ

e-mail: goshaeadab@yahoo.com

انتساب

اُس خوش نصیب ساعت کے نام
جب انسان نے اولین آلہ پیداوار ایجاد کیا

دوسرا باب: بلوچ مویشی بانی

81

- 85 بھڑ..... بلوچ کی روٹی روزی
- 86 بھڑ پال معیشت میں طبقاتی درجہ بندی
- 91 اون اور منڈی کا پھندا
- 94 جلو اور سات
- 97 جانوروں کا قتل عام
- 103 شیر و روغن
- 108 شتر بانی (جت)
- 111 اشیائے ضرورت کی مقامی صنعتیں
- 116 ٹیکس اور امدادِ باہمی

تیسرا باب: بلوچ زراعت

121

- 131 لُڈ آف
- 139 سیاہ آف
- 154 لُڈ آف کے پیداواری رشتے

چوتھا باب: سمندری پیداواری رشتے

165

- 167 ماہی گیری
- 174 بوجیگ

فہرست

8

پیش لفظ

پہلا باب: بلوچ سر قبیلوی نظام

13

18

بلوچ قبائل

59

قبیلے کا تنظیمی ڈھانچہ

69

قبائلی اور علاقائی اتحادیے

75

بلوچ قبائلی جنگی معیشت

176	کشتی سازی
177	ماہی گیری کا جال

پانچواں باب: بلوچوں کا ویلیوسٹم

183

188	پیدائش سے جوانی تک
197	طرز معاشرت
201	مذہبی معاملات
209	ممنوعات
210	کھیلیں
214	ادب
217	موسیقی
222	رقص
223	لوک کہانی
225	حال حوال
230	گالی
231	نظام انصاف
236	دستار و داڑھی
236	بیماری کے عقائد
239	موت کی رسوم

پیش لفظ

بلوچ اپنی شناخت کے بارے میں بہت حساس ہے۔ ہر نارمل انسان کی طرح وہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد کا تذکرہ احترام کے ساتھ کیا جائے، اُسے اشرافِ نسل کا بتایا جائے۔ اپنا چونکہ نظریہ ہی یہ ہے کہ انسان ہوتا ہی اشرف المخلوقات ہے۔ نسل اور خون کا خالص، ناخالص ہونا تو بس گپ ہے جو حاکم اور زور آوروں نے قائم کر رکھی ہے۔ اصل میں اصل اور نقل، خاندان اور کمینہ تو کرتوتوں سے متعین ہونا چاہیے مگر فیوڈلوں نے اس کی بجائے پیشہ کو اصل اور نقل کی بنیاد بنا کر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔ لوہے کا کام کرنے والا نقلی اور کچھ کام نہ کرنے والا بادشاہ۔ غدار بادشاہ ہے، اور عوام کا خادم کمینہ۔ لطیفے ہیں بھی۔ اور ان غیر سنجیدہ باتوں کو سنجیدہ بنانے والوں کے خلاف ہی تو ساری جنگ رہی ہے اپنی۔

بلوچ پر لکھنے والے آج تک کے سارے مؤرخوں نے ڈنڈا لے کر بلوچ کو بھگائے رکھا۔ ہمیں سکونت نصیب ہی نہ ہونے دی۔ کسی نے ”بھو“ کہہ کہ ہمیں کسپین سی سے دوڑا دیا، کسی نے حلب سے ہماری دوڑ کی لگوا دی اور کسی نے فارس سے..... ہم اپنی دلیلوں کی عاجزانہ ٹوکری لے کر ان سب سے الگ نظریہ لے آئے۔ وہ یہ کہ ہم کہیں سے مہاجر ت کر کے نہ آئے۔ بلکہ ہزاروں

برسوں سے یہی ہمارا وطن رہا ہے اور یہی ہمارا وطن ہے۔

ایک دوسری غلط فہمی ہم میں یہ ڈال دی گئی ہے کہ ہم تو گویا دو الگ الگ نسلوں یعنی دراوڑ اور آریا سے بنے ہوئے ہیں۔ کسی نے ہماری کھوپڑی ناپنی شروع کر دی تو کسی نے ہماری ناک کو تو لٹا شروع کر دیا۔ کسی نے ہمارے دانتوں کے بیچ فاصلے کو بیان کیا تو کسی نے ہماری زبان کا آریائی دراوڑی میں بٹوارہ کر دیا۔ دراوڑستان تک قائم ہونے لگا۔ مگر مہر گڑھ دریافت نے ان سب کے فرسودہ ترازو توڑ کر اور فٹ ٹیپ کو ان کے استاد کار ہاتھوں سے چھین کر انہیں تاریخ کی ردی ٹوکری میں جا کے پھینک دیا۔

اور پھر، کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ قبائل روز اول سے موجود تھے اور آخر تک اسی طرح قائم رہیں گے۔ یہ غلط تصور ہے۔ قبائل میں تو ساخت و بگاڑ ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ خود ہماری زندگیوں میں نئے نئے قبیلے سامنے آئے۔ پہلے سے موجود قبیلوں کی بڑی بڑی شاخیں کسی دوسرے قبیلے میں جا کر ضم ہو گئیں۔ لہذا صرف تبدیلی کو دوام ہے۔ جو نہ تھا موجود ہوا، جو مستحکم وجود رکھتا تھا تحلیل ہوا۔

ایک غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ سر قبیلوی نظام خود فارم بھی ہے اور کائنیت بھی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ غلام داری، سر قبیلوی، جاگیر داری، سرمایہ داری اور ایک بڑی حد تک سوشلزم سب کے سب طبقاتی سماج ہوتے ہیں۔ لہذا ان سارے سماجوں میں طبقاتی تضاد و تصادم ایک بڑی حقیقت کے بطور ہمیشہ موجود رہتا ہے اور چونکہ دنیا میں ہر جگہ سر قبیلوی نظام متصل ہوتا ہے فیوڈل نظام سے، اس لیے اس میں کسان اور جاگیردار کے بیچ تلخ و شیریں تعلقات رہتے ہیں۔ اپنی آزادی کے لیے کسان طبقہ کبھی خفیہ و خفہ اور کبھی اعلانیہ اور متحرک قسم کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ جبکہ فیوڈل اُسے ایسا کرنے نہیں دیتا، طاقت سے بھی، پیر کے دم درود سے بھی، اور شاعر کی دانشوری سے بھی۔

بلوچوں میں بھی قبائلی نظام کے ساتھ ساتھ (اور اُس کے بطن سے) فیوڈل نظام پروان چڑھتا رہا۔ اور قبائلی نظام میں رہتے ہوئے بھی کسان بغاوتیں نمودار ہوتی رہیں۔ سر قبیلوی نظام کے

آقائے اپنے انتظامات کے ذریعے ان کسان بغاوتوں کے ذکر کو کتابوں، محاوروں اور شاعری سے پرے رکھا۔ یوں بے شمار کسان مزاحمتیں بلا نوٹس و تذکرہ وقت کی دھند میں گم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک کسان تحریک آج سے پانچ صدی قبل 1574 میں چلی تھی۔ جو کہ بٹائی کی شرح میں کمی کے مطالبہ سے شروع ہوئی تھی۔ ”جلالریں کرخا“ کے علاقے سے شروع ہونے والی اس کسان بغاوت کی قیادت سوار رکھیا کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک سندھ تک پھیل گئی۔ جاگیرداروں نے خان قلات کو مدد کے لیے پکارا۔ چنانچہ 1574 میں امیر سنجہ نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی میرو کے ساتھ ایک بڑا لشکر ”جلالریں کرخا“ بھیج دیا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ کسانوں کا لیڈر سوار جنگ میں مارا گیا اور کسان تحریک کچل دی گئی۔ کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں ان چھوٹی بڑی مزاحمتوں اور ان سے متعلق ادبی کاوشوں کو ڈھونڈ کر کتاب میں شامل کیا جائے۔

ان ساری کسان، اور بین القبائلی لڑائیوں میں ان ساری نقل مکانیوں میں نہ تو ساری آبادی قتل ہوئی اور نہ ہی سب کے سب لوگ علاقہ چھوڑ گئے۔ ان پہاڑوں، دروں اور غاروں میں کچھ انسان تو ضرور بچ گئے ہوں گے جو بلوچوں کے کسی نہ کسی قبیلے سے متعلق تھے یا پھر اس قبیلے سے وابستہ ہو گئے تھے۔ رند کے آنے سے قبل بلوچستان کا کوئی حصہ بھی آدم زاد سے خالی ہرگز نہ تھا۔ اس لیے ہم اپنی داستانوں میں جب پوری بلوچ قوم کو محض فرد واحد کی اولاد کہتے ہیں تو یہ مکمل سچ نہیں ہے۔ ہم چاکر اور گوہرام کی اولاد ضرور ہیں مگر چاکر اور گوہرام بھی کسی کے بیٹے پوتے اور پڑپوتے تھے۔ وہ ہمارے اجداد تو تھے ہمارے جدا مجد بالکل بھی نہیں۔ ہمارے دریا کا سرچشمہ تو بہت دور واقع ہے۔

ہمارے بارے میں انگریز کی مرتب کردہ تاریخ بھی لفظ بہ لفظ درست نہیں ہے۔ اس میں گردن توڑ جھول موجود ہیں۔ دانستہ اور غیر دانستہ دونوں طرح سے غلط بیانی کی گئی ہے۔

اسی طرح، نظریہ پاکستان، مقتدرہ زبان اردو اور اسلام کی تکون، تاریخ کو اپنے مخصوص نکتہ نگاہ کے اندر سیکر کر بلوچ کی سالمیت کو مجروح نہیں کر سکتے۔ تاریخ کے بارے میں یہ تینوں سیڈ (یعنی ہماری سینہ بہ سینہ چلنے والی روایت، برطانوی ہینڈ بیگ والی تاریخ اور شناخت کی تلاش میں سرگرداں بے

ایک آخری بات؛ وہ یہ کہ بلوچ کا رہن سہن، رسوم و عقائد، تہذیب و ثقافت کیا ہے؟۔ یہ بحث ہم اس جلد میں جان بوجھ کر لائے۔ اس لیے کہ رسوم و رواج صرف اور صرف قبائلی اور زرعی دور بنتے ہیں۔ صنعتی دور میں رواج نہیں، لکھا ہوا آئین بنتا ہے۔ رسوم و رواج اپنے، مقامی اور دیسی ہوتے ہیں جبکہ آئین میں درآمدی شقیں بہت ساری ہوتی ہیں۔ رواج شروع میں سب اچھے ہوتے ہیں، آگے جا کر سماجی ترقی انہیں اپنے لیے رکاوٹ یا زنجیر دیکھتی ہے اور انہیں یکسر ختم کرنے یا بدل دینے کی کوششیں کرتی ہے۔ ہم نے ان بند رواں تبدیلیوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔

اس خواہش کہ ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ خدا کرے بلوچ سما کی روانی جاری و ساری رہے، اسے سکوت و جمود نصیب نہ ہو۔

شاہ محمد مری

ماوند

جنوری 2014

شناختہ پاکستانی مؤرخ (بلوچ کے بارے میں ہماری معلومات کو محدود رکھنے کے وسیلے رہے ہیں۔ خود بلوچ مؤرخوں نے جب بھی تاریخ نویسی کے لیے قلم سنبھالا تو دراصل اپنے قومی مستقبل کے لیے موت کا نوحہ ہی لکھا، اس لیے کہ ہم نے اپنی قوم کو ایک ایسی نفسیات دے دی جس میں ان کے لیے ماضی میں کھوکھلا جانے کی منظر کشی کے علاوہ اور کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے مؤرخ نے قوم کو مستقبل دیا ہی نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہم ماضی سے رشتہ توڑنے کی حماقت بالکل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ترقی تو نام ہے تواریخی تسلسل کا۔ ماضی کے پیٹ سے حال اور حال کے بطن سے مستقبل پیدا ہوتا ہے۔ بلوچ کے پاس بلاشبہ ایسی تاریخ موجود ہے جس پر شرمندگی کے بجائے فخر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس اثاثہ کو سنبھال کر اسے جھاڑ صاف کر کے ہمیں حسین، روشن اور ناقابلِ بیاں مستقبل کے لیے قوم کی فکری راہنمائی کرنا ہوگی۔ بلوچ مؤرخ اور دانشور ابھی تک اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا نظر نہیں آتا۔ وہ اس تابناک تاریخی ورثے پر ایک حسین مستقبل کے خدوخال نہ دے سکا۔ یعنی وہ، تاریخ کو اُس نقطہ نظر سے دیکھ ہی نہ سکا جو ہمیں ماضی پرستی سے نکال لے۔ بلوچ کی حرکت و جہد بھری تاریخ اُس کے لیے شاندار حال اور روشن مستقبل کے تسلسل میں بڑی اہلیت رکھتی ہے۔ میں نے اسی اہلیت کو دیکھنے جانچنے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور گوشہ تحقیق و تالیف و تصنیف سے مبرا رہ گیا ہے۔ بلوچ کی مرحلہ وار معاشی سرگرمیوں کی سیڑھی چڑھنے کا آنکھوں دیکھا حال ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا۔ ایک طائرانہ نگاہ ہم نے ڈال تو دی مگر یہ ناکافی ہے۔ اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اعداد و شمار سے مکمل طور پر محروم ملک میں ہم اعداد و شمار دے ہی نہیں سکتے۔ جو منافع ہیں بھی وہ سب کے سب غلط اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ پچھلے ایڈیشن تک تو پھر بھی کچھ نہ کچھ باوردار ڈیٹا موجود تھا۔ اُس کے بعد کی مجرم وفاقی اور چور صوبائی حکومتوں نے اعداد و شمار سے یوں خوف کھایا جیسے پاگل کتے کا کاٹا، پانی سے خوف کھاتا ہے۔ وہ Movable کو دبئی لے گئے، Immovable پر گرد و غبار کی ایسی تہیں چڑھادیں کہ کوئی شریف حکومت ہی سے مطلع صاف ہو سکتا ہے۔ اور شریف حکومت اس منطقے میں بورژوا الیکشن سے تھوڑی بنتی ہے؟!!

پہلا باب

بلوچ سر قبیلوی نظام

یافتہ اور منظم جتنی کوئی بھی تہذیب ہو سکتی ہے۔ یہ حکومت کی اولین صورت تھی۔ دوسری کسی بھی تنظیم کی طرح اسے بھی اپنا تنظیمی ڈھانچہ اور لیڈر شپ بنانے پڑے۔ قبیلے نے خود اپنا ضابطہ اخلاق اور ضابطہ وقار بنائے۔ اس نے ایک کلچر پیدا کیا جس نے سب کے لیے مرکزی ویلیو سسٹم کے بطور کام کیا۔ اس کلچر کی پابندی سب پر لازم ہوئی۔ یہی کلچر گویا اس کا آئین بن گیا۔ قبیلے کے سارے ممبروں کے لیے لازم ٹھہرا کہ وہ اپنے قبیلوی آئین کو تسلیم کریں، اور اسے اپنے دوسرے قبائلی بھائیوں پر لاگو کریں۔

گروہ (قبیلے) کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ حفاظت اور سیکورٹی مہیا کرے۔ پڑوسی ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے چلے آ رہے ہیں۔ جب کوئی جھگڑا شروع ہوتا ہے تو دونوں قبیلے عموماً اسے اپنے کلچر کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر جھگڑا ایک جنگ کی شکل اختیار کرے تو قبیلے کی لیڈر شپ کو جنگ کرنا پڑتا ہے اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنی طرف اموات کم سے کم کرائے۔ اور جتنی جلد ممکن ہو فتح پائے، یا کوئی حل نکالے۔

جب بھی قبیلہ فرد کو بہبود، سیکورٹی، کلچر اور ایک سیاسی نظام دینے کے قابل نہیں رہتا تو پھر سمجھئے کہ قبائلی ڈھانچہ دیمک زدہ ہو جاتا ہے اور اس نے حتمائے رفتہ رفتہ ختم ہو جانا ہے۔ جب بھی ہم کسی قوم بالخصوص بلوچ کی قبیلوی ساخت کی بات کریں گے تو ہم دراصل ایک خانہ بدوش پس منظر رکھنے والے معاشرے کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ (گو کہ اب یہ صورت نیم آبادی اور نیم خانہ بدوشی والی ہے)۔

اسی طرح ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے کہ بلوچ سر قبیلوی نظام کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بلوچستان کے طول و عرض میں قبائلی نظام ایک جیسا اور خالص کلاسیکل انداز میں موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچوں میں سر قبیلوی نظام کے ساتھ ساتھ اس سے پیچھے والے نظام یعنی غلام داری بھی موجود تھی اور اس سے آگے والا نظام یعنی جاگیر داری نظام بھی موجود رہا۔ (ہمارے ہاں قبائلی نظام کے ساتھ ساتھ غلام داری نظام بیسویں صدی کے وسط تک باقاعدہ جاری تھا)۔

بلوچ اپنی شناخت کے بارے میں بہت حساس قوم ہے۔ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود کو معزز

انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ لہذا وہ الگ تھلگ رہ ہی نہیں سکتا۔ کرہ ارض پہ اس کی سرشت اور حرکتیں ہی ایسی ہیں کہ اس کے دشمن بہت ہوتے ہیں۔ اور خواہ کوئی فرد کتنا ہی رستم اور سہراب (دونوں بلوچ تھے) کیوں نہ ہو، اسے ادھر ادھر خود سے زیادہ قوی اور طاقتور مخلوق سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ اس لیے فرد کو تحفظ چاہیے، حفاظت چاہیے۔ اور چونکہ انفرادی طور پر حفاظت کرنے کے وسائل ایک اوسط آدمی کے پاس نہیں ہوتے اس لیے وہ ایک اجتماع، ایک اکٹھ، اور ایک ایسوسی ایشن بناتے ہیں۔ وہ اپنے وسائل اور قوتیں باہم ضم کر دیتے ہیں تاکہ وہ ایک نارمل زندگی گزاریں۔

..... یوں گروہی (قبائلی) زندگی شروع ہوئی تھی۔ اس گروہی زندگی (حکومت) نے اپنے ممبروں کو سیکورٹی دی، اور بہبود دی۔ اس کا سماجی ڈھانچہ کچھ اس طرح منظم ہے کہ جب لوگ اس سماجی سیٹ اپ میں پیدا ہوتے ہیں تو انہیں آٹو میٹک انداز میں اس کی ممبر شپ ملتی ہے۔ انسان کی گروہی زندگی اس زمانے میں شروع ہوئی جب وہ خانہ بدوشی پہ مجبور تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خانہ بدوشی ایک تہذیبی ادارہ ہے۔ اتنا ہی جدید، ترقی

شیر باز مزاری نے لکھا کہ بلوچ کا اولین تذکرہ باز لطیفی تاریخ دان پروکوپینس کے ہاں ملتا ہے جس نے انہیں چھٹی صدی عیسوی میں کا کاس کے پہاڑوں میں بتایا۔

بلوچوں کی تنظیم بہت ہی متفرق انداز میں قائم ہے۔ اُن میں سے ایک ترکی والی بنیاد ہے۔ بے شمار الفاظ ہم میں اور ترکی زبان میں مشترک ہیں۔ تمن، بولک اور اولس وغیرہ۔ اسی طرح چاکر، سنجر اور زنگی بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے ہمارے ہاں پورے کے پورے قبائل موجود ہیں۔ (2) مگر یہ سارا تذکرہ بہت حالیہ ہے۔ ہمیں مہر گڑھ زمانے کے لوگوں کے بارے میں جاننے میں ابھی بہت زمانہ لگے گا۔

1- بلوچ قبائل

اردبائی

ان لوگوں کو کواشی بھی کہتے ہیں۔ بندر عباس کے بلوچوں کو عباسی کہتے ہیں۔ پاکستانی بلوچستان میں یہ علیحدہ وجود نہیں رکھتے۔ مختلف قبیلوں کی بہت چھوٹی ذیلی شاخوں کی صورت وجود رکھتے ہیں۔

اسماعیل زئی

یہ قبائلی اتحاد یہ ماضی قریب میں بلوچوں کے کچھ چھوٹے قبیلوں کے اکٹھے ہونے سے وجود میں آیا۔ یہ لوگ ایران و پاکستان کی سرحد کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے علاقے کوہ یارت، غور بند، چیشمی، داکم، حیدر آباد، مزار آب اور دھک پر مشتمل ہیں۔ 1937-38 کی بغاوت کے دوران شاہ ایران کی فوجوں نے اسماعیل زئی قبیلے کو شکست دی۔ فقیر زئی، خود زئی، کریم زئی اور اللہ بخش اس کے ذیلی طائفے ہیں جبکہ تو تو زئی، شاہوزئی، حسن زئی اور محمد زئی نامی دوسرے بلوچ قبائل اس میں جذب ہو چکے ہیں۔

بادینی

یہ بلوچ قبیلہ پاکستان، ایران، افغانستان، ترکمانستان، ماسکو کی بلوچ آبادی میں وجود

محترم اور اصلی قرار دینے میں سردھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہوتا ہے۔ ہر کسی کو اگر اپنی برتری کا نہیں تو کم از کم دوسرے سے برابری کا یقین ضرور ہے۔ ”میں“ میرا دادا، میرا قبیلہ، اس ”میں“ نے بلوچ کو تباہ بھی بڑا کیا مگر اسے بقا بھی اسی ”میں“ نے دی۔ بس یہ ”میں“ ذرا سا ”ہم“ ہو جائے تو بلوچ قوم کے دارے نیارے ہو جائیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ ہر انسان اشرف المخلوقات میں سے ہے۔ عربی عجمی پہ کوئی بالادستی نہیں رکھتا اور گورا کالے پہ کوئی برتری نہیں رکھتا۔ اپنی قوم اور اس وطن کے لیے سب سے غریب اور سب سے دھتکارے ہوئے بلوچ لڑے ہیں۔ بلوچ ویلیوسٹم کا تقدس انہی غریب (معاشی یا سماجی طور پر) لوگوں کے دم سے قائم ہے۔ فضیلت کے چکر میں پڑے بغیر اپنی اس تصنیف میں ہم نے مختلف نظریات (اُن کے حوالے دے کر) بیان کر دیے ہیں۔ ہم ہر باب کے اندر اصلی نقلی کی تفریق کے خلاف بات کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جو نہ تو سائنسی ہے، نہ ہی مستند اور نہ ہی علمی ادبی لحاظ سے پسندیدہ۔ شیخ سعدی نے کہا تھا:

بنی آدم اعضاءك ديگر اند

كه در آفرينش زيك گوهر اند

چو عضو به درد آورد روزگار

دگر عضوهارا نماند قرار

ایک اور بات کہنی ضروری ہے کہ آج کے ہمارے سارے اہم قبائل بہت بعد میں تشکیل پائے ہیں۔ آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مری، بگٹی، مینگل سے لے کر لڈیگاری، بزدار، بلیدی اور کھراڑیں تک سارے اہم قبائل کا ذکر ہمیں پرانی بلوچی شاعری میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ (1) ایک بات کا خیال رہے کہ مشرق کی ہر جنگی قوم کی طرح بلوچ قوم اور اس کے ہر قبیلے کی ابتدا اور تاریخ بھی بہت دھندلی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بلوچوں کا ذکر سب سے پہلے ساسانی دور حکومت میں (22-651 عیسوی) ”شاہنامہ فردوسی“ میں ملتا ہے۔ جہاں یہ حقیقت چھلکتی ہے کہ بلوچ، ظالم حکمران نوشیروان کے عہد تک ایک منظم جماعت بن چکے تھے۔ مگر سردار

یہ قبیلہ رند و لاشار کے زمانے (پندرہویں صدی) تک بطور منظم قبیلہ موجود نہ تھا۔ اس کی موجودہ صورت کی تشکیل، بہت بعد میں ہوئی۔ کوہ سلیمان میں سنگھڑ درے کا مالک یہ رند قبیلہ کیسرا نڈیوں کی طرح موہی خیل اور جعفر قبیلوں کے اڑوس پڑوس میں آباد ہے۔ ڈرگ کھور، بزدار اور کیسرا نڈی کے بیچ حد بندی کرتا ہے۔ بزدار کا علاقہ سارے کا سارا کوہستانی بلندیوں گھاٹیوں پر مشتمل ہے۔ کھترانڈ اور بگٹی بھی بزدار کے پڑوسی ہیں۔ اس کی ذیلی شاخوں میں دولانڈی، لدوانڈی، غلامانڈی، چاکرانڈی، سیہانڈی، شاہوانڈی، جلالانڈی، دوستلانڈی، جہانانڈی، احمدانڈی، جافرانڈی، اور رستمیانڈی شامل ہیں۔

بارتھی بزداروں کی وہ بستی ہے جس پر 1857 میں انگریزوں نے قبضہ کر کے اسے آگ لگا دی تھی۔ کوہ سلیمان اور راجن پور کے علاوہ بزدار لوگ ملتان، لیہ، تونسہ، دادو، ٹنڈوالہار، ٹنڈو محمد خان، ٹنڈو غلام علی، سکھر، میرخانڈی، خیرپور، گھوٹکی، سیہون، کھپرو، حیدرآباد اور میرپور ماتھیلو میں آباد ہیں۔ یہ لوگ بلوچستان و پنجاب کے سرحدوں پہ تو مویشی بانی کرتے ہیں اور بقیہ علاقوں میں کاشتکاری۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی ہیں۔

بلفتی

شاہ لطیف کی شاعری میں ”برفت“ کے بطور ان کا ذکر موجود ہے۔ ماوند میں ایک باغار پر اس قبیلے کی کلمتی قبیلے کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں دونوں کی تباہی کے آثار ابھی تک ”باغار سر“ میں موجود تھے۔ یہ لوگ سیہون، کوٹلی، لیاری، لسلیلہ اور مکران میں بکھرے انداز میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ باہو، چاہ بہار اور ڈیرہ جات میں بھی اس قبیلے کی ٹکڑیاں موجود ہیں۔

بلیدی

(بلیدہ سے بلیدی) یہ ایک قدیم قبیلہ ہے جو رند و لاشار سے بھی قبل مکران کے بلیدہ میں آباد تھا۔ اس کے علاقے مغربی (ایرانی) بلوچستان میں رسک، قصر قند اور فانوج ہیں۔ بلیدی مکران میں بہت عرصہ حکمران رہے۔ اس قبیلے کا تعلق دراصل بلیدہ سے ہے جو کہ مکران میں واقع ہے۔ انہوں نے گچکیوں کو شکست دی تھی اور مکران پر قابض ہو گئے تھے۔

رکھتا ہے۔ یہ بلوچستان کے نوشکی کے علاقے میں آباد ہے۔ اس کے علاوہ سندھ اور پنجاب (مظفر گڑھ اور علی پور) میں بھی بادیہی موجود ہیں۔ بلوچستان میں تو بادیہی اور مری قبیلے کی بڈانی شاخ الگ الگ موجود ہیں مگر پنجاب میں اس فرق میں اچھا خاصا ابہام پایا جاتا ہے۔

بادینی کے ذیلی قبائل میں حیدر زئی (سردار خیل طائفہ)، انگوزئی، عزت زئی، مصری زئی، جگے زئی، قمر زئی، ہالوزئی، گورگیو، فقیر زئی، مکاکی، کمال زئی، دشتکائیں، بنگلائیں، مندوزئی، دائر زئی اور بلوزئی شامل ہیں (ذرا ملاحظہ کریں کہ بادیہی کی ان شاخوں کے نام سے دوسرے بلوچ قبائل میں بھی گروہ شامل ہیں۔ اور کہیں کہیں تو الگ قبائل اس نام سے موجود ہیں)۔

باران زئی یا بارکزئی

بمپور کے بلوچوں کا یہ طاقتور قبیلہ 1928ء تک بلوچستان پر حکمرانی کرتا رہا۔ مغربی بلوچستان کا آخری بلوچ حکمران میر دوست محمد، باران زئی تھا۔ اسے شاہ ایران رضا شاہ اول نے قتل کر دیا۔ باران زئی جالک، دیزک اور ارغشاں میں بھی آباد ہیں۔ اس کے چھوٹے اور الگ الگ فرقے کراچی، اندرون سندھ اور وسطی بلوچستان میں بکھرے انداز میں آباد ہیں۔

برہمانڈی

یہ قبیلہ ڈیرہ غازی خان، راجن پور، جام پور اور مظفر گڑھ میں آباد ہے۔ اس کا کچھ حصہ لیغاری میں ضم ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک بڑا حصہ ڈومکی قبیلے کو تشکیل دیتا ہے۔ اس کے علاوہ برہمانڈی لاکھ، ہالہ، حیدرآباد، کیرتھر پہاڑ اور سمندری ساحل پہ آباد ہے۔ سرانیکی اکثریتی زبان ہے۔ کچھ لوگ سندھی کو مادری زبان کے بطور اپنائے ہوئے ہیں۔ بلوچی سیکھنے کی حسرت عالمگیر ہے۔

بزدار

قبیلہ بلوچوں کا ایک اور بڑا قبیلہ ہے جس کے لغوی مطلب ہیں ”بکریاں پالنے والا“۔ مگر جس طرح ہاتھی کے دکھانے کے دانت اور ہوتے ہیں اور کھانے کے اور۔ اسی طرح بزدار اپنے نام کے برعکس بکریاں نہیں بلکہ بھیڑیں پالنے والا قبیلہ ہے۔

بیزن جو

میر غوث بخش بزنجو کا یہ قبیلہ ایک وسیع علاقے میں آباد ہے۔ نال تو بابا غوث بخش بزنجو کا گھر ہے، مگر خضدار، آواران، کولواہ، جھاؤ اور بیلہ میں بھی بزنجو آباد ہیں۔ ایرانی بلوچستان میں بھی بزنجو دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ لوگ بلوچی بھی بولتے ہیں براہوئی بھی۔ پہاڑ میں بھی رہتے ہیں اور میدان میں بھی۔

میر بیزن نام نہیں ہے بلکہ امتیازی خطاب ہے جس کا اطلاق بعد میں سارے قبیلے پر بزنجو یعنی بیزن کی اولاد کی صورت میں ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب احمد شاہ ابدالی افغانستان کا بادشاہ بنا اور اس کے فوراً بعد اس نے افغان سرداروں کو جو خطاب دیے ان میں سردار میر جہاں خاں پوپلزئی بھی تھے جس کو احمد شاہ نے میر بیزن اور خان خانان کا خطاب دے کر اپنی فوج کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ حملہ انہیں سردار خیل طاہفہ ہے۔ اس کے علاوہ بزنجو کی ذیلی شاخیں یہ ہیں: تمرانہ، ہومراٹریں اور سیاہ پاؤ۔

پرکانڑیں

چھوٹا مگر قدیم قبیلہ ہے۔ خانہ بدوشی اور مویشی بانی کرتا ہے۔ کوسٹ کے آس پاس اور افغان سرحد پر خانہ بدوشیاں کرتا رہتا ہے۔ بھیڑ پالی روٹی روزگار کی مطابقت میں ہمہ وقت چوکنا رہنا اس قبیلے کی اجتماعی نفسیات ہے۔ پرکانڑیں تقریباً سارے کے سارے براہوئی بولتے ہیں۔

پیتافی

بلوچی زبان میں دو خوبصورت باہم متضاد الفاظ ہیں؛ پیتاف اور سائبند۔ سائبند وہ علاقہ ہوتا ہے جہاں اکثر سایہ رہتا ہو۔ جبکہ پیتافی دھوپ والے علاقے کو کہتے ہیں۔ یہ کسی بڑے کوہستانی سلسلے کے دامن میں آباد علاقوں کے اوصاف ہوتے ہیں۔ اس قبیلے کے لوگ ڈیرہ جات (غازی خان اور اسماعیل خان) میں آباد ہیں۔ کچھ لوگ مظفر گڑھ میں بھی سکونت رکھتے ہیں۔ اسی طرح، منتشر انداز میں سندھ میں بھی اس قبیلے کی چھوٹی

یہ قبیلہ مری بگٹی علاقے میں آباد تھا۔ بالاچ گورگیو کی ساری دشمنی اسی قبیلے کے ساتھ تھی۔ اور یہ ساری جنگ مری بگٹی علاقے میں لڑی گئی تھی۔

بلیدی سبی، گندواہ، پٹ فیڈر، جبیک آباد، تنگوانی، کندھ کوٹ اور کشمور اور پنجاب میں آباد ہیں۔ گولہ، جوفوزئی، کھرکانڑی، بجارانڑی، سندرانڑی، پیتانی، سوہریانڑی، تیغانڑی، ہانچہ، لولائی، پیتانی اور رعیتی اس کی ذیلی شاخیں ہیں۔ انہیں بردی بھی کہا جاتا ہے بالخصوص اس گروہ کو جو سندھ میں آباد ہے۔

بقال

ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والا دکاندار طبقہ ہے۔ کہیں بلوچی بولتا ہے تو کہیں براہوئی، کہیں سندھی تو کہیں سرائیکی میں بات کرتا ہے۔ سکھ دھرم کی معمولی اقلیت نے بھی خود کو اسی بڑے نام میں شامل کر رکھا ہے۔ بلوچستان میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں کہ ہر جگہ کے لوگوں کو اشیائے صرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اشیائے صرف کی ضرورت ایک بنیادی انسانی خاصیت ہے۔ بلوچ معاشرے میں یہ اشیائے تصرف بقال سپلائی کرتے ہیں۔ اپنی مذہبی رسومات میں مکمل آزادی رکھتے ہوئے، سردار کو معمولی ٹیکس نماتھے تحائف کے عوض تجارت میں مکمل آزادی رکھتا ہے۔

بنگلزئی

یہ ایک بڑا قبیلہ ہے۔ بلوچستان کے کئی علاقوں میں آباد ہیں۔ بنیادی طور پر رند بلوچ ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔ یہ قبیلہ خان قلات کے ساراوان قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ مکران کے کچھ طاہفے براہوئی اور سندھی بھی بولتے ہیں۔ سندھ میں بکھرے ہونے کے علاوہ اصل قبیلہ اپنے علاقے ترکم و جوبان میں رہتا ہے۔ ان کی سرداری پہلے گوہرام زئی کے پاس تھی جو بعد میں سید زئی کے پاس آ گئی۔ اُن کا فیوڈل ہیڈ کوارٹر اسلچئی ہے۔ اس کے ذیلی طاہفے یوں ہیں؛ گوہرام زئی، دینار زئی، گرانڑی، شوران زئی، بدوزئی، بجار زئی، شاہوزئی، مندوانڑی، پُٹ، پھگ۔ ملا مزار بنگل زئی زبردست سامراج دشمن شاعر تھے۔

چھوٹی کڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔

جتک

ایک آدھ بکھری اکھڑی شاخیں سندھ اور ڈیرہ جات میں رہتی ہوں گی۔ مگر اس قبیلے کا بڑا اور مرکزی حصہ بلوچستان میں رہتا ہے۔ نسبتاً چھوٹا قبیلہ ہے اور دیگر بلوچوں کی طرح مولیٰ بانی کرتا ہے۔ کچھ لوگ کوئٹہ کے گرد و نواح میں گاؤں آباد کیے ہوئے ہیں جہاں وہ چھوٹا کاروبار، سرکاری ملازمت اور دیگر شہری روزگار کرتے ہیں۔

جتوئی

جتوئی ہزاروں کی تعداد میں سندھ میں رہتے ہیں۔ پنجاب بھر میں موجود ہیں۔ بالخصوص مظفر گڑھ، ساہیوال، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، جھنگ، شاہ پور اور لاہور میں۔ اس بلوچ قبیلے کی بہت کم تعداد بلوچستان میں رہتی ہے۔ ہمارا بزرگ جناب حیدر بخش جتوئی انقلابی کے بطور شہرت کے آسمانوں کو چھو گیا تھا۔ بہت ہی خوبصورت سیاست کی اور شاعری کی۔ اس رند قبیلے کی ذیلی شاخیں ہیں؛ مظفرانی، فتح ہائیں، شاذیں زئی، خلورائیں۔

جسکا نڈیں

یہ بلوچ قبیلہ بلوچستان میں کم، اور سندھ و پنجاب میں زیادہ تعداد میں آباد ہے۔ بالخصوص ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں۔ کیا یہ لوگ بلوچی لفظ ”جسک“ (Jusk) سے منسوب ہیں جس کے مطلب ہیں؛ ”جھنجھوڑنا“؟۔

جکھڑانڈیں

کچھ اور شمالی سندھ کا بڑا قبیلہ ہے۔ رند کی شاعر میں موجود نہیں۔ یعنی یہ بعد میں تشکیل پانے والا قبیلہ ہے۔ ان میں سیاہ پاؤں نامی قبیلہ موجود ہے۔ جس کا بڑا حصہ خاران میں آباد ہے۔

جمالی

بلوچستان میں جعفر آباد، روجھان، اور نصیر آباد میں رہتے ہیں۔ سندھ (مورو، دادو، نواب شاہ، حیدر آباد اور ٹیاری) کے علاوہ پنجاب میں بھی جمالی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ قبیلے کی

جام

جام یا جاموٹ ایک خلط ملط بلوچ قبیلہ ہے۔ لسبیلہ اور پٹ فیڈر میں رہنے والے یہ لوگ زیادہ تر بلوچوں میں کسان طبقہ تشکیل دیتے ہیں اور کسانوں کی جاگیر دار دشمن جدوجہد دراصل اسی مخلوط قبائلی اتحادیہ کی جدوجہد ہے۔ جام، لسبیلہ کے حاکم بھی ہیں۔ جام کا لفظ بلوچ شاعری میں بہت استعمال ہوا۔ جس کے مطلب ہیں خوبصورت، گہرا دوست، قوی، طاقتور، معتبر..... الغرض یہ لفظ پیار کے بہت سے معنی دیتا ہے۔

جاموٹ

بلوچستان کے پٹ فیڈر کے زرعی علاقے میں کسان اپنے طبقاتی حریفوں کی طرف سے، اور خود اپنی طرف سے اس مجموعی نام کو خود پہ مسلط کر چکے ہیں۔ اور اگلا ظلم یہ کہ وہ پہلے تو بلوچ کی صفت سے نکالے گئے تھے، اب وہ آہستہ آہستہ برابر درجے کے شہری ہونے سے بھی کیے جارہے ہیں۔ طبقاتی نظام اپنے ساتھ بدترین چھوت چھات لاتا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ سیاسی تحریک اس ساری جاگیر دار ساختہ باتوں روایتوں کو برباد کر دے گی۔

جت

جت ایک مخلوط النسل گروہ ہے۔ زیادہ تر شتر بانی کرتے ہیں۔ بلوچ قوم ابھی بلوغت کی اس سطح تک نہیں پہنچی جہاں اپنے سارے ممبروں کو برابری کا درجہ دے سکے۔ جت کی اکثریت بلوچستان کے شمال مشرقی حصے میں رہتی ہے۔ اس کے فرقے ہیں؛ میر جت، لاشاری، براہانی (باہرائی)، مجیدانی، جھنڈا، لچوانی، ببر، وسوانی اور بلادی (3)۔ اسی طرح کندکانی، جبانو، دائی دانو بھی جت ہیں۔

شتر بانی کرنے والے بلوچ ہیں۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں سرانیکی بولتے ہیں۔ مگر قبائل میں بکھرے ہوئے جت بلوچی بولتے ہیں۔ سرانیکی بولنے والے باہم نسبتاً زیادہ قریب ہیں، اس لیے ان کی قبائلی حیثیت ان جتوں سے بہت بہتر ہے جو قبیلوں میں اکاؤڈ کا بکھرے ہوئے ہیں۔

تشکیل پایا۔ یہ قبیلہ دو بڑی ٹکڑیوں کی صورت بلوچستان میں آباد ہے۔ ایک تورکھی، رڑکھن کے وسیع علاقے میں، ایک دوسری ٹکڑی سبی کے نواح میں آباد ہے۔ دونوں حسنی زراعت سے وابستہ ہیں۔ اس قبیلے کی ذیلی شاخیں اس قدر بڑی ہیں، یا، دور بکھری ہیں کہ وہ الگ قبیلے بن چکے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر حسنی کی شاخیں یہ ہیں؛ بوبخیاٹریں، تھویاٹریں، رئیسناٹریں، شاہانٹریں، مُمیاٹریں، مندوانٹریں، شیلچی، نوذہانٹریں، جہلوٹریں، سوہیاٹریں۔

خشک

یہ بلوچ قبیلہ گھوٹکی، ٹھٹھہ، دادو، کندیارو، شکارپور، ٹیاری اور حیدر آباد میں بکھرے انداز میں آباد ہے۔ بلوچستان میں سبی، اوسٹہ محمد، تربت، نصیر آباد، جھل مگسی وغیرہ میں ان کی ٹکڑیاں آباد ہیں۔ ڈیرہ غازی خان، رحیم یار خان، مظفر گڑھ اور خان پور میں بھی خشک رہتے ہیں۔

خوجہ

قدیم وقتوں سے ساحلی علاقوں کے بلوچ ہیں۔ ہمیشہ سے تجارت سے وابستہ رہے ہیں۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس ہر ملک کا سکھ ہوتا تھا۔ بیورغ رند نے اپنی شاعری میں سبی کے علاقے میں ان کی موجودگی بتائی ہے۔

دامانی

یہ قبیلہ ایران، چاغی اور کوہ سلیمان میں آباد ہے۔ اس کی ذیلی (بہت بڑی) شاخیں ہیں؛ یار احمد زئی، اسماعیل زئی اور گمشاد زئی۔ اب تو یہ خود الگ اور آزاد قبیلوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

درزادغ، نقیب

ان ناموں سے بلوچوں کے گروہ مکران، لسبیلہ اور اندرون سندھ میں آباد ہیں۔ یہ کام کرنے والے محنت کش ہیں اور زراعت اور قبل از زراعت پیشوں سے وابستہ ہیں۔ یہ جھاکش لوگ مختلف قسم کی دستکاریوں کے ماہر ہیں۔ ثقافتی سرگرمیاں بھی انہی کی توجہ کا محور ہیں۔ خدا ہماری قوم کو اس قابل بنادے کہ ہم اپنے محنت کش، اور فنکارانوں اور گروہوں کی توقیر کریں۔ ان لوگوں نے

اہم شاخیں یہ ہیں؛ تھارانی، شاہلیانی، شاہل زئی، مندرانی، ساہریانی (دراصل کھوسہ ہیں)، وسوانی، بھندانی، بابر، ٹینگلیانی، مانجھی، پہنور اور ریحان والس۔ (4)

نہری پانی ملنے کے بعد سے یہ قبیلہ بلوچستان کا فیوڈل طبقہ تشکیل کرتا ہے۔ اس علاقے میں کسان تحریک کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ سراٹھاتی رہتی ہے۔ اس تحریک کو دبائے رکھنے کی خاطر جمالی فیوڈل مرکزی سرکار کی حمایت پر مجبور رہتے ہیں۔

چاندیہ

سبی، لاڑکانہ، اور ڈیرہ غازی خان میں بودوباش رکھتے ہیں۔ چاندکا کے نام سے تو لاڑکانہ میں اُن کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔ اس بہت بڑے مگر بہت کھڑے قبیلے کی شاخیں یہ ہیں؛ گرمانٹریں، حسانی، آجیاٹریں، سناٹریں، کمرانی، غیاٹریں، مارفانٹریں، چولیانٹریں، بنگلانٹریں، مصرانی، الہیار زئی، میروانٹریں، بھندانٹریں، مرزانٹریں، حیدرانٹریں، لہوانٹریں، نوٹانٹریں..... ایک ویب سائٹ (5) میں ذکر ہوا کہ یہ قبیلہ رند و لاشار کی جنگ کے زمانے میں ہربوئی اور ڈھاڈر سے نکل کر ڈیرہ غازی خان کے علاقے آیا۔ اُن کے اس زمانے کے سردار ہیرین خان کی قبر حضرت سخی سرور کے احاطے میں ہے۔ یہاں سے یہ قبیلہ لاڑکانہ مائیگریٹ کر گیا۔ جنگیں، قحط سالیاں، ناراضگیاں اور چرگا گاہیں ہماری مہاجرتوں کا سبب رہی ہیں۔

چاندیو کے نام کے مترادفات بے شمار ہیں۔ ذرا سے بچے بدل دیں تو آپ کو یہ قبیلہ بلوچستان میں سبی، جعفر آباد، اوسٹہ محمد، بولان، خضدار، کرخ، بارکھان، ماندو اور گوادریں ملے گا۔ سندھ اور پنجاب تو خصوصی طور پر گنجان انداز میں چاندیہ کے رہائشی مراکز ہیں۔ ضلع لاڑکانہ، ضلع کبیر، ضلع دادو، ضلع نواب شاہ، میرپور خاص، بدین، کراچی، شکارپور، سکھر، خیرپور..... سب چاندیو ہی چاندیو۔ ادھر آپ ملتان جائیے، مظفر گڑھ جائیے، لیہ اور بکھر اور دریا خان جائیے چاندیو آپ کو وہاں کے مستقل باشندوں کے بطور ملیں گے۔

حسنى

چاکرو گوٹہرام کے معلوم دور تک اس قبیلے کا کوئی نام موجود نہیں ہے۔ یہ بہت بعد میں

قلاں اور مستنگ شہر شاہی دارالحکومت ہونے کی بنا پر بلوچ سامراج دشمن قومی سیاست میں اہم ترین کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ بلوچ سیاست (بالخصوص میسویں صدی میں) پوری کی پوری انہی کے گرد گھومتی رہی ہے۔

1920 میں ”انجمن اتحاد بلوچان“ نے بلوچ سیاست میں پہلی بار فیوڈل اور ماقبل فیوڈل صورت بدل ڈالی۔ اس تحریک نے شہری بورژوازی، تعلیم یافتہ نوجوان اور مذہبی و قبائلی اشرافیہ سے قوم پرست ذہنوں کو اپنی طرف کھینچا۔

اس سب سے زیادہ مخلوط قبائلی اتحاد یہ میں مندرجہ ذیل طائفے شامل ہیں؛
خواجہ خیل، تیرپچی، شیخ، سارنگ زئی، زرخیل، آبی زئی، ہیبت زئی، یوسف زئی، محمود زئی، توران زئی، بڈھا زئی، سخر زئی، مندو زئی، ہوتی زئی، دادی زئی، قاضی، تاجک، ڈھاڈری زئی، رند، ملا زئی۔

ڈومبکی

یہ قبیلہ بنیادی طور پر ایرانی بلوچستان کے ڈومبک دریا کے علاقے سے متعلق ہے۔ مری قبیلہ میں بہت ہی شیریں پانی کا ایک چشمہ ہے۔ اسے ”ڈومبک آف“ کہتے ہیں۔ مگر ہماری احساس کمتری کو کیا کہیے کہ ڈومبک دریا اور ڈومب (میراثی) کے تلفظ کی یکسانیت کی وجہ سے آج ڈومبکی کے پڑھے لکھے لوگ اپنے خوبصورت نام سے ”ب“ کو چوری چھپے ہٹا دیتے ہیں۔

یہ لوگ ایران کے علاوہ سندھ میں جبکہ آباد، کشمور اور بخشاپور میں بھی رہتے ہیں۔ مگر ان کا اصل علاقہ لہڑی ہے۔ یہ رند قبیلہ مشرقی سلیمانی بلوچی بولتا ہے۔ دیر خانی، گبول، دیناری، میرو زئی، بھرمانڑی، بغداد، بھنڈ، غازیانڑی، براہمانڑی، شاہ بی، گشکوری، کھوسہ، لاشاری، محمدانڑی، شف کور، سنگیانڑی، سہریانڑی، تالانی، گورگیو، ہاڑا، جمبانڑی اور وزیرانی اس کے مشہور ذیلی فرقے ہیں۔

بلوچوں اور ان کے قبائل کے بارے میں تاریخی معلومات رکھنا اس قبیلے کی موروثی ذمہ داری رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس ”دفتر علم الانساب“ موجود ہے جو 1840 میں جنرل

بلوچ قوم کو کچھ بہترین فرزند عطا کیے ہیں۔ جنہوں نے سیاست، جمہوری جدوجہد، اور موسیقی میں بلوچ کا نام روشن کیا۔

دریشک

رند شاخ کا یہ قبیلہ، دریشک کوہ سلیمان کے قبیلوں میں سب سے بکھرا ہوا قبیلہ ہے جس کے گاؤں زیادہ تر دریائے سندھ کے کناروں پر واقع ہیں۔ پہاڑ میں ان کا کوئی قابل ذکر ٹھکانہ نہیں ہے۔ یہ قبیلہ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے تک محدود ہے۔ اکا دکا گھرانے سندھ میں ہوں گے۔

یہ وہ رند ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ جلال خان کے بیٹے ہوت کی اولاد ہیں۔ اس کی قابل ذکر شاخوں میں کرمانڑی، منگوانڑی، گولپاڈ، سرگانڑی، اریانڑی، اور جیکانڑی شامل ہیں۔ دریشک کے لفظی معنی ”مضبوط“ کے ہیں۔ (6) ان کا صدر مقام راجن پور کے قریب اسی ہے۔

دشتی

(دشت سے دشتی) سرحد کے پاکستانی اور ایرانی دونوں اطراف یہ لوگ موجود ہیں۔ مری قبیلہ میں ایک ذیلی فرقہ بھی اسی نام سے موجود ہے۔ اس کے علاوہ مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، اور شاہ صدر دین میں شین کے تینوں نکتے حذف ہو کر ایک بڑا قبیلہ ”دشتی“ کا موجود ہے۔

دیہوار

زراعت پیشہ یہ لوگ ریاست قلات کو زرعی آمدن عطا کرنے والے رہے ہیں۔ مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ فارسی اور بلوچی سے مخلوط ایک زبان بولتے ہیں۔ خانہ بدوش نہ ہونے اور ایک جگہ پر آباد ہو کر کاشتکاری کرنے کی وجہ سے ان میں تعلیم، پیشہ ورانہ ہنرمندی حاصل کرنے کے مواقع زیادہ ملے۔ اس طرح دفتری تعلیمی ثقافتی، صحافتی اور سیاسی میدان میں انہیں صحافتی بہت آسانیاں رہیں۔ خان قلات کے درباری امور صدیوں تک دیہوار دربار کے لیے سنبھالتے رہے۔ دربار کے لیے ریونیو، ٹیکس جمع کرنا، رسائل و رسائل، ریکارڈ رکھنا اور دربار کا عمومی نظم و نسق یہی لوگ چلاتے رہے۔ اس کے علاوہ خان کے دستہ خاص میں بھی دیہوار لوگ موجود رہے۔

جکھرائی، قیصرانی، مزاری، مستوئی، نوشیروانی، رخسانی وغیرہ۔ اسی طرح مری، بگٹی، چانڈیا، کھیری، ہوت، بھالی، بلیدی، ڈومبکی، لُنڈ، لیغاری اور کھوسہ۔

ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، مظفر گڑھ، ملتان، جھنگ، شاہ پور اور سیالکوٹ میں جو رہتے ہیں اُن کی مرکزیت اب ختم ہو چکی ہے۔ چند ہار کے یوٹے دانے شانِ ماضی کی ہی مشترک میراث رکھتے ہیں۔ سب کے غلام بولکوں کا بھی یہی حال ہے۔

میر چاکر خان اور اس کا پورا عہد رندی عہد کہلاتا ہے۔ تاریخ بلوچستان کا ایک پورا باب اس عہد سے وابستہ ہے۔ رند نے بے شمار بلوچ قبائل کو جنم دے کر بھی اپنا اصل نام آج تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ اور سب و شوران میں آج بھی رند کے نام سے ایک قبیلہ موجود ہے۔ جس کی ذیلی شاخیں یوں ہیں: چاکرائی، چانڈیہ، چگلری، چولائری، ازدی، بادی، بھارزئی، بزدار، دنیاری، فیروزئی، گبول، گدائی، گداری، غلام بولک، ہڈدار، ہوتانزئی۔

دہلی کے آس پاس رندلیس گے، ایرانی بلوچستان، پنجاب، اور سندھ میں یہ قبیلہ اپنے نام سے وجود رکھتا ہے۔

مگر یہ بلوچ قوم کی ابتدا ہرگز نہیں ہیں۔ بلوچ ان سے بہت بہت قدیم قوم ہے۔

رودینی

اس قبیلے کا صدر مقام تو سوراب میں ہے مگر یہ کردگاپ میں بھی رہتے ہیں۔ چھوٹا قبیلہ ہے لہذا اثر و اختیار کے لحاظ سے بہت کم حیثیت رکھتا ہے۔ عمومی طور پر براہوی بولتے ہیں۔ مگر شہروں کے قریب ہونے کی وجہ سے باہمی میل ملاپ کے سبب بہت سے لوگ بلوچی بھی بولتے ہیں۔

رئیس

کچ، چنگور، اور باہو میں آباد زراعت سے وابستہ قبیلہ ہے۔ اور حاکم گروہوں میں شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔

رئیسانڈیں

بلوچوں کا تعداد کے لحاظ سے چھوٹا مگر رہنے کے لحاظ سے بڑا قبیلہ ہے جس کا اصل پیشہ

ایشیا تک سوسائٹی بنگال میں شائع ہوا تھا۔ (7) جکھرائی کی ایک شاخ ہے جو اب خود ایک بڑا قبیلہ بن چکا ہے۔ سندھ اور پٹ فیڈران کا علاقہ ہے۔

ڈومبکی قبیلہ بہت قدیم قبیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا ذکر قدیم بلوچی شاعری میں موجود ہے۔

رخسانڈیں

دریائے رخشان سے منسوب ہیں۔ رخسانی دراصل اپنی قبائلی بنیادیں ختم کر چکا ہے اور اپنے ذیلی فرقوں میں اس طرح بٹ گیا ہے کہ ہر فرقہ خود ایک بڑا، مکمل اور الگ قبیلہ بن چکا ہے۔ خاران، راس کوہ، نوکنڈی، والہندین، نوشکی، مکران، افغانستان (گرم سیل اور گریش)، ایران یعنی سیدتان، خراسان، اور ترکمانستان ان قبائل کے وطن ہیں۔ اس اتحادیے میں سیاہ پاد، بادینی، جمالینی، ریکی، نوشیروانی، ماندائی، اور نوقی زئی شامل ہیں۔ یہ بہت بڑا قبائلی اتحاد یہ ہے۔ یہ بلوچی کے خوبصورت لہجے ”رخسانی“ میں بولتے ہیں۔ یہ شتر پال بھی ہیں اور کاشتکاری بھی کرتے ہیں۔ بلوچستان میں سیاست اور ادب و صحافت کے میدان میں بادینی اور جمالینی کا اہم مقام ہے۔ نوشکی کے ان دو قبائل نے پورے ضلع، لہذا پوری بلوچ قوم کو متاثر کر دیا۔

رخسانڈیں کا ذیلی شاخ ریکی زاہدان کے جنوب مغرب میں آباد ہے اور ان کا آباد علاقہ تفتان کے پہاڑوں کے شمالی دامنوں تک پھیلا ہوا ہے۔ لادیز اس قبیلے کا مرکز ہے جہاں ریکیوں کا موروثی سربراہ رہتا ہے۔ ان کی اکثریت مولیشی بانی، شتر بانی اور قالین بانی سے متعلق ہے۔ یہ لوگ جماز نامی اچھی نسل کے اونٹ پالتے ہیں۔ عورتیں عمدہ قالین بنتی ہیں۔ ان کا جو حصہ لادیز، گل خارا اور مہر آباد کے زرخیز میدانوں میں آباد ہے، وہ کاشت کاری کرتا ہے۔ یہ بتیں قبائلی گروپوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ان کے ذیلی طائفے ہیں: بالوزئی، ہاشم زئی، بردگوئی۔

رند

رند کو اکثر بلوچ قبیلوں کا سرچشمہ جانا جاتا ہے۔ بالخصوص مشرقی بلوچستان کے بڑے بڑے قبیلے رند کی مشترکہ جڑ کی شاخوں کی حیثیت سے خود کو پہچانتے ہیں۔ مثلاً بزدار، گشکوری، عمرانی

موندرا نڈریں (موندرا) وغیرہ وغیرہ۔ دیگر اہم قبیلوں میں نوثانی، مسوری، پھونگ، شمبانڈریں، سلماں زئی، سوبھانڈری، سندرائی، پاپی، نوہکانڈریں شامل ہیں۔

بگٹی ابتدائی دور میں ایک چھوٹا قبیلہ تھا۔ اس کے موجودہ علاقے میں بلیدی آباد تھے، جن کو انہوں نے نکال دیا۔ بگٹی کی تاریخ تقریباً مری اور دیگر سلیمانی قبائل کی تاریخ جیسی ہے۔

بگٹی قبیلہ عمدہ گھڑسوار اور لڑاکا رہا ہے۔ 1845 میں چارلس نیپئر نے اس قبیلہ پر حملہ کیا تھا مگر اسے کوئی کنٹرول نہیں کر سکا۔ بس سنڈیمین اپنی سنڈیمینی کی وجہ سے کچھ عرصہ تک اس قبیلہ کو چلاتا رہا۔

بیورغ کو حکمران گھرانے کا جدا مجد تصور کیا گیا ہے۔ (بگٹی کے بیورغ نامی تین سردار ہوئے)۔ سکھوں سے لڑ کر انہیں شکست دینے کے علاوہ اس قبیلے نے انگریزوں کے خلاف بھی زبردست جنگیں لڑیں۔ (واضح رہے کہ سکھوں نے مشرقی قبائل پہ زبردست حملے کیے۔ بگٹی نے انہیں شکست دے دی اور ان کے طبل جنگ (دھل) بھی قبضے میں لے لیا) (جواب سوہری کے دربار میں رکھا ہوا ہے)۔ بیورغ، سلام بان، غلام مرتضیٰ، گہنور خان، شہباز خان، محراب خان، اکبر خان اس قبیلے کے بالترتیب سردار ہوئے۔ جو آس سال، بگٹی کا بہت بڑا مفکر اور شاعر ہو گزرا ہے، جبکہ پیر سوہری روحانی پیشوا ہے۔

باپ کے خلاف ”محراب گردی“ نامی پمفلٹ لکھنے والا، اور نامی گرامی سامراج دشمن جمہوری راہنما میر عبدالرحمن بگٹی اسی مردم خیز خطے سے تھا۔ پاکستان کو بنیاد دولت بخشنے والی قدرتی گیس اسی قبیلے کی ملکیت ہے۔ بلوچستان کے علاوہ سندھ میں بھی بگٹیوں کے کئی گاؤں موجود ہیں۔ دیگر قبائل کی بہ نسبت، ہندو بڑی دیر تک اس قبیلے کے ساتھ رہے۔ مشرف حملے میں شہید ہونے والے بگٹیوں میں ہندو بگٹی بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔

ڈیرہ بگٹی (دراصل ڈیرہ بیورغ بگٹی) بگٹیوں کے سردار کی جائے رہائش ہے جہاں 1983 میں بجلی آئی۔ حال کی صدی میں بگٹی کا مشہور سردار، نواب اکبر خان رہا جو اپنی سن کالج سے جو نیر کیمبرج کرنے کے بعد 1950 کی دہائی میں سکندر مرزا کی حکومت میں وزیر بن

آباد کاشتکاری ہے۔ اگر رئیس اور رئیسانی ایک ہی قبیلہ ہے تو اس قبیلے کا اصلی اور بڑا حصہ (رئیس) مکران میں آباد ہے۔ یہ قبیلہ قلات کی خانی کے عہد میں سراوان کے پورے علاقے کا ایک لحاظ سے انچارج ہوا کرتا تھا۔ ”سرسرداران سراوان“ ایک بہت بڑا منصب ہوتا تھا جو ان کے سرداروں کو حاصل تھا۔ کانک، مستنگ، کچھی اور کوئٹہ ان کے علاقے ہیں۔ زیادہ تر زراعت سے وابستہ یہ قبیلہ بہت بکھرا ہوا ہے اور ہر ذیلی فرقہ بذات خود ایک الگ اور مکمل قبیلہ لگتا ہے۔ اس کے ذیلی طائفے ہیں؛ روشان زئی، جمال زئی، سیاہی زئی، راؤسین زئی، رستم زئی، سراج زئی۔ کانک صدر مقام ہے۔

زرکانڈریں یا بگٹی

ایران دریائے بگ کی وادی کے تعلق سے اس کا نام بگٹی پڑ گیا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر اس قبیلے کا ایک اور نام ”زرکانڈریں“ بھی ہے۔ یعنی؛ زر کی معدنی کان۔ یہ بات سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔ زراور بگٹی!!! ان کا تو آپس میں دور دور کا واسطہ نہ رہا۔

اُدھر مری قبیلے کا ایک اور پڑوسی قبیلہ ”زرکانڈ“ ہے۔ جو بلوچی جیسی پشتو بولتے ہیں صرف آخری حرف ”ی“ نے دو قبیلوں کی نسل، زبان اور ثقافت میں فرق کر ڈالا۔ کتنا دلچسپ ہے انسان اور کتنی دلچسپ ہیں اس کی حکایتیں۔ زرکانڈ موسیٰ خیل قبیلے کی ایک شاخ بتائے جاتے ہیں۔ بلوچی کلاسیکل شاعری میں اُن کا کوئی ذکر اذکار نہیں ہے۔ یہ ابھی ماضی قریب میں تشکیل پانے اور منظم قبیلے کی صورت اختیار کرنے والا مضبوط قبیلہ ہے۔ مشرقی بلوچستان میں گوکہ پڑندوں کی اکثریت مری کے علاقے کے پہاڑوں میں بس گئی اور بالآخر مری بن گئی۔ مگر میر چاکر کا چچا زاد جیاندار اپنے عزیزوں اور حامیوں کے ساتھ جنوبی گرم علاقے میں آ گیا جو بگٹی کا علاقہ بنا۔ اس قبیلے کی بڑی شاخ جیاندار کے بیٹے راہچہ کے نام سے منسوب ہے۔ مگر جناب عزیز بگٹی راہچہ کو بجار کا بیٹا اور میر عالی کا پوتا لکھتا ہے۔ اُس کے خیال میں بگٹی میر عالی کی آل اولاد ہیں۔ (8) جس کا ایک ذیلی فرقہ ”بیورغ زئی“ ہے جو کہ بگٹی کا حکمران گھرانہ ہے۔ بگٹی قبیلے کی شاخوں کے نام میر چاکر کے عزیزوں کے ناموں سے منسوب ہیں؛ پیر و زانڈریں (پیروز)، کلپر (کلپر)، راہچہ (راہچہ)،

گیا۔ اور نشیب و فراز بھری اپنی تنازعہ زندگی کے آخری حصے میں پاکستانی افواج سے لڑتے ہوئے شہید، اور سب کا محترم ہو گیا۔

زہری

یوم شہدائے بلوچستان اسی قبیلے کے بھاری اور عزت دار نام سے منسوب ہے جہاں نواب نور خان زرکزی نے اپنے خاندان کے ساتھ بلوچ قومی حقوق کے لیے ایسی قربانیاں دیں کہ اکثر نے سکھر جیل میں پھانسی پائی اور بلوچوں کے ہیڈ کوارٹر قلات کے شاہی قبرستان میں ان شہیدوں کا مزار بنا۔

خضدار ان کا مرکز ہے۔ مگر یہ بہت وسیع علاقوں میں پھیلا ہوا قبیلہ ہے۔ سندھ میں بھی زہری رہتے ہیں۔ قلات کی خانی کے زمانے میں جہلاوان کے سیاہ و سفید کا مالک قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ قلات ریاست میں سردار ان جہلاوان انہی کے سرداروں کا مقام و لقب تھا۔ سرداری اصل میں موسیانوں کے پاس تھی اور ہے، مگر شہرت و توقیر رفتہ رفتہ زرکزی کو منتقل ہوئی۔ اب زرکزی اس قبیلے کو سردار مہیا کرتا رہتا ہے۔

زہری کا نام اپنی جائے سکونت کی وجہ سے زہری پڑا۔ اسی طرح اس کے ذیلی فرقے نیچاری، پندرائی اور ساسولی بھی ان کی رہائش کے علاقوں کی وجہ سے ان ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ زہری کے ذیلی فرقے یوں ہیں؛ موسیانوں، نیچاری، زرکزی، پندرائی، جنگ، ڈایہ، رئیس، سیدزئی، ساسولی، خدرازی، باجوئی، محمودانوں، لوٹھانوں، تراہسانی، ستاڑی۔

ساتک زئی

بہت چھوٹا اور بہت بکھرا قبیلہ ہے۔ جو چھ میں آباد ہے۔ کوئلہ کی کان کنی تو بس نام کی ہوتی ہے، مویشی بانی ہی اصل پیشہ ہے۔

ساجدی

یہ ایک بہت ہی قدیم قبیلہ ہے۔ مرکزی طور پر گریٹہ میں آباد ہیں۔ مگر وسطی بلوچستان کی

اور جگہوں پر بھی موجود ہیں۔ یہ ایک کوہستانی قبیلہ ہے، مویشی بانی میں مصروف ہے، سچے سچے لوگ۔

سرپرہ

یہ قدیم بلوچ قبیلہ پڑکانوں کے ساتھ پرانی تاریخوں میں مذکور ہے۔ کردگاپ ہیڈ کوارٹر ہے۔ مگر باجرہ کے بیج کی طرح بہت جگہوں میں بکھرا قبیلہ ہے۔ لہذا کوئی اجتماعی اثر و نفوذ بلوچستان میں نہیں رکھتا۔ خشک آبے کی زراعت اور مویشی بانی سے وابستہ رہے ہیں۔

سمالانڈیں

تعداد میں نسبتاً چھوٹا قبیلہ ہے۔ وہی عام بلوچوں کی طرح مویشی بانی کرتے ہیں۔ کوئلہ مانگ یا کھیتی باڑی بہت معمولی ہے۔ کوئلہ اور بیج کے بیج کے پہاڑوں میں مہاجر تیں کرتے رہتے ہیں۔ جہاں بارش لے جائے، جہاں گھاس پھوس لے جائے، جہاں بھیڑ بکریاں لے جائیں۔

سنجرانڈیں

چاغی کے خانہ بدوش لوگ تھے جو اب آباد کاشتکاری بھی کرتے ہیں۔ ایرانی بلوچستان تک پھیلا ہوا یہ قبیلہ میٹھی رخشانی بلوچی بولتا ہے۔ کچھ لوگ ڈیرہ غازی خان اور جنوبی پنجاب میں اسی نام کے ساتھ شناخت رکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی طرح اس قبیلے کے لوگ ترکمانستان میں بھی آباد ہیں۔ میر گل خان نصیر کہیری کو سنجرانوں کی شاخ قرار دیتا ہے۔ شیبہ مرید کے علاوہ ابھی ماضی قریب کے شیبہ حسن (بلانوش) شیبہ حسین (نورانی) اور دیگر کئی اولیا اسی قبیلے سے ہوئے۔

سنگور

سبیلہ میں ایک قبیلہ ہے۔ نسبتاً چھوٹا قبیلہ ہے۔ مویشی بانی، اور کہیں کہیں خشکابہ کی زراعت کرتے ہیں۔

شاہوانڈیں

یہ رند بلوچ ہیں۔ بنیادی طور پر یہ سارواوان کا قبیلہ ہے۔ خانی قلات کا بیرک (پرچم) بردار ہے۔ سارواوان میں خان قلات کے دربار میں رئیسانوں کے بعد دوسرا بڑا

یہ لوگ چاہ بہار، دشت، جیوانی، باہو، گوادر، پسنی، حب، لیاری، ٹیاری، ٹنڈو آدم اور حیدر آباد میں آباد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ”چوکنڈی“ اور حب کے مشہور قبرستان اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی بلوچستان میں ماوند کے مقام ”باغارسر“ میں اُن کے کھنڈرات کی موجودگی اور کلاسیکل شاعری میں اس کی تصدیق کی گئی ہے۔ ڈیمز کلمتی اور مری کے مابین جنگ کا تذکرہ کرتا ہے۔ مگر ہماری روایتوں اور شاعری میں ایسی کسی جنگ کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ جبکہ ہماری شاعری اور روایتوں میں موجود مری علاقے میں کلمتی اور بلقی کی لڑائی موجود ہے جس کا کہ انگریز محققین نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ہوتماں کلمتی مشہور شاعر گزرا ہے جس نے بقول مولائی شیدائی، حمل کلمتی اور پرتگیزیوں کے بچ مشہور جنگ کو بیان کیا ہے۔

کلوثی

ادھر ادھر بکھرا بہت چھوٹا قبیلہ ہے۔ اس کے لیے اپنی قبائلی الگ شناخت رکھنا محال ہوتا جا رہا ہے۔

کمبرانڈیں

یہ قبیلہ بلوچستان کے خواتین قلات کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ بلوچستان بھر میں جا بجا بکھرا ہوا یہ قبیلہ بلوچی، براہوی، فارسی اور سندھی زبانیں مادری قومی زبانوں کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

کوسخ یا کھوسہ

شکار پور کے سندھ اور سکھر کے درمیان کے علاقے سے لے کر تھرپاکر اور روہان کے مشرقی علاقے تک آباد ہیں۔ کوہ سلیمان میں ڈی جی سینٹ فیکٹری سے لے کر مبارکی اور بغلچر تک کا علاقہ کھوسوں کا ہے۔ اس کے علاوہ کھوسہ سندھ میں بھی رہتے ہیں۔ یہ وسیع اراضی انہیں ہمایوں نے فوجی خدمات کے صلہ میں دی تھی۔ جبکہ آباد کے علاوہ بلوچستان کے پٹ فیڈر میں بہت بڑی نہری زمینوں کے مالک بھی کھوسہ فیوڈل ہیں۔ سبی میں بھی کھوسوں کے دو چار گاؤں ہیں۔ سندھ میں تھراور پارکر میں بھی رہتے ہیں۔ سندھ کی زمینیں انہیں ہمایوں نے عطا کی تھیں۔ یہ لوگ ایرانی بلوچستان اور مکران میں بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔

درجہ شاہوانزیں کا ہے۔ نصیر خان اول کے دور کا محمد خان شہوانزیں اُس سے ”یار وفادار“ کا لقب پا گیا تھا۔ مستنگ، قلات اور کوئٹہ انہی کی قدیم آبادیاں ہیں۔ جنگوں، قحط سالیوں اور نقل مکانیوں نے البتہ انہیں کہاں کہاں نہیں پہنچایا۔ مری میں ایک قبیلہ شہوانزیں موجود ہے۔ ہزار میں بھی شاہوانزیں ایک الگ طائفہ تشکیل کرتے ہیں۔ پنجاب میں بہت سے علاقوں میں شاہوانزیں آباد ہیں۔ اس کے ذیلی طائفے ہیں؛ حاجی زئی، راوت زئی، شاذیہاں زئی، چناروزئی، میروزئی، شیرزئی، خواجوزئی، شاہوزئی، کلوزئی، حسنی، سوری زئی، ہومرائی۔

شیر خان زئی

انیسویں صدی کے شروع میں بمپور پہ قابض ہوئے مگر بعد میں انہیں ایرانیوں نے وہاں سے بھگادیا اور وہ گہیہ، فانوج اور بنٹ میں آباد ہوئے۔

عمرانڈیں

یہ سندھ و بلوچستان میں بکھرا ہوا قبیلہ ہے۔ سبی، قلات، پٹ فیڈر اور اس کے ملحقہ سندھ کے علاقوں میں رہنے والے اس قبیلے کے نام پہ مزاری، گورثانی، اور لیغاری میں ذیلی طائفے بھی موجود ہیں۔ یہ قبیلہ نہری زراعت میں بلوچ کا سب سے بڑا فیوڈل طبقہ تشکیل دیتا ہے۔

غلام بولک

سیوی اور اس کے ملحقہ علاقوں میں آباد ہیں۔ تعداد میں بہت چھوٹا قبیلہ ہے۔ رند عہد کے لوگ ہیں۔

کلاچی

(کلاچ سے کلاچی)۔ مکران میں کولانچ نامی علاقے سے انہوں نے یہ نام لیا ہے۔ یہ لوگ ڈیرہ اسماعیل خان میں رہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، گھوٹکی، لاڑکانہ اور کراچی میں بادلوں کی تنہا ٹکڑیوں کی صورت میں آباد ہیں۔ کراچی کا اپنا نام انہی سے منسوب ہے۔

کلمتی

بلوچوں کا ایک محسن اور سامراج دشمن راہنما سردار محمد امین کھوسہ، جناب یوسف عزیز بگسی سے لے کر میر غوث بخش بزنجو کے عہد تک بلوچ بہبود کے لیے سرگرم رہا۔

کوراکائی

ماضی کا یہ مشہور قبیلہ اب سلامت نہ رہا۔ اور اب یہ مرکز گم کردہ مظفر گڑھ، ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خان میں بکھرے ہوئے انداز میں ملتے ہیں۔

کورڈیاکیرد

بولان، مرو، گونڈیس دشت اور کوئٹہ کے علاوہ بہت سارے علاقوں میں آباد ہیں۔ بلوچستان کی سیاست میں پچھلی صدی کی تیس کی دہائی سے لے کر آج تک اس قبیلے کے سرکردہ لوگ شامل رہے ہیں۔ میر عبدالعزیز کرد کا نام لیے بغیر آپ کو جدید بلوچ سیاست بالکل ادھوری لگے گی۔ یہ بلوچی کے علاوہ بلوچوں کی دوسری اہم قومی زبان، براہوی بولتے ہیں۔ دشت گونڈین ان کا صدر مقام ہے۔ خانہ بدوش مویشی بانی کے علاوہ زراعت سے وابستہ ہیں۔ کچھ لوگ کوئلہ کی مائننگ بھی کرتے ہیں۔

کھیتراٹ

یہ قبیلہ ایک طرف تو لیغاریوں اور بزدار سے سرحد بناتا ہے، تو دوسری طرف مری اور گجٹی سے ملتا ہے۔ اُدھر کوہ سلیمان کے مشرقی دامن میں کھیتراٹ ڈھوا میں رہتے ہیں جہاں ان کی زمینداری ہے۔ اکبر بادشاہ نے ان کے بڑے حصے کو وہاں سے بے دخل کیا۔ تب انہوں نے لیغاری پہاڑوں کے علاقہ بارکھان میں پناہ لی۔

کھیتراٹ کھیتی باڑی اور مویشی بانی کرتے ہیں۔ ان کی اولین زبان کھیتراٹریں ہے۔ اور دوسری زبان بلوچی ہے۔ اصطلاحات، استعارات اور کلچر سب کچھ اپنے پڑوسی قبائل جیسا ہے۔ پڑوسی قبائل کے ساتھ تلخ و شیریں تعلقات بھی اس قبیلے کا خاصہ رہے ہیں۔

میر مصری خان کھیتراٹ انگریز کے خلاف بہت بے جگری سے مزاحمت دیتا رہا۔ وہ اپنے ترقی پسند نظریات کی وجہ سے بلوچ سامراج دشمن تحریک کے نمایاں راہنماؤں میں شامل تھا۔

کھوسہ دراصل کچ کے باسی رند قبیلے سے وابستہ لڑاکا قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کو اہل یونان، عرب اور چینیوں نے اپنے تذکروں میں یاد کیا ہے۔ بازنطینی انہیں ”کورز“ کہتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ان کا نام ان کی گرم اور لڑاکا طبیعت کی بدولت کھوسہ ہے۔ چونکہ یہ قبیلہ انگریز کے خلاف چھاپہ مار جنگوں میں مصروف رہا اس لیے انگریز کی تحریروں میں کھوسہ ہمیشہ چور اور ڈاکو رہا ہے۔ والکر کی سندھی ڈکشنری میں کھوسخ کا معنی رزن یا ڈاکو لکھا ہوا ہے۔ 1859 میں میجر پولاک نے لکھا: ”کوئی ایسا کھوسہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے جو مویشی چوری کے جرم میں جیل نہ کاٹ چکا ہو یا اس کا مستحق نہ ہو۔“ (9)۔ ایک اور بیان یہ ہے کہ کھوسخ: کوہِ سگ یعنی پہاڑ کا کتا (رکھوالا) ہے۔ ایک اور حکایت میں کھوسو کو لفظ کوہ سار سے بنایا گیا ہے۔ ایک آدھ جگہ تو کھوسو کا شغیر نامی شہر کے باشندے بتا کر کاشغر سے ہوتے ہوئے کھوسو بنا دیا گیا۔

مجھے ایک معقول بلوچ محقق، میر الفت نسیم کی تحقیق سچ کے بہت قریب نظر آئی۔ اس نے ایک خط میں مجھے لکھا:

”یہ قبیلہ موجودہ ایرانی بلوچستان سے کچج میں داخل ہوا تھا۔ ”کوسخ“ بلوچی میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کی داڑھی ابھی ابھی نکلی ہو، یا محض ٹھوڑی پر معمولی داڑھی ہو اور باقی چہرہ صاف ہو۔ کہتے ہیں کہ کھوسخ کے جد امجد کا نام ”دلیر“ (Daleer) ہوتا تھا۔ جس کے معنی ”عقل و فہم“ کے ہیں۔ اُس کا چہرہ کم داڑھی رکھتا تھا۔ اسی نسبت سے اس کا اور بعد میں اس کی آل اولاد اور قبیلے کا نام ”کوسخ پڑا“۔

انگریز کے خلاف جنگ آزادی میں کھوسہ کا تذکرہ نہ کرنا بہت بڑی کنجوسی ہوگی۔ جیکب آباد کا دلہراد خان کھوسہ، دریا خان جکھرا نی سے مل کر گوریلہ کاروائیاں کرتا رہا۔ دونوں نے جیکب آباد کی ایک کھلی کچہری میں جان جیکب کو مارنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جاسوسی ہوئی اور دونوں گرفتار ہوئے۔ دلہراد کو کالا پانی کی سزا ہوئی۔ اور اس جلاوطن کی لاش تک نہ ملی۔ کھوسہ کی ذیلی شاخوں میں جنکلیل، بلبل، چندانز، جروار، مہروانز، عمرانی، جملانی، بلانز، اور عیشانز شامل ہیں۔ بلوچوں میں موسیقی کا بہت بڑا استاد خان صاحب ارباب خان، کھوسو قبیلہ سے تھا۔

جنوب میں درگ نالہ کے ساتھ ساتھ لورالائی اور موسیٰ خیل تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کی سرحدوں کے آس پاس کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ اس طرح اس قبیلے کی سرحدیں بلوچستان، سرحد اور پنجاب کے تینوں صوبوں سے ملتی ہیں۔

یہ قبیلہ بھی پندرھویں سولہویں صدی تک وجود نہیں رکھتا تھا۔ بعد کے اس رند قبیلے کی سات شاخیں ہیں؛ لشکرانزیں، خوب دین، بودانی، وسوانزیں، لیغاری، جروار اور، رسما نزیں۔ 1853ء میں شیرانی مہمات سے فارغ ہو کر انگریز نے کیسرا نزیوں کا علاقہ تاراج کیا تھا۔ سردار کوڑا خان کیسرا نزیں انگیزوں کے لیے سرکار درہا۔

گبول

کہتے ہیں کہ یہ قبیلہ رند و لاشار جنگ (1456 تا 1486) میں چاکر کی طرف سے خوب لڑا۔ (وہ سب قبائل جو چاکر کی طرف سے لڑے، رند کہلاتے ہیں)۔ چاکر خان کے ساتھ بلوچستان چھوڑ کر پنجاب گیا تھا۔ گبول منگمری میں سکھوں کے ساتھ لڑائی کے نتیجے میں پنجاب بھر میں بکھر گئے۔ علاوہ ازیں یہ سندھ تک پھیل گئے اور کراچی تک آ گئے۔

بلوچستان، (جھٹ پٹ اور لہڑی) سندھ (بالخصوص کراچی کے لیاری) اور ڈیرہ غازی خان میں پایا جانے والا بہت چھوٹا قبیلہ ہے۔ مسٹر لچ نے 1835 سے 1837 کی اپنی رپورٹ میں بلوچستان اور سندھ کی سرحد پر واقع پہاڑوں میں رہائش پذیر بلوچوں کا ذکر کیا۔ اسی رپورٹ میں وہ گبول قبیلے کا ذکر یوں کرتا ہے؛ ”گبول اپنے رہائشی علاقوں کی نسبت سے سرائیکی، سندھی اور بلوچی (سلیمانی) بولتے ہیں۔ اسی پہاڑ میں گبولوں کا ایک سٹیشن ہے جس کا نام ”کچروخ“ ہے۔“

گچکی

یہ قبیلہ مکران کے علاقہ گچک سے منسوب ہے۔ عجیب و غریب تصورات جنم دینے والا یہ قبیلہ بلیدیوں سے حکمرانی پر لڑ لڑ کر طویل عرصے تک مکران کا حاکم بھی رہا۔ پنجگور میں واقع وادی گچک نے اس قبیلے کو اپنا نام عطا کر دیا۔ یہی کچھ اس قبیلے کے اصل بلوچ ہونے کے لیے کافی شافی ہے۔ گچکی قبیلے کے بڑوں نے جام لسیلہ، خان قلات اور مینگل سرداروں میں رشتے کیے۔ دینار زئی

کھیترا نزیں چھ ذیلی بڑے قبیلوں میں تقسیم ہوتا ہے؛ دھڑے وال، گرینی، ایسانزیں، لوہارانی، پھلیات اور سیلاچی۔ مزارا نزیں ان کے لیے سردار مہیا کرتے ہیں۔ یہ قبیلہ بہت ہی متفرق نسل کے طائفوں کے آن ملنے سے بنا۔ حسنی گوکہ ابھی تک خود کو کھیترا نزیوں سے الگ بتاتے ہیں مگر ان کے انضمام و ادغام کا پراسیس جاری ہے۔ حسنی دراصل 19 ویں صدی کے قریب سارے وسطی اور شمال مشرقی بلوچستان میں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں پھیل گئے۔ (10) آج یہ گروپ نہ آپس میں رابطے میں ہیں نہ ہی ان کے خاندانی یا تنظیمی تعلق رشتے ہیں۔ یہ ایک زمانے میں بڑا طاقتور قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ حسنیوں کو مری اور خان سے 1780 میں دھولاونگا کے مقام پر شکست ہوئی۔ (11) ان کا سردار صادق اور اس کا خاندان مارا گیا اور قبیلہ مکمل تاراج ہو گیا۔ اس کے چھوٹے ٹکڑے کچ، تل، چوٹیلی (پنی کوٹ)، سبی (گلوشہر) اور کھیترا نزیں قبیلے (حسنی کوٹ) میں بکھر گئے۔ (12)

کھیری

کھیر نامی درخت سے منسوب یہ اچھا خاصہ قدیم قبیلہ ہے۔ کچھ کچھ کرامتیں اس سے جوڑ دی جاتی ہیں۔ پٹ فیڈر اور سندھ میں کھیرا یہ قبیلہ اب بڑا قبیلہ تصور نہیں ہوتا۔ اس کی اہمیت بلوچی قدیم شاعری کی بدولت ہی ہے۔

کیا زئی

یہ کھیرا قبیلہ ایرانی اور پاکستانی بلوچستان میں واشنگ کے علاوہ سندھ میں بھی بکھرے انداز میں آباد ہے۔ کہیں الگ و آزاد انداز میں، اور کہیں ماما حسنی کی ذیلی شاخ کے بطور۔

کیسرا نزیں

یہ ”ق“ میں نے بلوچ دانشوروں کے ڈر سے استعمال کیا ہے۔ ورنہ نہ تو کبیرا نزیں ”قبر ا نزیں“ ہے اور نہ کیسرا نزیں ”قیصر ا نزیں“ ہے۔ بلوچی میں ”ق“ اور ”ص“ موجود ہی نہیں ہیں۔

کوہ سلیمان کا یہ قبیلہ شمال میں لردان گاؤں سے لے کر مشرق میں بروٹ مندوانی اور

اولاد ہے۔ اس قبیلے کی گیارہ ذیلی شاخیں ہیں، جن میں اہم یہ ہیں: درکانز، شہکانز، شاخلانز، ہوتوانز، قاسانز، جوگیانز، چانگ، درکانز، گبول، لاشاری، پیتانی، جسکانز اور سبزانز۔ مٹھوانی، میلوہڑ، صغوانی، زومیرانی بھی اس قبیلے کی شاخیں ہیں۔ تاریخ میں گورشانز اور سکھوں کی کبھی مفاہمت نہ ہو سکی۔ اس قبیلے کی ماردھاڑ کو روکنے کے لیے رنجیت سنگھ نے ہڑندکھنہ کے کھنڈرات سے اینٹیں نکلوا کر قلعہ تعمیر کروایا۔

گورشانز قبیلہ کے درمیان میں ایک چھوٹا قبیلہ لونڈ کے نام سے آباد ہے۔ لونڈ سندھ میں بھی آباد ہیں۔

یہ قبیلہ بہت بعد میں تشکیل پایا۔ ڈیرہ غازی خان میں ہڑند کے قریب لعل گڑھ ان کا دارالخلافہ ہے۔ ان میں موجود سیاہ پاؤں رہند ہیں۔ دوسرے طائفے بھی مختلف درختوں کی شاخیں ہیں جنہوں نے وہاں سے طلاق لی اور اس نئے اتحادیے میں شامل ہوئے۔

گورمانڈیں

ہم بلوچوں سے یہ نام کم ہو چکا ہے۔ مگر کوٹ ادو، ملتان اور لیہ کے یہ لوگ خود کو بلوچ کی وسیع تھالی میں شریک گردانتے ہیں۔ ان کے نام سے مظفر گڑھ کے قریب ایک ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ آج کل ان کے پڑھے لکھے لوگ خود کو گرمائی بولتے ہیں۔

گورگیٹ

یہ قبیلہ اصل میں زاهدان کے علاقے میں آباد ہے۔ ان کا سردار بھی وہیں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ قبیلہ چاغی، سبی، سندھ اور پنجاب میں بھی آباد ہے۔ اور مویشی بانی کے علاوہ زراعت سے وابستہ ہے۔ بلوچ تاریخ میں گورگیٹ قطعاً فراموش کرنے والے لوگ نہیں رہے۔ ایک زمانے میں یہ موجودہ مری بگٹی علاقے کا بہت زور آور قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ بالخصوص بالاچ کا نام بلوچ روایتوں، شاعری، ضرب الامثال اور روزمرہ کا حوالہ ہے۔ بالاچ کی قبر بگٹی علاقے کے مقام سنگسلا میں نمایاں طور پر موجود ہے۔

موجودہ مری بگٹی علاقے میں گورگیٹوں اور بلیڈیوں کے بیچ خونریز لڑائیاں ہوئیں۔

(مشہور ملک دینار گچکی کے نام سے منسوب) اور عیسیٰ زئی اس کے دو طائفے ہیں۔ عیسیٰ زئی پنجگور اور دینار زئی تربت میں رہتے ہیں۔ تیسرا حصہ قاسم زئی ہے۔ یہ قبیلہ اپنی بہادری میں اپنی مثال آپ رہا ہے۔ سرحدی علاقے کے حاکم کے بطور انہیں نادر شاہ سے لے کر انگریزوں تک لڑنا پڑا۔ قلم کی جنگ میں نعمت گچکی، اور امان گچکی اور منیر گچکی ہمارے دور کے سکالر ہیں۔

گشکوری

(گیش گور سے گشکوری)۔ مکران میں گیش کور (دریا) سے ان کا نام منسوب ہوا۔ یہ لوگ بیورغ رند کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔

یہ قبیلہ ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، کوٹ ادو، مظفر گڑھ کے علاوہ ملتان میں بھی بکھرا ہوا ہے۔ (13) سبی، اور مکران میں رہتا ہے۔ یہ لوگ بلوچی کا تقریباً ہر لہجہ بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ سندھی اور سرائیکی بھی ماردی زبانوں کے بطور بولتے ہیں۔

گمشاد زئی

گمشاد زئی کے قبائلی فرقے یہ ہیں: دود خود زئی، مزار زئی، محمد زئی، درگشت، کریم زئی، جہانگیر زئی، مراد زئی، گیدو زئی، خاکی زئی، تلخ کوہی۔ ان کی بڑی تعداد کاشت کاری کرتی ہے۔ یہ سارے ایرانی سرحدی علاقہ میں سکونت رکھتے ہیں۔

گوپانگ

مظفر گڑھ، ملتان، ڈیرہ غازی خان اور ٹھٹھہ میں پایا جانے والا یہ قبیلہ بہت بکھرا قبیلہ ہے۔ کچھ لوگ کچھی میں بھی آباد ہیں۔ اسی طرح سندھ میں گوپانگ آباد ہیں۔

گورشانز

گورشانز کوہ سلیمان کے ماڑی اور درگل نامی پہاڑوں کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ اور بلوچستان میں بکھرے بکھرے انداز میں اس قبیلے کی ٹکڑیاں آباد ہیں۔ ان کے بارے میں ایک روایت تو یہ ہے کہ گوریش حیدر آباد کے راجہ ھیم سین کا پوتا تھا جسے بلوچوں نے پالا تھا۔ دوسری، اور زیادہ مضبوط روایت یہ ہے کہ یہ قبیلہ میر دودا خان لاشار کے بیٹے گوریش خان کی

کے علاوہ گوگیرہ اور پاکپتن (منگمری) میں بیشتر بلوچ لاشاری ہیں۔ (15) سندھ بالخصوص حیدرآباد، بدین، ٹنڈوالہیار، ٹنڈو محمد خان، ٹیاری، نواب شاہ، دادو، کشمور، لاڑکانہ اور جیکب آباد میں بھی بے شمار لاشاری موجود ہیں۔ کچھ لاشاری پٹ فیڈر کے علاقے میں بھی آباد ہیں۔ گاجان ہیڈ کوارٹر ہے۔ بڑے قبیلوں میں سے مگسی، لاشاری ہے۔ اسی طرح جیکانڑیں بھی لاشاری ہیں۔ بھرگورشاڑیں قبیلے میں لاشاریوں کا ایک طاقتور ذیلی تہن ہے۔

لاسی

لس بیلہ میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ کاشتکاری اور مالداری کرتے ہیں۔ ساحلی پٹی میں ماہی گیری سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ جہاں اکٹھے رہتے ہیں مستحکم قبائلی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس کے وہ نسلی گروپ جو پہلے سے مشرقی بلوچستان میں آباد ہوئے، نسلی امتیاز کے اندھے پن کی بدولت اتنا بلند مقام نہیں رکھتے۔ بلوچی کی آمیزش سے بھری ہوئی سندھی بولتے ہیں۔

لانگو

یہ بہت قدیم قبیلہ ہے۔ چاکرو گوہرام کی آمد سے قبل یہ بلوچستان میں آباد تھا۔ آج کل یہ لوگ کوئٹہ، منگوچر، مستنگ، قلات، نوشکی اور خضدار میں آباد ہیں۔ ان کا شمار ساراوان کے قبائل میں ہوتا ہے۔ ساراوانی قبائل میں شاید سب سے کثیر تعداد والا قبیلہ ہے۔ ڈیرہ غازی خان میں یہ لوگ ایک اور نام، یعنی لنگاہ کے نام سے بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ جنہیں انگریز محقق مسٹر اوبرائن نے ”تجارتی مقاصد کے تحت سیوی اور ڈھاڈر سے یہاں آکر آباد ہونے والا“ قرار دیا۔ ان لوگوں نے ملتان کے علاقے پر تقریباً 80 برس حکومت کی جس کے دوران بلوچ سندھ کے ساتھ ساتھ سیٹ پور سے لے کر کوٹ کروڑ تک آباد ہونے میں کامیاب ہوئے۔ (16) ٹھٹھہ کے مقام پر تاریخ کی سب سے بڑی کسان بغاوت شاہ عنایت لنگاہ کی قیادت میں لڑی گئی تھی۔ کہیں آزاد اور کہیں کسی اور قبیلے کے ماتحت نسل کے بطور زندگی گزارتا ہے۔ حالیہ دور میں بھی بلوچستان میں جمہور اور جمہوری جدوجہد میں اس قبیلے کا بلند مقام ہے۔

لنڈ

مولائی شیدائی کہتے ہیں کہ مری اور کھیز انوں نے گورگیوؤں کا ساتھ دیا۔ (14) مشرقی بلوچستان سے بلیدیوں کے اخراج کی وجہ بھی یہی جنگیں ہیں۔ یہ لوگ سبی میں اب بھی ہیں مگر بہت کم تعداد میں۔

گولہ

یہ بلوچ قبیلہ بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں بکھرے ہوئے انداز میں موجود ہے۔ گولہ جعفر آباد، نصیر آباد، سبی، قمبر، جیکب آباد اور لاڑکانہ میں آباد ہیں۔ صحبت خان گولہ نے بہت سے علاقوں میں سرانے تعمیر کرائے۔ اس پہ بڑی تحقیق کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سرانے جیکب آباد، نصیر آباد، جعفر آباد اور سبی میں بنوائے گئے۔ ان مسافر خانوں میں رات بسر کرنے والوں کو کھانا اور رہائش مفت فراہم ہوتا تھا۔ زیادہ تر بلوچی زبان بولتے ہیں مگر بہت سے بلوچوں کی طرح گولہ لوگ بھی سندھی اور سرائیکی کو بطور مادری زبان استعمال کرتے ہیں۔

لاشاری

(ایرانی بلوچستان کے علاقہ لاشار سے لاشاری)۔ لاشاری اور رند، دراصل دو ایسے سرچشمے ہیں جن سے سارے بلوچ قبائل خود کو منسوب کرتے ہیں۔ یہ غلط مفروضہ ہے۔ یہ بات بھی کہ بلوچستان کی طرف مہاجرت کرتے ہوئے گوہرام، لاشاری کی سربراہی کرتا ہوا، اور چاکر رندوں کی سربراہی کرتا ہوا خانہ جنگی لڑتے رہے، درست نہیں ہے۔ بلوچ، رند و لاشار کی بلوچستان میں آمد سے قبل کی بہت قدیم قوم ہے۔ اسی طرح بے شمار قبائل اور ان کے ذیلی طائفے بہت بعد میں تشکیل پائے۔ یہ دونوں سرچشمے ہم بلوچوں کے آباؤ اجداد ہیں۔ اور بے شمار قبائل اپنی شناخت رند یا لاشار کے انہی سرچشموں سے کرتے ہیں۔ مگر یہ خود اپنے نام سے بھی دو چھوٹے قبیلے اب تک برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے لاشاری دریائے لاشاری کے تاس اور سرسبز کی وادی میں رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ بمپور کے جنوبی میدانوں میں رہتے ہیں اور کاشتکاری کرتے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں لاشاری ملتان، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان اور مظفر گڑھ میں رہتے ہیں۔ اس

بلوچی زبان و ادب اور ثقافت کے امین ان لوگوں کی ترقی اور بہبود کا بہت سارا کام کرنا ہے۔

لہڑی

ان کا اصل ہیڈ کوارٹر نرمک رہا ہے۔ اس کے علاوہ بکھری ہوئی صورت میں یہ لوگ کوئٹہ، سبی، ڈھاڈر، مستنگ، قلات اور کچھی میں آباد ہیں۔

کلات کی خانی کے زمانے میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر زراعت اور مویشی بانی پہ انحصار کرتے ہیں۔ البتہ شہری درمیانہ طبقے کی تجارتی، اور ٹرانسپورٹ سرگرمیوں، نیز سرکاری ملازمتوں میں بھی بلوچوں کا یہ قبیلہ شامل ہے۔

لیغاری

یہ اصلی رند قبیلہ ہے۔ بلوچستان کا رکھنی اور بارکھان لیغاریوں کے علاقے ہوا کرتے تھے۔ مگر آج یہ قبیلہ بارکھان اور رکھنی کی بجائے کوہ سلیمان کا بڑا بھاری قبیلہ ہے۔ یہ قبیلہ درہ کوڑا سے لے کر تخی سرور تک پھیلا ہوا ہے۔ پنجاب بلوچستان شاہراہ اسی قبیلے میں سے گزرتی ہے۔ فورٹ منرو انہی کا تفریحی مقام ہے اور اس سے ملحقہ وادیاں قدرتی حسن کا عظیم عطیہ ہیں۔ اس قبیلے کے چار حصے ہوتے ہیں؛ ہدیانڑی، آلیانڑی، بگلانڑی اور ہیوتانڑی۔ آلیانڑی سردار کا گھرانہ ہے۔

لیغاریوں کے فیوڈل سردار چوٹی نامی جگہ میں رہتے ہیں۔ اس قبیلہ کے افراد ڈیرہ غازی خان، ملتان، راجن پور اور کوہ سلیمان پر اور مظفر گڑھ کے علاوہ کوہ سلیمان کے دوسرے سرے پر ڈیرہ اسماعیل خان اور سندھ میں رہتے ہیں۔

سندھ کے تالپور بھی اصل میں لیغاری ہیں۔ ایک عرصے تک سندھ پہ حکمرانی کرنے والے اس قبیلے کے دور ہی میں صوفی عنایت شاہ کی المناک شہادت ہوئی تھی۔ خواہن قلات کے ساتھ ان کی ناچاقی بھی بہت مشہور ہے۔ مگر بیسویں صدی کے اوائل میں یوسف علی مگسی کا ساتھ دینے والے ان لوگوں کا بلوچ تاریخ میں ہمیشہ نام لیا جاتا رہا ہے۔ مجموعی طور پر یہ قبیلہ مویشی بانی اور کاشتکاری سے وابستہ ہے۔

سندھ اور ڈیرہ غازی خان میں بکھرا قبیلہ ہے۔ اس کی ذیلی شاخوں میں لُنڈ، کھوسہ، رند، حیدرانی، احمدانڑی، گورشانڑی، خلیلانڑی اور نوحانی شامل ہیں۔ شادان لُنڈ ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

لوڑی

ایک اہم ترکیبی جڑ ہے۔ جنگ وامن میں خبر لانے اور لے جانے والا ہوتا تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر دور دراز تک لوگوں کو دعوت نامے (لوٹ) پہنچاتا تھا۔ بلوچ راج میں فنکار کی حیثیت بھی لوڑی کو حاصل ہے۔ یہ نسل در نسل موسیقی کے مختلف ساز، ڈھول وغیرہ بجانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہ بلوچ شہری محنت کش کی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ دارتراش (لکڑی کا کام کرنے والا)، آسن کار (لوہار) زرگر (سنار) وغیرہ۔ ان کے اندر جدید دور کا سورج بہت نرم گامی سے داخل ہو رہا ہے۔ تعلیم، نوکری اور سیاسی شعور ان کی نجات کی دُور افتادہ منزل کی طرف اُن کو مدد دے رہے ہیں۔ (17)

یہ وہ فنکار لوگ اور گھرانے ہیں جنہیں عزت سے ”لوڑی“ کہا جاتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمارے سماج میں ان کی کوئی عزت، کوئی وقار اور کوئی مقام نہیں ہوتا۔ یہ موسیقار پائین ترین درجے کے شہری ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ لوڑی کا درجہ غلام سے بھی کمتر ہے۔ یہ مخصوص خاندانوں سے ہوتے ہیں۔ یہ شادیوں میں، جشن میں گانے گاتے ہیں، ساز بجاتے ہیں، رقص کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ ”اصل“ نہیں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہیں ”کم اصل“ کا گھٹیا درجہ نصیب ہے۔ ان کا کوئی خون بہا، کوئی انتقام کوئی سیاہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی بلوچ کسی لوڑی یا ڈومب کی عورت سے شادی کرے تو اس کی اولاد کو جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ وہ عموماً علاقے کی دائی (نیم حکیم) ہوتی ہے۔

لوڑی سارے بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بلوچستان، جو بھیانک انداز میں بے اتفاق ہے، بری طرح توڑ پھوڑ میں ہے اور ہلاکت خیز جنگوں کی سرزمین ہے، وہاں ڈومب اور لوڑی کو قتل کرنا جرم ہے۔ گو کہ ہر قبیلے کا اپنا اپنا لوڑی گھرانہ ہوتا ہے مگر یہ جنگی حالت میں بھی دوسرے قبیلے میں آ جاسکتے ہیں۔ ان کی قبائلی ڈیوٹیاں بے شمار ہیں۔ صرف مکران میں ان کی عیاشی ہے اس لیے کہ وہاں قبائلی نظام ٹوٹ گیا۔ ڈومب، لوڑی بھی ہے، سنار بھی، نغمہ نگار بھی، گلوکار بھی۔ پیغام بر بھی ہے اور رشتے کرانے والا بھی۔ وہ ہر فن مولا ہے۔

ہوئے یہ پہاڑ نہ صرف درخت و سبزہ سے عاری ہیں بلکہ بے حسن و بے مہر بھی ہیں۔ ان پہاڑوں کے درمیان البتہ کہیں کہیں اچھی چراگاہیں موجود ہیں۔ وادیوں میں بکھرے ہوئے زرعی قطعات پہاڑوں کے اندر رنگین پیوند کی مانند لگتے ہیں۔ اس قبیلے کا رقبہ بھی بلوچستان کے رقبے کی طرح بہت وسیع ہے اور آبادی کم۔

مری علاقہ مغرب میں سبی، مشرق میں کھیترا، شمال میں دکی لورالائی اور جنوب میں عظمتوں بھرے گئی قبائل سے گلے ملتا ہے، کبھی قہر میں کبھی مہر میں۔ اپنے اس آبائی علاقہ کے علاوہ مری قبیلہ کے کچھ طائفے مکمل اور کچھ جزوی طور پر جھالاوان، کوسٹ، ڈوب، بکران، سبی حتیٰ کہ افغانستان اور خلیج میں آباد ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پورا مری قبیلہ اب کوئی معاشی اتحاد یہ نہ رہا۔ روٹی کے حصول کی سرگردانی، اور حکومت کے ساتھ جنگوں نے اسے باجرے کے بیج کی طرح بے دردی سے پوری قوت کے ساتھ پوری دنیا میں چھڑک ڈالا ہے۔ چنانچہ اب مری قبیلہ ہر بلوچ علاقے میں پایا جاتا ہے۔ سندھ کا بھی تقریباً ہر ضلع مری سے آشنا ہے۔ مری کہیں یہ سرمایہ دارانہ نظام میں رہے ہیں، کہیں فیوڈل نظام میں اور کہیں سرقبیلوی نظام میں۔ مگر خواہ وہ جہاں ہوں، جس پٹے سے بھی منسلک ہوں، اُن کے دل اپنے قبیلے، اپنے علاقے اور اپنے پہاڑوں کی کھونٹیوں کے ساتھ مضبوطی سے بندھے ہوتے ہیں۔

مری 1839 میں انگریزوں کے ساتھ واسطہ میں آئے جب انگریز بولان کے راستے افغانستان پر قبضہ کرنے جا رہا تھا۔ مگر وہ بھلا سلامت کیوں جاتا؟ دوسروں پر ناجائز قبضہ کرنے مری اُسے کیوں کر چھوڑتے؟ چنانچہ جان کین کی اس فوج پر حملہ کر کے طویل مری وانگریز جنگوں کا آغاز کر دیا۔ انگریز حملہ آوروں کے خلاف بے شمار چھوٹے چھوٹے گوریلا حملوں کے علاوہ باقاعدہ پانچ بڑی جنگیں لڑ چکا ہے۔ ایسی جنگیں جہاں بہادری، سامراج دشمنی وطن دوستی اور آزادی پسندی اپنی ممکنہ انسانی عروج پر نظر آتی ہیں۔

بجاری، گزینی اور لوہارانی اس بڑے قبیلے کی بڑی شاخیں ہیں۔ مگر مری میں، دوسرے بلوچ قبائل کی بہ نسبت غیر مریوں کو اپنے اندر ضم کرنے کی زبردست صلاحیت اور رجحان موجود

پتہ نہیں کس درجے کا احساس کمتری ہے اُن دانشوروں میں جو ”لیغاری“ کو ”لغاری“ بنا دینے کے درپے ہیں۔ اس ”ی“ نے اُن کا کیا بگاڑا ہے جسے وہ قبیلہ بدر کرنا چاہتے ہیں۔ موجودہ نام کے ساتھ اس قبیلے کی قبیلوی تشکیل کلاسیکل شاعری سے بہت بعد کے زمانے میں ہوئی۔

ماما سنئی

یہ بہت ہی قدیم بلوچ قبیلہ ہے۔ شاید آبادی میں بلوچوں کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ یہ لوگ افغانستان ایران اور پاکستان کے بلوچوں کا سنگم بناتے ہیں۔ سندھ میں بھی ان کے طائفے ملتے ہیں۔ یہ لوگ رخشانی بلوچی بولتے ہیں۔ براہوی اور سندھی بھی ان کی مادری زبانیں ہیں۔ اُن کا سردار گھرانہ (کلمی زئی) مشکے میں رہتا ہے۔ اس کے ذیلی طائفے ہیں: شیخ حسینی، مزارزئی، مرداں شئی، شادادزئی، کوراجی، سُماٹلی، مزارزئی، رنگیانویں، شاہی زئی، یوسفی، شیروزئی، زیرکانی، دُرک زئی، عیدوزئی، یاغی زئی، کیا زئی، منڈا زئی، سیاہی زئی، خبرائی، مزارزئی، بنگل زئی، شاہوزئی، حسینی، کلمی زئی۔

مامشئی

مامشئی کی طرح ایک قدیم قبیلہ ہے۔ زیادہ تر براہوی بولتے ہیں۔ یہ قبیلہ مستنگ میں کوہک، کاہوا کوہ ماران کے نواح میں آباد ہیں۔ نسبتاً امن پسند قبیلہ ہے۔ مولیشی کے علاوہ بارانی (اور کہیں کہیں کاریزوٹیوب ویل والی) کا شکار کرتے ہیں۔ اس کے ذیلی طائفے یوں ہیں: سمانی، سورو، بنگلا، ہزارانویں۔

مری

یہ قبیلہ اس وقت پاکستانی بلوچوں میں سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ ان کا سوتیلا اور عاق کردہ علاقہ، کوہ سلیمان کے جنوب میں خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش کے طور پر آباد ہے۔ اس کے پہاڑ مشرقی بلوچستان کے دوسرے تمام قبیلوں کی طرح کوہ سلیمان کی اتزتی ہوئی کھردری، بے ترتیب اور دشوار چٹانیں ہیں جن کا جھکاؤ میدانون کی جانب دکھائی پڑتا ہے۔ ندی نالوں سے پھٹے

رہا ہے۔ یہ سلسلہ کبھی نہیں رکا۔

مری میں بجا خان کی موت کے بعد اس کا بیٹا آزاد خان سردار بنا مگر وہ لا ولد فوت ہو گیا۔ اور سرداری بجا خان کے بھائی درویش خان کو منتقل ہو گئی مگر اس سے سرداری وزیر خان آلیانی نے چھین لی۔ اس عرصے میں گزین خان مری قبیلے میں آیا۔ (18)

مادند کے پہاڑوں میں آباد ہونے اور بعد میں مری کا نام وضع کرنے کے بعد اس قبیلے کے لوگوں نے مشرقی جانب کا علاقہ حسنی سے قبضہ کیا اور شمال میں کونٹ منڈاہی کا علاقہ پشتونوں سے لے لیا اور یہاں آباد ہو گئے۔

انگریز کی تاریخ کی کتابوں میں مری علاقے کا مطلب تھا: منڈاھی، مادند، کاہان اور نیساؤ۔ سب گزٹیر کے صفحہ نمبر 264 میں یوں بیان یا گیا ہے: ”مری کا علاقہ تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے؛

1- کاہان (2353 فٹ)۔

2- بشمول تڈڑی، ڈاھو، بانور، پیلاو، ایک حصہ، نیساؤ، اور جٹلی (2847 فٹ)۔

3- مادند (2600 فٹ) اور گمبولی۔

کوہلوادی کومری نے کہیں جا کر جولائی 1878ء میں کمزور اور کم تعداد میں رہ جانے والے زرکار قبیلے سے قبضہ کر لیا۔ اور اسے چار حصوں میں تقسیم کر لیا۔ جس کے تحت گزینی مری نے اروا، ونگا، پشت، ماڑ اور باہر لے لیے۔ لوہارانی نے ناڑیال، کالی کڑ، سوار اور میدار۔ اور بجاہانی وزرکار نے باغ، بھر، زیارت اور سونڑی لے لیے۔ گلوگوز و سردار مہر اللہ خان کو پنجک کے بطور مل گیا۔ (19)

مری قبیلہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ تین کو بلوچی میں سے کہتے ہیں۔ اس طرح تین حصوں میں سے ہر ایک کو ”سے یک“ کہتے ہیں۔ یہ تینوں سیک ہیں: گزینی، لوہارانی، بجاہانی۔

لوہارانی: یہ چار ذیلی شاخوں میں تقسیم ہے: لوہارانی، شیرانی، مہدائیں، شاہائیں۔ لوہارانی کی ذیلی شاخ ہیں: جندو، سارنگ، دُرک، ولیداد (غلام عورت سے بیٹے کا نام سیاہ پاؤ تھا)۔ شیرانی (لوہارانی) کے چار فرقے ہیں: جندو، سارنگ، سارنگائیں، درکارائیں، بیلو؟ دھڑ۔ جندو، جندو

یہ سے ولیدادائیں اور جندووانی آتے ہیں۔ سارنگانی میں ہمیدانی اور سیاہ پاد۔

شاید میلوہڑ میں گند، شکائیں، بنگوار، رندکارائیں، قویانی، گندل گوار آتے ہیں۔

گزینی: کے ذیلی فرقے ہیں: نوذ بندکارائیں، بھاولان زئی، لانگھائیں،

عالیائیں، مہکارائیں، ٹینگائیں، مہدائیں، ٹنگ، عیسو، چلگاری، ٹنگ، مہدائیں،

مزارائیں، لوڑی گیش، گونچی، بدائیں، ہلیلا، چوری، مَرگیا، جروار، کبہہ واڑ، کھور خاں زئی، اور ہڈوار۔

جروار شہدادکوٹ، کمر، لاڑکانہ، ساگڑھ، حیدر آباد، بدین، میر پور خاص، کشمور اور چیکب

آباد میں اب کہیں کہیں ایک الگ قبیلے کے بطور بھی موجود ہیں۔ جروار اچھستان ہندوستان میں بھی ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔

بجاہانڈیں: بجاہانڈیں کی پانچ ذیلی شاخیں ہیں۔ اس لیے کہ بجاہانڈیں پانچ بیٹے

تھے: سالار، سومر، پیڑ داڈ، قلندر، گنگر۔ چنانچہ سالارائیں، سومر، پیر داڈانی، قلندرائیں،

اور گنگرائیں۔ ان پانچ ذیلی شاخوں کو ”بند بجاہانڈیں“ کہتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں ”پش بجاہانڈیں“ بھی کہتے ہیں۔

بجاہانی میں باہر سے آنے والے قبائل ہیں: رامکانی، شاہجو (گزینی سے آئے ہیں)

۔ پواد کی کوہ سلیمان سے آیا، قیصرائیں سب سے بعد میں آئے۔ چانڈھے بھی باہر سے آیا۔ چانڈ ہے اور شیلانچ جہاں ہوں، مکس ہو جاتے ہیں۔

سالار انڈیں: بجاہانی میں سالار کا بیٹا تھا سوزل۔ جس کے بھتیجے کا نام کمال تھا جہاں

سے کمالہائیں اور بٹرائیں بنے۔ سالار کے بیٹے سوزل کے چھ بیٹھے تھے: لودھاڑ، رحیم خان، روحیل، لودی، یارخان، شیکھ۔

سالارائیں میں باہر سے آکر شامل ہونے والے یہ ہیں: بابائیں (مزاری سے آئے

ہیں)، موسیٰ زئی، شیرخان زئی (علاقہ باڈور سے آئے ہیں)، شیلانچ (حسنی سے آیا ہے)، رندہاں

زئی، بٹرائیں (دھڑیچے سے آیا ہے جسے سوزل کے بھتیجے کمال نے پالا)۔ کچھ کہتے ہیں کہ لودی زئی

نہالان کے بیٹے کرم خان کے چار بیٹے تھے؛ شربت، مڑز یہان، بہار خان اور سیدہان۔ شربت کے دو بیٹے ہوئے؛ تورخان، نور محمد۔ جبکہ فتح خان کے پانچ بیٹوں کے نام تھے: ہذا بشک، ہذا داف، بیورغ، نہالان، باہر۔

چانڈھے اور سیلاچی نہ صرف مری قبیلے میں بکھرے ہوئے موجود ہیں بلکہ بہت سارے قبائل میں بھی ہیں۔

مریٹھ

یہ طبقہ ابتدا میں غلام ہوا کرتا تھا۔ کچھ محققین کہتے ہیں کہ یہ نسلاً ہندوستان والے مرہٹے ہیں جو جنگ کے نتیجے میں غلام بنا کر لائے گئے ہیں اور بلوچ قوم نے باہم مال غنیمت کے بطور تقسیم کر کے اپنے اشرافیہ کی خدمت گزاری میں استعمال کیے۔ ان کا مقام عام بلوچ سے بہت کم تر جانا جاتا ہے۔ راجی زمین میں مریٹھ حصہ دار نہیں ہوتا۔ سیاہ کاری یا قتل ہونے کی صورت میں اس طبقے کا خون بہا وغیرہ بھی دوسرے بلوچ راج سے کم تر مانا جاتا ہے۔ (20)

مریٹھ بالخصوص بگٹی اور مری قبیلہ میں ہیں۔ اور وہاں خانہ بدوشی کے بجائے دیہات و شہر میں رہتے ہیں۔

مزاری

یہ قدیم بلوچ قبیلہ مزار یعنی شیر سے منسوب ہے۔ اس بارے میں عوام کے اندر بہت دلکش روایتیں موجود ہیں۔

مزاری ڈیرہ غازی خان کے جنوبی علاقہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان کا علاقہ جبکہ آباد تک پھیلا ہوا ہے اور شمال میں یہ عمرکوٹ اور پٹک درہ تک پھیلا ہوا قبیلہ ہے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر روہان مزاری کہلاتا ہے۔ بالا چانڑیں ان کا حکمران طائفہ ہے۔ مزاری 1836 سے لے کر 1838 تک حملہ آور سکھوں کے دانت توڑتے رہے ہیں۔ ہر بلوچ قبیلے کی طرح اپنے رسم و رواج پر بنیاد پرستی کی حد تک قائم ہے۔ مزاری قبیلہ پڑوسیوں کے ساتھ خونیں جنگوں میں الجھا رہا ہے۔ اس قبیلے کے لوگ فیوڈل پیداواری رشتوں سے منسلک ہیں۔ کشمور کا قلعہ میر نصیر خان

بھی باہر سے آئے ہیں اور سوزل کا چھٹا بیٹا لودھی نہیں بلکہ روہیل ہے۔

سومرا نڈیں: سومرا کا بیٹا تھا وزیر (اول)۔ اُس کے چار بیٹے تھے: وشہال، پلو، گلو، شاد یہان (اول)۔ پلو کے تین بیٹے تھے: بہار خان، جلالہان اور علی گل۔ جلالہان کا بیٹا تھا مست تو کلی کا گہرا دوست بہار خان جس کے دو بیٹے تھے آدوار جہاں خان۔ جہاں خان کے دو بیٹے تھے: عمر خان اور صا حوان۔ صا حوان کے دو بیٹے کریمو اور جلالہان تھے۔ جبکہ عمر خان کے دو بیٹوں کا نام تھا حمل اور بہار خان۔ بہار خان کا بیٹا عمر خان تھا۔

شاد یہان اول کے تین بیٹے ہوئے؛ دلیل (اول)، دولتان اور بلوچاں۔ دلیل اول کا بیٹا ہوا شاد یہان (دوئم) جس کا بیٹا ہوا دلیل (دوئم)۔ جس کے دو بیٹے تھے زر خان اور وزیر دوم۔ (میں اسی وزیر کا پوتا ہوں)۔ جس کے بیٹے تھے میاں خان، بختیار خان، سحراب خان، بہرام خان، حاجی محمد مراد۔

سومرا نڈیں میں باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں؛ سومرا نڈی اور گوئہرام نڈی۔ **کلوانڈیں:** پانچ ذیلی فرقوں میں تقسیم ہوتا ہے؛ وڈیرہ نڈی، پیری نڈی، گرانی، ڈاھی نڈی، مہرو نڈی۔ کلو سے منسوب اس قبیلے کے، شاہو سے منسوب شاہجو سے نزدیکی ہے، اس لیے کہ یہ دونوں افراد باہم بھائی تھے۔

رامکانڈیں: اس کو ہستانی قبیلے میں آج شامل قبائل ہیں؛ بوڈو نڈی، للوانی، پروئی، لال خان نڈی۔

کنگرا نڈیں: کنگر سے کنگرا نڈیں بنا جس کے ذیلی فرقے ہیں؛ عالیانڈیں، حسو نڈی، وڈیرہ نڈی اور شکا نڈیں۔ بزدار اور کھوسہ باہر سے آکر کنگرانی میں شامل ہوئے۔

قلندر انڈیں: قلندر سے منسوب قبیلہ ہے جس کے دو بیٹے تھے؛ باران اور نہالان۔ جبکہ باران سے باران نڈی کے چار ذیلی فرقے ہیں؛ رندکانڈیں، نور خاں نڈی، وڈیرہ نڈی، گلو نڈی۔ قلندر انڈیں میں بعد میں شامل ہونے والے فرقے ہیں؛ باران نڈی، ڈانگیا نڈیں، گریانی، شیلانڈی، محبتانی، مصری نڈی، ملگزار نڈی اور میاں خاں نڈی۔

اور ڈمبکی نے خان قلات کی اطاعت قبول کر لی۔ اور دو سو سال سے اُن کی تاریخ خوانین قلات کی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے۔ خان کے دربار میں مگسی قبیلے کا شمار جھالاوان کے قبائل میں ہوتا ہے۔

اس قبیلے نے بلوچ قومی عوامی تحریک میں شرف و عزت کا مقام اُس وقت حاصل کیا جب اس نے یوسف علی خان نامی بیٹے کو جنا۔ انہیں بلوچوں میں ”بابائے قوم“ کا مقام حاصل ہے۔ وہ بلوچ کے مستقبل کا قطب نمایں۔ کئی نسلوں سے لوگ ان کے نظریات کی پیروی کرتے رہے ہیں۔

مگسی کے فرقے یوں ہیں؛ بھوتانڑیں، شہانڑیں، شہرانڑیں، راجپہ، بجرانڑیں، مرزائی، نندانی، راتانی، سوبھانی، ساکھانی، روہیچہ، مغنیانی، کھوسہ، بنگلا نڑیں، ہسرا نی، کانیار، خاٹوہل، پسبانڑیں، مغیری، احمدانی، مری، بولٹی، لشکانڑیں، لاشاری، فصلا نڑیں، چندرامان، عمرانی، جنگ، شاہ موزئی، گادھی، گمرانڑیں، گولانڑیں، سیاہ زئی اور جاگیرانڑیں (21)۔ بھوتانڑیں، مگسیوں کو سردار سپلائی کرنے والا طائفہ ہے۔ ان کے پاس بے شمار زرعی زمین ہے۔ مگسی قبیلہ پاکستانی بلوچستان، ایرانی بلوچستان کے علاوہ سندھ میں بھی بڑی تعداد میں آباد ہے۔

ڈیمز کی تحقیق ہے کہ یہ قبیلہ لاشاری اولاد ہے۔ مگسی کے جد اجداد فرقے زیادہ تر لاشاری کے نام سے منسوب ہیں۔ انہیں گندراواہ (کندابیل) کی زمین شاہ حسین نامی حکمران نے اس لیے دی کہ مگسی نے فیروز جام کے خلاف جنگوں میں شاہ حسین کا ساتھ دیا تھا۔

ملغانڈین

میرٹلغ خان سے منسوب یہ قبیلہ اصل رند قبیلہ ہے۔ ڈیرہ غازی خان کا علاقہ ان کا سب سے بڑا مسکن ہے مگر اپنے دیگر بلوچ قبائل کی طرح یہ بھی سندھ کے مختلف اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ یہ قبیلہ سردار اسلم ملغانڑیں کی قیادت میں انگریزوں سے بھڑ گیا تھا۔ یہ تعلیم یافتہ قبیلہ ہے۔

ٹیپہ

غلام نبی ساجد بزدار کی معلومات کے مطابق یہ زرخیز غلاموں کا طبقہ ہے۔ اب یہ خرید و فروخت باقی نہیں رہی۔ (22) لہذا بطور قبیلہ یا فرقہ ان کا الگ وجود موجود نہیں ہے۔

نے مزار یوں کو قابو کرنے کے لیے بنوایا تھا۔ (جب میر گلشیر خان 1764 میں اپنے والد کی وفات کے بعد سردار بنا اور میر نصیر خان نے مزار یوں پر حملہ کر کے گلشیر کو قتل کر دیا)۔ بالا چانڑیں، رستمائیں 1836 تک حملہ اور سکھوں کے دانت توڑتے رہے، میدانی اور سرگانڑیں اس کے بڑے طاقتور تھے ہیں۔

مستوئی

سندھ، ڈیرہ غازی خان، اور پٹ فیڈر میں ہیں۔ یہ ایک مخلوط، چھوٹا اور بہت بکھرا ہوا قبیلہ ہے۔ یہ لوگ بلوچ کی ایک اور قومی زبان، سرائیکی بولتے ہیں۔ اس کی موجودہ نام سے قبائلی تشکیل بہت حالیہ ہے۔ بلوچی کلاسیک میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

مغربی دامانی

یہ لوگ خود کو مری سمجھتے ہیں۔ بمپور دریا کے تاس میں آباد ہیں۔ وہ اناج اور کپاس و تمباکو کاشت کرتے ہیں۔

مکرانی

اس نام سے ہندوستان کے گجرات میں ایک بکھری بلوچ آبادی رہتی ہے۔ ان کے ساتھ بلوچوں کا ایک اور گروہ بھی رہتا ہے ”سیلمانی“ کے نام سے۔ گجرات کے ان مکرانی بلوچوں کی ذیلی شاخوں کے نام ہیں؛ آسکانی، بلوچ، عمر زئی، رند، ملکا جی اور گڈیازئی۔

مگسی

اس قبیلے کا نام مغربی بلوچستان کی مگس وادی کے نام سے متعلق ہے۔ کھیتی باڑی بالخصوص کھجور، اناج اور صنعتی فصل یعنی کپاس کی کاشتکاری کرتے ہیں۔

مگسی، گندراواہ اور جھل کے علاقے میں بھی رہتے ہیں جہاں ان کے فیوڈل (سردار) رہتے ہیں۔ مگر یہ قبیلہ سندھ میں ایک بڑے قبیلے کے بطور موجود ہے۔ اسی طرح میں نے اندرون پنجاب میں بے شمار مگسی آبادیاں دیکھی ہیں۔ جن بلوچوں کو لاشاری کہا جاتا ہے یا گوہرام کی اولاد سمجھا جاتا ہے ان میں مگسی قبیلہ نمایاں ہے۔ ہماری کلاسیکل شاعری میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ مشرقی قبائل میں صرف مگسی

اس کے قبائلی فرقے کبھی کبھی تو الگ قبائل لگتے ہیں۔ زگر مینگل اور شاہی زئی مینگل تو بڑی شاخیں ہیں مگر اس کی چھوٹی ذیلی شاخیں ہیں: مرحاجی، پہلواں زئی، حمل زئی، گمشاد زئی، زگر، دینار زئی، باران زئی، سالانڑی، قلندر انڑی، گرگناڑی، میروانڑی، قمر انڑی (23) نور مینگل، عطا اللہ خان مینگل، گل خان نصیر لونگ خان، عاقل خان اور گوہر ملک کی بلوچ قومی و عوامی سیاست، اور ادب میں بے مثال قربانیوں کی وجہ سے مینگل دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں۔

ناروئی

ایرانی بلوچستان میں رہتے ہیں، اور تقریباً 23 قبائلی فرقوں میں منقسم ہیں۔ کاشنکاری میں بھی اچھے خاصے استاد ہیں۔ ان کا سردار نصرت آباد میں رہتا ہے۔ یہ لوگ مالدار اور شتر بانی کرتے ہیں۔ ”جرجیم“ نامی عمدہ قالین بناتے ہیں۔ یہ سیستان و خراسان میں بھی رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ چاغی، کوئٹہ اور پشین میں بھی آباد ہیں۔

نتکانڑی

(نوٹک، نوٹکانڑی)

تخصیل تونسہ میں آباد ہے جس کا صدر مقام منگڑوٹھا ہے۔ یہ بلوچوں کا نسبتاً ایک خواندہ قبیلہ ہے۔ رنجیت سنگھ دور کے ابتدائی ایام میں اس کا قبائلی تشخص تباہ ہو گیا۔ (24) یہ سارا قبیلہ بلوچوں کی ایک قومی زبان سرائیکی بولتا ہے۔ ملغانی جیسا مشہور قبیلہ دراصل اسی کی شاخ ہے۔

نظامانڑی

جناب قادر بخش نظامانڑی کا قبیلہ ہے جو اب حیدر آباد میں آباد ہے۔ بنیادی طور پر یہ لوگ ڈیرہ غازی خان کے تھے۔ میامی کی مشہور جنگ اس قبیلے کے شہدا کی برپا کردہ تھی۔

نوهانڑی

رند و لاشار عہد کی شاعری میں ان کا ذکر آتا ہے۔ ڈیمز نے مغلوں کے خلاف بلوچ لڑائیوں میں ان کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

مید

مید ہمارے پاک ماہی گیر ہیں۔ اُن کے محنت کش ہاتھوں میں ان کے اپنے علاوہ ہماری روٹی روزی کا بھی انحصار ہے۔ یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، بلوچ بھوک سے نہیں مرے گا۔ اور بحیرہ بلوچ محفوظ ہاتھوں میں رہے گا۔

میرالی

رندی عہد کی بلوچی شاعری ان کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ آج کہاں ہیں، شاید کہیں بھی نہیں۔ یعنی منظم قبیلے کی صورت میں یہ لوگ اب وجود نہیں رکھتے۔

میرانڑی

ایک بکھرا قبیلہ ہے۔ اس کا ارتکاز تو سرحد پار والے بلوچستان میں ہے۔ ہمارے اس والے حصے میں میرانڑی بہت کم ہیں۔ البتہ پنجاب میں یہ لوگ زیادہ ہیں اور دوسرے نمبر پر سندھ میں الگ الگ مقامات میں موجود ہیں۔

میرواڑی

میرواڑی قبیلہ نغاڑ سوراب میں سکونت پذیر ہے اور یہ احمد زئی خاندان کا جد امجد قبیلہ ہے اس نے احمد زئی خاندان کی تشکیل سے پہلے نغاڑ میں سرداری کے فرائض انجام دیے اور میر عمر میرواڑی اس میں مشہور تاریخی شخصیت گزری ہے۔ اس کی ذیلی شاخیں کمرانڑی، گرگناڑی، احمد زئی اور التازئی ہیں۔

مینگل

مینگل قبیلہ ایک بکھرا ہوا قبیلہ ہے۔ افغانستان، ایران اور پاکستان تینوں ممالک میں آباد ہے۔ اسی طرح ضلع چاغی، ضلع خضدار، پٹ فیڈر اور سندھ کے مختلف مقامات پر کہیں گنجان اور کہیں چند گھرانوں کے بطور رہتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ قبیلہ بقیہ بلوچوں کی طرح بھیڑ پالی اور زراعت سے وابستہ ہے۔

ہوت

مکران کا قبیلہ ہے۔ اس کے کچھ گھرانے ڈیرہ اسماعیل خان، جھنگ، ملتان، اور ڈیرہ غازی خان کے علاقوں میں بھی رہتے ہیں۔ ہوت، مکران میں تو حاکم بھی رہے ہیں، ابھی بھی وہاں کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ ایران میں بھی موجود ہیں۔ شاہ لطیف نے اس قبیلے کو تاقیامت زندگانی بخشی ہے۔ اس لیے کہ اس کی شاعری کی اہم ترین کردار، سسی کا محبوب پنوں، ہوت بلوچ تھا۔

یار احمد زئی

یہ لوگ خواش، ارندگان، بمپور، گشت، دیزک اور جالک میں آباد ہیں۔ ان قبائل کی اکثریت خانہ بدوش مالدار کرتی ہے۔ یار احمد زئی مندرجہ ذیل گروپوں میں منقسم ہیں؛
سہراب زئی، محمود زئی، شیر زئی اور میر خیل زئی۔

حوالہ جات

1- نصیر، گل خان۔ کوچ و بلوچ۔ صفحہ 104

2- نصیر، گل خان۔ کوچ و بلوچ۔ صفحہ 117

3- گزٹیر، کبھی۔ 1986۔ صفحہ 51 گوشہ ادب کوئٹہ۔

4- گزٹیر بلوچستان، سبی۔ دوسرا ایڈیشن۔ 1986۔ گوشہ ادب کوئٹہ۔ صفحہ 55

<http://en.wikipedia.org/w/index.php?title=chandio&oldid=478597990>

6- لیغاری عبدالقادر۔ تاریخ ڈیرہ غازی خان۔ حصہ دوم۔ صفحہ 51

7- میکلیکن، ای ڈی/ایچ اے روز۔ ترجمہ یاسر۔ پنجاب و فرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا، 2004۔ بک ہوم۔ صفحہ 213

8- ہنورام/گنٹی، عزیز۔ بلوچ قبائل۔ 2004۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 54

9- میکلیکن، ای ڈی/ایچ اے روز۔ ترجمہ یاسر۔ پنجاب و فرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا،

2004۔ بک ہوم۔ صفحہ 343

10- ٹھلر فریڈ۔ نومیدزم اینڈ کالونیازم۔ 2002۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ 200

11- ٹھلر فریڈ۔ نومیدزم اینڈ کالونیازم۔ 2002۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ 201

12- ٹھلر فریڈ۔ نومیدزم اینڈ کالونیازم۔ 2002۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ 202

13- میکلیکن، ای ڈی/ایچ اے روز۔ ترجمہ یاسر۔ پنجاب و فرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا،

2004۔ بک ہوم۔ صفحہ 360

14- شیدائی مولائی۔ تاریخ قلات (حصہ اول)۔ 1983۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ 171

15- میکلیکن، ای ڈی/ایچ اے روز۔ ترجمہ یاسر۔ پنجاب و فرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا،

2004۔ بک ہوم۔ صفحہ 381

16- میکلیکن، ای ڈی/ایچ اے روز۔ ترجمہ یاسر۔ پنجاب و فرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا،

2004۔ بک ہوم۔ صفحہ 390

17- بزدار، غلام نبی ساجد۔ سر قبیلوی نظام۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ دسمبر 2007۔ صفحہ 44

18- ہنورام۔ تاریخ بلوچستان۔ صفحہ 80

19- سبی گزٹیر۔ صفحہ 248

20- بزدار، غلام نبی ساجد۔ سر قبیلوی نظام۔۔۔ صفحہ 44

21- گزٹیر۔ کبھی۔ دوسرا ایڈیشن۔ 1986۔ گوشہ ادب۔ صفحہ 36

22- گزٹیر۔ کبھی۔ دوسرا ایڈیشن۔ 1986۔ گوشہ ادب۔ صفحہ نمبر 44

23- شیدائی مولائی۔ تاریخ قلات (حصہ اول)۔ 1983۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ 128

24- میکلیکن، ای ڈی/ایچ اے روز۔ ترجمہ یاسر۔ پنجاب و فرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا،

2004۔ بک ہوم۔ صفحہ 440

ساتھ سیاسی حاشیہ نشینی کا رشتہ تسلیم کرتے ہیں۔ یہ لیڈر پھر ”عمودی“ طور پر کام کرتا ہے۔
آئیے نیچے سے اوپر کی طرف بڑھیں:

فرد

ایک مردانہ معاشرے میں بھی فرد سے مطلب محض نرینہ شخص نہیں ہوتا ہے۔ عورت کے مقام سے بالکل غیر مطمئن ہونے کے باوجود ایک اضافی بات یہ ہے کہ عورت باہمی سردار گش جنگوں میں اہمیت اختیار کرتی ہے۔ گرم جنگ کے میدان میں عورت کا ظہور حتمی طور پر جنگ کو بند کرتا ہے۔ اسی طرح بڑی اور گھمبیر دشمنیوں میں ایک طرف کی عورت کا مخالف فریق کے گھر لے جانے سے پشت پاشت چلنے والی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔
عورت نہ صرف گھر اور گھرداری، اور نسل انسان کی تولید پرورش کے لیے مخصوص ہے، بلکہ وہ آؤٹ ڈور کی محنت بھی کرتی ہے۔

مردموبیٹی بانی اور زراعت کے امور سے متعلق اپنے حقوق و فرائض سے وابستہ ہوتا ہے، قبائلی جنگوں میں سپاہی ہوتا ہے۔ کچھ جرائم بالخصوص عورت سے شادی سے باہر والے تعلقات میں اس نے سزا انفرادی طور پر جھیلی ہوتی ہے۔ بقیہ سارے شروخیار و نیک و بد میں اپنے قبیلے کا اٹوٹ حصہ ہوتا ہے۔ بلوچ قبائلی فرد تقریباً تقریباً سماجی ہوتا ہے۔ اس کی انفرادیت قبیلے کے سمندر میں جذب رہتی ہے۔

خاندان

خاندان کے اندر انفرادی نامی اجسام ہوتے ہیں، جن کے اشتراک سے انسانی سماج کی سب سے بنیادی اکائی یعنی خاندان کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس نظام میں ممبر شپ، پوزیشن، اتھارٹی اور سٹیٹس باپ کی طرف سے اولاد کی طرف چلتی ہے۔ خاندان خیمہ و خانہ بدوشی میں ماں باپ اور نابالغ (جو ”شلوار پاؤزی“) نہ ہو، بچوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر دیہات اور قصبہ میں وسیع (extended) ہوتا ہے۔ ماں (ماٹ، آئی) باپ (پٹ، ابا) آپس میں ”زال و مرڈ“ (میاں بیوی) ہوتے ہیں۔ خاندان ”مرڈ“ ہی ہوتا ہے مگر بیوی ”لوغی یا لوغ بانک“۔ مائیں لیکن دو بھی ہو سکتی

2- قبیلے کا تنظیمی ڈھانچہ

بلوچستان تاریخی اور روایتی طور پر ایک کمزور ملک رہا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ بے شمار وادیوں پر مشتمل بہت سے چھوٹے چھوٹے معاشروں کا کنفیڈریشن رہا ہے جہاں (سوائے نصیر خان نوری کے کبھی) کوئی مرکزی اتھارٹی قائم نہ ہو سکی۔ قوم تنوع اور رنگارنگی میں مرکزیت کی طرف ارتقا کرتی جاتی ہے۔

مختلف علاقوں میں رائج مختلف ناموں اور اصطلاحوں کی یکسانیت تلاش کی جائے تو بلوچ قوم کا ڈھانچہ نچلے سطح پر موجود ”فرد“ سے لے کر ”قوم“ تک تقریباً یوں بنتا ہے:
فرد، لوغ، بولک (ترکی زبان کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے ”مردوں کا ایک گروہ“، ”زنی، ٹکر، سیک، تمن (قوم)، بلوچ۔ (1)

دنیا میں کوئی بھی انسانی سماج ساکن و ساکت و مردہ سماج نہیں ہوتا۔ ہمارا قبائلی نظام والا سماج بھی محض افراد کا عام سا مجموعہ نہ تھا۔ یہ ایک زندہ سماجی مجموعہ تھا جس میں بہت سے اجسام (قابل) تھے۔ انہی اجسام کے اندر کچھ اور اجسام (ذیلی فرقے) تھے اور ان تمام اجسام میں سب سے ابتدائی جسم کا نام خاندان ہے جو کہ فرد کے کاندھوں پر کھڑا ہے۔ اگر آپ چھوٹے چھوٹے پتھر وں سے ایک اہرام (Pyramid) بنائیں تو اُس کی چوٹی پر سردار ہوتا ہے جو اکیلا ہوتا ہے اور اختیارات سے بھر ہوا۔ اس احرام کی چوٹی سے نیچے آتے جائیں تو درجہ بدرجہ نیچے بڑی تعداد اور کم ہوتے ہوئے سٹیٹس، والی سطحیں ملیں گی۔ سب سے نیچے عوام ہوتے ہیں۔ (2)

گو کہ قبیلے کا پیریں مرڈ (سردار) سب سے بلند ہوتا ہے مگر قبائلی ہیرارکی میں ہر ایک پیریں مرڈ کا اپنا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے۔ اس نظام میں قبائلی سٹیٹس برابری پر زور نہیں دیتا بلکہ یہ ایک ہیرارکی میں بڑے اور چھوٹے لیڈروں کے درمیان سرپرستی اور حاشیہ نشینی کے سلسلہ پر مبنی ہے۔

مگر تنظیم کا سیاسی طور پر اہم پہلو یہ ہے کہ ہر گروپ کے ممبر اس گروپ کے لیڈر کے

مختلف خاندانوں کے پیریں مڑدوں میں سے پھر ایک ان پیریں مڑدوں کا پیریں مڑد بنتا ہے۔ اس طرح ہر سیکشن، ہر ٹکڑ اور ہر قبیلے کا ”پیریں مڑد“ ہوتا ہے۔

وڈیرہ

وڈیرہ اپنے ٹکڑ (ذیلی قبائلی فرقہ) کا بڑا ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت اپنے ذیلی فرقے میں تقریباً وہی ہوتی ہے جو سردار کی پورے تمن یا قبیلے میں ہوتی ہے۔ اس کا عہدہ موروثی ہوتا ہے جس میں اس پر دستار بندی (تاج پوشی) کی رسم لازمی ہوتی ہے اور اس کے سر پر دستار کا پہلا بل قبیلے کا سردار خود باندھتا ہے۔ وڈیرہ کو سردار کی طرح پگڑی والی زمین و جائیداد ملتی ہے۔ یہ زمین دستار کے ساتھ منتقل ہوتی جاتی ہے، اُسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

وڈیرہ جنگی صورت میں افراد مہیا کرتا ہے۔ تاوان یا غنیمت کی تقسیم اپنے قبیلے میں کرتا ہے، جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے۔ پوری قوم کے جرگے میں اپنے ذیلی قبیلے کی نمائندگی کرتا ہے۔

سردار

تومان اصل میں چنگیز خان کی فوجوں میں دس ہزار افراد پہ مشتمل جنگی گروپ کو کہا جاتا تھا۔ اسی تمن سے تمندار نکلا جو بڑے قبیلے کے سربراہ کو کہا جاتا ہے۔ (تمن اور تمن دار کے الفاظ اب تقریباً گم ہو چکے ہیں)۔

قبائلی ہیرا رکی کی چوٹی پر سردار بیٹھا ہے۔ اس کا ہم سر اور اس کی برابر کرنے والا قبیلے میں کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ وہ قبیلہ پر اپنا اثر اپنے ماتحتوں یعنی وڈیروں کے ذریعے برقرار رکھتا ہے۔

سردار، وڈیروں کے ذریعے نظام حکومت چلاتا ہے۔ سردار ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے سیاسی، ثقافتی اور معاشی اختیارات کے دریا پھوٹتے ہیں۔ وہ اپنی اتھارٹی کو برقرار رکھنا جانتا بھی ہے اور ایسا کرنے کی قوت بھی رکھتا ہے۔ اس لیے اوپر سے نیچے تک ہر ایک ممبر نظام حکومت چلانے میں ماہر ہوتا ہے۔

عمومی طور پر، سردار اپنے فرقے یعنی سردار خیلوں کے علاوہ کسی اور سے رشتہ نہیں کرتے۔ لہذا سردار اپنی بیٹی دوسرے قبیلے کے سردار کو ہی دے گا۔ البتہ وہ عام قبائل حتیٰ کہ غیر بلوچ اور نچلے

ہیں، باہم ہفوخ (سوکئیں)۔ ایسی صورت میں ایک ماں اصلی ہوتی ہے، دوسری ”ماتن“ ہے۔ اسی طرح بہن بھائیوں میں ”ماتیں“ بچے ”جڈ مات“ کہلاتا ہے۔ بھائی ”براث، ادا“ ہوتا ہے اور بہن ”گہار یا ادی“۔ بہن کی اولاد ”گہار زاتک“ کہلاتی ہے۔ ماں کا بھائی ماما اور اس کی بیوی مامی ہوتی ہے۔ ماں کی ماں نانی ہوتی ہے نانی کی ماں ”پر نانی“ اور ماں کی بہن ”ماسی یا ترو“ ہے اور اس کے بچے ”ترو زاتک یا تر نیئر اتک“ ہوتے ہیں۔ باپ کا باپ ڈاڈا ہوتا ہے ڈاڈا کی بیوی ڈاڈی اور ڈاڈا کا باپ پر ڈاڈا، اور باپ کے بھائی نا کو اور بابا ہوتے ہیں۔ تایا اور چچا کے لیے الگ الگ الفاظ نہیں ہوتے۔ باپ کی بہن ”ترو یا پچی“ ہوتی ہے۔ چاچا اور اس کی بیوی چاچی کے بچے ناخوز اتک کہلاتے ہیں۔ اور ناخوز اتک کے بچے ریناخوز اتک۔

مرد کے بھائی (براث) اُس کی ماں باپ کے زینہ بچے ہی ہوتے ہیں مگر عورت کا ایک اضافی بھائی بھی ہوتا ہے جو اس کی ماں شادی کے وقت اُس کے لیے اُس کے خاوند کے خاندان میں سے ایک کو منتخب کرتی ہے۔ اُسے ”وکیلی براث“ کہتے ہیں۔ بھائی کی بیوی ”نشار“ کہلاتی ہے۔ خاوند کے بھائی کی بیوی ”امجرات“ جبکہ اس کی بہنیں ”ڈشکیش“۔ بیٹے کی بیوی بھی نشار ہوتی ہے۔ بیٹے اور بیٹی دونوں کے بچے ”نواسخ“ ہوتے ہیں اور نواسخوں کے بچے ”کواسخ“ ہوتے ہیں اور کو اسخ کے بچے گراسخ۔ ”سُسر“ و ”سُسرک“ کہلاتا ہے اور سُسرک کے بیٹے یعنی خاوند کے بھائی ”وسرک زاتک یا سٹرزاتک“ ہوتے ہیں۔ بیٹی یا بہن کا خاوند ”زامات“ ہوتا ہے۔ دو بہنوں کے خاوند آپس میں ”ہم ذامات“ ہوتے ہیں۔

زینہ زمین، مویشی اور دوسری جائیداد مال میں حصہ دار ہوتا ہے۔ باپ کے دو حصے اور بیٹوں کا ایک ایک حصہ۔ مادہ کا ملکیت و جائیداد میں حصہ نہیں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ خاوند لا ولد مر جائے تو بھی بیوہ کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا اور ساری جائیداد خاوند کے بھائیوں (اور اگر اس کے بھائی بھی نہ ہوں تو) چچروں میں تقسیم ہوتی ہے۔

پیریں مڑد

خاندان کا ایک سفید ریش، بزرگ یا لیڈر ہوتا ہے جسے ”پیریں مڑد“ کہتے ہیں۔

درجے کی لڑکی بیاہ لانے کو کوئی حرج نہیں گردانتے۔

ابھی حال تک سردار کی اپنی جیل ہوا کرتی تھی۔ جہاں قبائلی دستور توڑنے اور سماج دشمن عناصر کو انتہائی وحشیانہ اور غیر انسانی سزائیں دی جاتی تھیں۔ وہاں قیدیوں کو ککڑی کی شہتیر (کاٹ) میں ڈال دیا جاتا تھا۔ قیدی کو اپنے خوراک کا خود بندوبست کرنا ہوتا تھا، یا اسے وہاں کے لوگ خیرات کے بطور کھانا دیتے تھے۔

سردار کا اپنا لیویز کا نظام تھا۔ ان لیویز والوں کو ”سردار کے سوار“ کہا جاتا تھا۔ لیویز والا بہت اختیارات رکھتا تھا۔ اس کے پاس موجود سردار کی مہر لگی چھڑی اُسے ناقابل گرفت بنادیتی تھی۔ وہ صرف احکامات کی تعمیل ہی نہیں کرتا تھا، بلکہ بہت سے احکامات خود سے بھی جاری کرتا تھا۔ یہی سوار قدیم آریہ زمانوں میں جنگوں کے وقت لڑنے والوں میں ہوتا تھا، اور امن کے زمانے میں پولیس مین۔ (3)

بلوچوں کے سرداری نظام کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے سردار کی عزت اور احترام بہت کرتے ہیں، عقیدت کی حد تک۔ یہ مستقل اور بے انداز احترام محض سیاسی و سماجی وجوہات سے نہیں ہوتا اور نہ ہی سردار کے جاہ و جلال و اقتدار و کرسی کی وجہ سے اسے نصیب ہوتا ہے بلکہ یہ احترام روحانی ہوتا ہے۔ قبائل کے نزدیک سردار اللہ کا برگزیدہ اور پسندیدہ شخص ہے، تبھی تو اسے اتنی طاقت عطا کر دی گئی ہے۔ بلوچ اپنے سردار کے ولی اور باکرامت ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور قلب کی اتھاہ گہرائی سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ سردار کی حکم عدولی اور دل شکنی، نقصان پہنچاتی ہے۔ سردار کو غائبانہ طور پر بھی کچھ کہا یا محض اس کا برا سوچا بھی ہو تو عزرائیل آ کر مویشی کو کسی بیماری کے بہانے مار جاتا ہے، یا ہوا یا بارش فصل کو تباہ کر سکتی ہیں۔ اولاد کو پولیو دیوبوچ لیتا ہے، یا مرگی کا مرض بیوی کو چپک سکتا ہے اور بد بختی اولاد کے حصے میں لکھی جاتی ہے۔ قبائل کے پاس سیکڑوں ایسی مثالیں، ایسی حکایتیں ہیں، جن میں سردار کے خلاف سوچنے والے کو قدرت کی طرف سے مندرجہ بالا عبرت ناک سزاؤں میں سے کوئی مل چکی ہے۔ یہی مثالیں، یہی حکایتیں، سرداری نظام کو نظریاتی بقا بخشی ہیں۔

بلوچ رواج میں سردار یا اس کے خاندان کے کسی فرد کا خون بہا عام آدمی کے خون بہا سے چار گنا زیادہ ہے۔ وڈیرہ کا عام آدمی سے تین گنا۔ پیرسن نے کچھلی صدی میں مری قبیلے میں مروج خون بہا کے نرخ کو یوں بیان کیا:

سردار یا کوئی بھاولاں زئی..... 8000 روپے

وڈیرہ..... 4000 سے لے کر 7000 روپے تک

عام مری..... 2000 روپے (4)

بلوچوں میں سردار کا مقام بہت اونچا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ سردار موروثی نہ تھا بلکہ قبیلے کا سب سے اچھا آدمی ہوتا تھا جس میں بلوچیت کی تمام خوبیاں موجود ہوتیں۔ سردار قبیلے کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا۔ ایک بلوچ شاعر نے کہا تھا:

آں	مژد	کہ	راجانی	سزنت
لونغ	کارنش	آنی	بہنت	
فیضان	ہزار	قوم	اش	گرنٹ

ترجمہ:

وہ اشخاص جو قوموں کے سربراہ ہیں

ان کے گھر معدنی خزانے کی طرح ہیں، بیٹھے چشمے کی مانند ہیں

ہزاروں لوگ ان سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے تو وہ عوام الناس کی توجہ اور تعریف و توصیف کا مرکز تھے۔ لفظ ”سردار“ درآمد شدہ لفظ ہے جو کہ نصیر خان اول کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل بلوچ عوام سردار کے بجائے لفظ ”میر“ استعمال کرتے تھے۔ (5)

واضح رہے کہ یہ سارا کام نجی ملکیت کے وجود میں آنے کے بہت بعد شروع ہوا۔ پہلے تو لوگوں کا اجتماع ہی سردار کو منتخب کرتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بہادر ہو، مہم جو ہو، پر عزم ہو، سخی اور فیاض ہو۔

گزرے۔ ایک نے کہا: ”ساتھیو، میرے کپڑے بہت میلے ہو گئے ہیں۔ میں اس عورت سے اپنے کپڑے دھواؤں گا۔ یہ چار درویش دراصل ”چہاریار“ تھے۔ ایک شہباز قلندر تھا۔ ایک غوث بہاء الحق تھا۔ ایک کا نام شیر شاہ سید جلال تھا اور ایک کا نام شیخ فرید تھا۔

”خاتون نے اس کے کپڑے دھو دیے۔ درویش نے گڑ کا ایک ٹکڑا عورت کو دیا کہ اپنی بیٹی کو کھلا دے وہ اسے کھا کر لٹی کر دے گی۔ قے میں ایک بیٹا بھی ہوگا۔ وہ تم لوگوں کے لیے سات پشت تک بادشاہی لائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ لڑکی نے قے میں ایک بیٹا اگل دیا۔ عورت نے گڑ کی ٹہنیاں کاٹ کر بچہ دیں اور بچے کو ان پر رکھ دیا اور روتی ہوئی بھاگ کر شوہر کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ ہم تباہ اور بدنام ہو گئے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ شوہر نے کہا ”نہیں، جا کر اسے لائیں گے۔“ جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ گڑ کے درخت کے نیچے بچہ لیٹا ہوا ہے۔ اسکی ٹہنیوں سے دودھ ٹپک ٹپک کر نیچے کے منہ میں گر رہا ہے۔ (یوں گڑ کا درخت اُس بچے کو اپنا دودھ پلا رہا تھا)۔ اسی ”گڑ“ سے گزینی بنا۔ اور انہی کی سرداری ہے مری قبیلے پر سات پشتوں سے۔ درویش نے کہا تھا کہ جب بیٹا ہو تو ہر سال ایک اونٹ کی قربانی دو۔ اب بھی باولہاں زئی ہر سال ایک اونٹ غوث بہاء الحق کو دیتے ہیں۔“

مزاری سردار حادثاتی طور پر شیر کا پیشاب پینے سے پیدا ہوا۔ کسی کا خاندان آگ، سورج یا چاند سے پیدا ہوا۔ یا وہ سیدھا سیدھا آسمان سے اچانک زمین پر نمودار ہوا۔ بہر حال ظاہر یہ کرنا تھا کہ وہ خدا کا محبوب بندہ ہے اور یہ سرداری یا پیری اسے خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اس تصور کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ لوگوں میں اس کی عظمت کا قصہ پھیل جائے، خود وہ اور اس کے خاندان کی حیثیت مضبوط ہو جائے تاکہ سماج کا کوئی فرد ان کے خلاف کسی بھی قسم کی بغاوت کا خیال بھی نہ لاسکے اور نہ کسی دوسرے کو حکمرانی کی خواہش پیدا ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس خاندان کی عظمت، دھاک اور کرامت لوگوں کے دلوں میں تختی کے ساتھ جاگزیں ہوتی ہے اور ”ان کے خاندان کے خلاف کسی قسم کی بغاوت ایک گناہ عظیم تصور ہوتی ہے۔“ (7)۔

سردار سے متعلق دوسری رسومات بھی مذہبی یا روحانی تقدس میں لپٹی ہوتی ہیں۔

بلوچ قبائل میں رفتہ رفتہ سرداریت ایک موروثی عہدہ بن گئی۔ بالخصوص انگریز کے آنے کے بعد۔ یعنی سردار کی موت پر اس کا بڑا بیٹا اس کا وارث بن جاتا ہے، لیکن اگر وہ ماں کی طرف سے بلوچ کے سماجی حیثیت کی برابری والی عورت نہ ہو تو اس کے انتخاب کا سوال اچھا خاصا متنازعہ ہو جاتا ہے۔ (6)

جیسا کہ بتایا گیا کہ عوام اپنے سردار کو زبردست عزت و توقیف بخشتے تھے۔ اور اس کے نسب کے بارے میں اعلیٰ ارفع روایتیں بناتے ہیں۔ ہر قبیلے کے سردار کے حسب نسب میں آپ کو کہیں نہ کہیں مافوق الفطرت اور معجزاتی باتیں ضرور ملیں گی۔ مثلاً مری قبیلے کا سردار، گزینی کے ذیلی فرقے سے ہے۔ اب یہاں عوام الناس خوبصورت انداز میں گزینی کو پیش کرتے ہیں۔ وہ گزینی کے شجرہ کو میر جلال خان کے نواسے ”گزین“ تک لے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گزین بلیدی تھا جس کا باپ آکر بجار کا ”باہوٹ“ ہو گیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ گور گہو تھا۔ میں نے جب معمر، محمد خان پیر دادا نریں سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے جو آٹھ روایت بیان کی، اس سے قارئین کو مخطوط کرنا بہت ضروری ہے:

”گزین کے باپ کا ایک ریوڑ تھا۔ اس نے بجار سے پوچھا کہ تم مجھے کہاں تک پناہ میں رکھ سکتے ہو؟ بجار نے کہا میں تمہیں ماوند تک سفید، مورانی، گواٹانی، بجاروڈ اور کاہان تک پناہ میں رکھ سکتا ہوں۔ تم اپنا ریوڑ چراؤ، تمہارے حقوق سلب کرنے نہیں دوں گا۔ تب وہ شخص بجار کے ساتھ ہمساخ (پناہ گزین) کے بطور رہنے لگا۔ کاہان میں درندے بہت ہوا کرتے تھے۔ گڑ کے درختوں کے بڑے بڑے جنگل تھے۔ جن میں گور پٹ نامی درندے ہوتے تھے۔ چیتے اور شیر بھی، جو انسانوں سے لڑتے تھے۔ کاہان میں لوگ جنگل میں مویشی نہیں چراتے تھے بلکہ پہاڑیوں میں لے جاتے تھے۔

”ایک ڈور (جوہڑ) میں پانی تھا۔ اُس شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ ہمارے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ تم جا کر انہیں دھو ڈالو، میں وہاں آ کر مویشی چراتا ہوں تمہاری نگہبانی بھی کروں گا۔ ورنہ درندے کھا جائیں گے۔ وہ جب کپڑے دھو رہی تھی تو وہاں سے چار عظیم درویش

کوئٹہ 1999ء - صفحہ 34

6۔ مبارک علی۔ بازار اور دوسرے مضامین۔ 1988ء۔ نگارشات لاہور۔ صفحہ 64

7۔ ارباب، محمد جہانگیر ”میرٹیل رول پیٹرنز ان مسلم سوسائٹی۔ پاکستان سٹڈیز، ریسرچ جرنل یونیورسٹی آف

بلوچستان۔ 1990ء۔ جلد نمبر 1۔ صفحہ 71

8۔ بگٹی، عزیز۔ بگٹی قبیلہ۔ 2005ء۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ نمبر 101

9۔ لیون، انا تول۔ Pakistan, A Hard Country۔ 2011ء۔ پنگوئن۔ صفحہ 39

مثلاً بلکٹیوں میں نئے سردار کے سر پر دستار کا پہلا پیچ پیر سہری کے مزار کا مجاور (جسے سردار پیر وزانی وڈیرہ کی مشاورت سے مقرر کرتا ہے) باندھتا ہے۔ دوسرا پیچ سخی سرور کے دربار کا مجاور، بشرطیکہ وہ اس موقع پر ڈیرہ بگٹی میں موجود ہو، باندھتا ہے۔ اس کے بعد سردار کے خاندان کے بزرگ شخص کی باری آتی ہے۔ اور پھر راہبچہ کی ذیلی شاخوں کرمانزی، سوہمازی، مندوانزی، اور قاسمانزی وڈیرے دستار بندی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس کے بعد قبیلے کی شاخوں کے وڈیرے مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ بیعت کے بطور اس کی دستار بندی کرتے ہیں؛ لپر، مسوری، پیر وزانی، نوٹانزی، شمبانزی، موندرانزی، نوٹانزی، کیا زئی، سیدانزی، ہندو، مریہ۔ (8) آپ اندازہ کریں کہ اگر پیر سہری کے مزار کا مجاور موجود نہ ہو تو دستار بندی ملتوی کی جاتی ہے۔

بلوچوں میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ سردار کا گھرانہ تقریباً ہر قبیلہ میں تعداد اور قوت دونوں اعتبار سے نسبتاً کمزور ہوتا ہے۔ مری کا بادلہا زئی، مکران کا گچکی، خاران میں نوشیروانی سب پر یہ دلچسپ کلیہ لاگو ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ رئیسانی، زکر زئی، مینگل، رند، بگٹی حتیٰ کہ خود بلوچوں کا مشترکہ خان، تعداد میں چھوٹے سے قبائلی فرقوں سے ہیں۔

المختصر، بلوچستان میں قبیلہ کا مطلب ہے، چیف کے تحت مضبوطی سے گرہ دیا ہوا

گروپ۔ (9)

حوالہ جات

1۔ ایماڈلن۔ صفحہ 136

2۔ عطائی، ابراہیم۔ ڈکشنری۔ صفحہ 9

3۔ بیہرن۔ صفحہ 71

4۔ مزاری، شیر باز۔ A Journey to disillusionment آکسفورڈ یونیورسٹی پریس xxxi

5۔ بزنجو، غوث بخش۔ تحریک آزادی کا ایک باب۔ طاہر بزنجو کی کتاب ”بابائے بلوچستان“ سیلز اینڈ سروسز

3- قبائلی اور علاقائی اتحادیے

قبائل کی ساخت میں شکست و ریخت صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ کوئی بھی بلوچ قبیلہ ایسا نہیں ملے گا جس کا کوئی حصہ نکل کر کسی دوسرے قبیلے میں شامل نہ ہوا ہو۔ یا کسی اور قبیلے کا کوئی ٹکڑا اُس میں آکر نہ ملا ہو۔ ہر ٹکڑا، باہر سے آنے والے ایک یا ایک سے زیادہ امیگرٹس کے آن شامل ہونے سے تشکیل پاتا رہا ہے۔ اور ان کا اتحاد یہ مشترکہ دکھ سکھ اور مشترکہ ”شادی غم“ کے فلسفے سے جنم لیتا ہے۔ ”شجرہ والے“ ”اصلی“ گروہ اور نئے آنے والے گروپ باہم جذب ہو جاتے ہیں اور مشترکہ دکھوں سے نمٹتے ہوئے، اور اسی طرح مشترکہ مسرتوں سے مسرور ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک بھائی چارے والی فضا تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ایک آدھ دن کا پراسیس نہیں ہوتا۔ اس میں ساہا سال لگتے رہے ہیں۔ گوکہ بلوچوں کے قبیلوں میں ہر فرقہ خود کو اعلیٰ و ارفع، اصلی بلوچ اور بہت ہی مقتدر ماضی کا حامل جتنا ہے مگر اصل میں کوئی کسی سے، کسی صورت افضل نہیں ہے۔ سارے قبائل کی تشکیل اسی ”شادی غم“ کے پراسیس میں ہوئی ہے۔ یہ بات بھی تفصیل کے ساتھ پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے کہ ٹکڑے کے اسی مرکز پر نئے آنے والوں اور ”ہمسایہ“ کو اپنے میں جگہ دی، انہیں چراگا ہوں تک رسائی بخشی اور دکھ سکھ میں شریک ہونے والے ان نوآمدہ لوگوں کو علاقے بخش دیے اور وہ رفتہ رفتہ اسی قبیلے کا ایک فرقہ اور اس طرح مکمل اور سند یافتہ، معزز و محترم بلوچ بن گئے۔ اللہ ہمیشہ بلوچوں کو معزز و محترم رکھے۔

سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قبیلوی اتحاد ختم ہو جانے کا پراسیس بھی چلتا رہا، ایک اور بلند و اعلیٰ تنظیم کی تشکیل کرنے۔ اس قبیلوی اتحاد نے ختم ہو کر جس نئی تنظیم کی تشکیل کی وہ ہے، علاقائی اتحاد۔ دوسری بڑی تبدیلی یہ آئی کہ سرداروں کے سیاسی اور اقتصادی اقتدار کے مضبوط ہو جانے سے فیوڈل رشتے مضبوط تر ہوتے گئے۔ فیوڈل کی زمینیں، اس کی چراگاہیں اور اس کے مویشی بڑھتے چلے گئے۔ ان کی معاشی قوت کے بڑھ جانے سے اچھی زمینوں پر قبضہ کرنے کی اس کی اہلیت بھی بڑھتی گئی۔ پھر موروثی حکمرانی نے تو اس کو مطلق قوت بنا ڈالا۔

قبائل کی اس دائمی شکست و ریخت کے عام انسانی اسباب بھی ہیں۔ مگر بلوچ کے ہاں کے اس مظہر کی وضاحت بھوک کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی ہو سکتی ہے؛ وہ ہے قبائلی جنگیں۔ یہاں دائمی جنگ و جنگی حالت یعنی یورش و حملہ نے کسی بھی قبیلے کو سابقہ قبیلے کی حالت میں رہنے نہ دیا تھا۔ جنگیں انسانی حیات کا دشمن ہوتی ہیں۔ حیات انسانی کے اس دشمن کے سبب قبیلہ روز بروز کمزور ہوتا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے افراد کو اپنے اندر بخوشی قبول کر لیا کرتا تھا۔ یہ گنجائش ہی نہ تھی کہ نوآمدہ کی نسل اور رنگ کے بارے میں سوچا جاتا۔ اس لیے کہ تفریق کے یہ پیمانے تو پر امن حالات کی بد بخت خصوصیت ہوتی ہیں۔ اُس زمانے میں جنگیں ہی جنگیں تھیں۔ کوئی یہ منحوس سوال نہیں کر سکتا تھا کہ تمہارا باپ کون ہے؟ بھائی کون ہے؟ کونسی زبان بولتے ہو؟ اور لباس کس طرح کا پہنتے ہو؟ ہر وہ شخص اپنا ہوتا تھا جو قبیلے کے سودوزیاں کا شریک بنتا۔ ہر نوآمدہ شخص لشکر میں جاملے، قبیلے کی جنگ میں حصہ لیا، فتح پائی، غنیمت بانٹا، اور پھر دوبارہ تلاش معاش کے لیے ایک اور قبائلی جنگ کے لیے روانگی ہوئی۔ اب اس سارے عمل میں شناختی کارڈ کی ضرورت کہاں تھی۔ اور اس کے لیے فارم ”اے“ اور ”بی“ پر کرنے کی فرصت کہاں تھی؟ انہی جنگی بحرانوں میں مختلف نسلوں، اور زبانوں کے لوگ دوسرے قبائل میں آن ملتے رہے اور قبیلے میں جذب ہوتے رہے۔ یہاں شادی بیاہ اور رشتہ داریاں کرتے رہے اور بلا آخر قبائلی مشترکہ زمین اور چراگاہ کا حصہ دار بن کر ہر طرح کی قبائلی ذمہ داریوں کے شریک اور مالک بن گئے۔ (1)

ہم اصل نقل کے چکر میں نہیں پڑیں گے اس لیے کہ یہ عمل ایک اور قسم کے شاؤنزم کو جنم دینے کا موجب بنے گا۔ ہر وہ شخص ”اصلی“ اور ”سچا“ بلوچ ہے جو پیداواری عمل میں حصہ لیتا ہے۔ باقی پیمانے تو بس فکری کج روی کے لیے بنائے گئے ہیں۔ مگر اس فکری منافقت کو دور کرنا ہی تو ضروری کام ہے۔ جس کے تحت ”صاف خون“، ”صاف نسل“، اور ”صاف قوم“ کی بے بنیاد تھیوری گھڑ لی گئی ہے اور جس کی آڑ میں نسلی منافرت اور فرقہ واریت کے جھگڑوں میں الجھا کر لوگوں کو ان کی طبقاتی قومی جدوجہد سے دور کر لیا جاتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کر دایک مقتدر قبیلہ ہے مگر مزاری بلوچوں میں بھی ایک ذیلی شاخ

بہت سے بلوچ اور ہندی آریائی عناصر سے مل کر بنا ہے۔

یہ سب مخلوط اور مختلف القبا ئلی گروہ مری نامی بلوچ اتحاد یہ میں شامل ہوتے گئے اور آج ”مری“ کے مشترکہ ٹائٹل تلے زندگانی گزار رہے ہیں۔ (5) مری قبیلے کے ایک بزرگ اور تاریخ دان جناب محمد خان پیردادانی کا بیان ہے کہ اس کے قبیلے پیردادانی میں ایک قبیلہ ہے کمرانی، جو کچھ سے آیا ہے۔ جروار مری دراصل لیغاری تھے۔ کچ کا درکانی دراصل گورستانی ہے جو کوہ سلیمان سے مری میں درآیا اور اب بھارانی میں شامل ہیں اور قلندرانی کے ساتھ ان کا سودو زیاں مشترک ہے۔ مری کا لانگھانی فرقہ ہندی نژاد ہے اور ملتان سے آیا ہے جو ایک زمانے میں سہی کے حاکم تھے۔ مری قبیلے کا شاہچہ اور ہندی قبیلہ شاہوجہ کئی علما کی نظر میں ایک ہی ہیں۔ (6) 19 ویں صدی کی ساتویں دہائی میں مری کے صرف 22 ٹکڑے (ذیلی فرقے) تھے۔ وہی مری 20 ویں صدی کے شروع میں 35 ٹکڑے تک بڑھ گیا۔ (7)

حسینی بلوچوں نے شاذبھان مری سے شکست کھا کر کھیتراں کے ہاں پناہ لی اور اب اس کے اتحاد یہ کا حصہ ہیں۔ (8) کھیتراں ان کا ایک حصہ ناٹھ ہے جو شکل و صورت اور تاریخی لحاظ سے باہر سے آئے ہیں۔

بگٹی قبیلہ بھی بعد میں بتدریج دوسرے بلوچ، حتیٰ کہ غیر بلوچ قبیلوں کے مہاجروں یا پورے کے پورے گروہوں (مثلاً ڈومکی قبیلہ کے چاکرانی گروہ) کے جذب ہو جانے سے وسعت پا گیا۔ ممتاز محقق اکبر الیس احمد کے مطابق مسوری خالص ہندی نسل سے متعلق ہیں۔ (9) اس کی اس بات سے مکمل طور پر تو اتفاق نہیں کیا جاسکتا مگر یہ بات صحیح ہے کہ ان کا ایک حصہ ہندی نسل کا ضرور ہے۔ پیروانی قبیلہ کو بگٹی کے دیگر فرقے یعنی شلوانی، راہچہ اور نوٹانی سے علیحدہ شدہ چھوٹے گروہ تشکیل کرتے ہیں۔ شلمانی بگٹی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل گسی قبیلے سے آئے ہیں۔

ڈومکی کے اندر ہندی مہاجروں کی بڑی تعداد شامل ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ اس قبیلے کے زیادہ فرقوں کے نام ہندی ہیں۔ مثلاً بھانڈ، براہمانی وغیرہ۔ ڈومکی نے کھیری کو سندھ میں دھکیل کر اور اس کے باقی ماندہ لوگوں کو اپنے اندر جذب کر کے ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جکھرا نی جو

اسی نام سے موجود ہے۔ (2) اسی طرح بلیدی قبیلہ کی ایک شاخ ”کوش“ ہوا کرتی تھی۔ رند و لاشار لڑائی میں اس شاخ نے بہادری کے اعلیٰ مظاہرے کیے تھے اور بے جگری سے لڑنے کے جوہر دکھائے۔ چاکرانی ان ”گوشوں“ کو اس کے صلہ میں کچھ اراضیات اور دریائے ناڑی کے کالے پانی کا تیسرا حصہ بطور انعام بخش دیا جو آج تک ان کے تصرف میں ہے۔ ”گوش“ اب بلیدی کی بجائے ٹچک قبیلے کا حصہ ہیں۔ (3)

مری جو دراصل بھارانی تھا۔ گزینی اور لوہارانی کے آن ملنے سے عظیم الشان قبیلہ بنا۔ خود بھارانی میں باہر سے آنے والے اور چنانچہ اسے مضبوط بنانے والے عظیم قبیلوں میں سے رامکانی، کلوانی، اور شاہچہ آئے۔ عظیم پوادی قبیلہ کوہ سلیمان سے نعمت بن کر آیا۔ اور حالیہ زمانوں میں قیصرانی بھی کوہ سلیمان کی وسعتیں سمیٹ کر مری میں آن بے۔ چانڈھے بعد میں آکر اس اتحاد یہ میں شامل ہو گئے۔ جادا خان اور ولیل سالارانی نے اپنے قبیلے میں نوآمدہ لوگوں کے بارے میں مجھے بتایا کہ ان کے قبیلے ”سالارانی میں مزاری بلوچوں سے بابیانی آن کر شامل ہو گئے۔ موسیٰ زئی بھی نوآمدہ ہیں۔ شیرخان زئی علاقہ باڈور سے سالارانی کا حصہ بنے ہیں۔ سیلاچی، حسینی بلوچوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ رندھاں زئی بھی بعد میں سالارانی کا حصہ بنے، بیانی لوگ و نرپچی پٹھانوں میں سے آکر سالارانی، مری اور بلوچ بن گئے“، ننگرانی مری میں دو ذیلی فرقے ہیں۔ جن کے نام بزدار اور کھوسہ ہیں، جبکہ انہی دو ناموں سے بلوچوں کے الگ الگ بڑے بڑے تہمن بھی موجود ہیں۔ سومرانی مری میں گوانہرام زئی اور سومرا زئی باہر سے آکر شامل ہوئے۔ قلندرانی مری میں ڈانگیا نی، گریانی، شیلچی، محبتانی، مصری زئی، ملگوار زئی اور میاں خان زئی بعد میں آکر شامل ہوئے۔ شیرانی، ژوب کے پشتون بھی ہیں اور مری کا ایک معزز قبیلہ بھی ہے۔ خراسان کے بلوچ آکر مری میں بڈانی بن گئے ہیں۔ یہی بڈانی ڈیرہ غازی خان میں ایک الگ قبیلہ بھی تشکیل کرتے ہیں۔ مری کے مزارانی میں بہت سارے کھیتراں عناصر شامل ہیں۔ (4)۔ ژنگ بھی بعد میں مری میں شامل ہوئے۔ پیکولین بتاتا ہے کہ میہکانی مری دراصل زرکون ہیں۔ اسی طرح حسینی نے مری قبیلے کو بے شمار لوگ عطا کیے۔ حسینی بلوچ کوہ سلیمان کے جنوبی دامن میں آباد تھے۔ یہ قبیلہ خود بھی

حوالہ جات

- 1- گورڈن، ٹی ہاؤلز۔ دی پیپل آف ایشیا۔ 1977۔ ویڈن فیلڈ اینڈ نکلسن، لندن۔ صفحہ 154
- 2- لاشاری۔ مظہر علی خان۔ بلوچ تاریخ کے آئینے میں۔ 2001۔
- علم و عرفان پبلشرز لاہور۔ صفحہ 30
- 3- ایضاً صفحہ نمبر 69
- 4- پیکولین۔ صفحہ 186
- 5- گنگو فسکی۔ پاکستانی قومیتیں۔ صفحہ 156
- 6- اکبر الیس احمد۔ در کتاب Marginality And Modernity۔ صفحہ 56
- 7- پیکولین۔ صفحہ 188
- 8- لیغاری، عبدالقادر۔ تاریخ ڈیرہ غازیخان۔ جلد دوم۔ صفحہ 11
- 9- اکبر الیس احمد۔ Trail by صفحہ 56
- 10- پیکولین۔ صفحہ 72
- 11- پیکولین۔ صفحہ 74
- 12- بزنجو، غوث بخش۔ تحریک آزادی کا ایک باب۔ طاہر بزنجو کی کتاب ”بابائے بلوچستان“ سلیز اینڈ سرورسز کوئٹہ 1999۔ صفحہ 35

آج ایک خود مختار، نامور بلوچ قبیلہ ہے۔ خود ابھی 1845 میں ڈومبکی قبیلہ سے جدا ہو گیا۔ (10)

اب ذرا مگسی قبیلہ کو دیکھئے۔ اس قبیلے میں چھوٹے فرقوں کی تعداد انیسویں صدی کے شروع میں پٹنگر نے پندرہ بتائی تھی جو اسی صدی کے آخر میں بڑھ کر 55 بن گئی۔ معلوم نہیں کتنے کتنے لوگ آن کر اس میں شامل ہوتے گئے۔

لیغاری خود ایک بہت بڑا قبیلہ ہے۔ مگر تالپور کا نام لیغاری سے زیادہ مشہور اور معروف ہے۔ حالانکہ یہی تالپور، لیغاری قبیلہ کی محض ایک شاخ ہے۔ یہی تالپور انگریز سے قبل پچاس برس تک سندھ پر حکومت کرتے رہے۔ (11) اسی طرح آلیانی بھی لیغاریوں کا ایک ذیلی قبیلہ ہے اور اسی نام سے مری قبیلہ کا ایک فرقہ بھی موجود ہے۔ جروار مری میں بھی ایک فرقہ ہے اور کھوسہ کی ایک شاخ بھی۔ عیشانی کھیتراں بھی ہیں اور کھوسے بھی۔ جبکانی ایک الگ قبیلہ بھی ہے اور گورثانی کا ذیلی فرقہ بھی۔ لاشاری ایک الگ تہن بھی ہے۔ اور گورثانی کی ذیلی شاخ بھی۔

بزنجو قبیلہ جو مقامی طور پر ”بینجو“ کہلاتا ہے دراصل چار قبیلوں کا وفاق ہے؛ حملہاڑی، تھراڑی، عومراڑی (عومراڑی ایک الگ قبیلہ بھی ہے پٹ فیڈر میں) اور سیاہ پاد (سیاہ پاد خاران میں ایک الگ قبیلہ ہے)۔ (12)

ان سارے دلائل سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی قبیلہ، کوئی شاخ ”اصلی“ تھے وڈا، اور ”خالص و سچا“ نہیں ہے اور نہ ہی ہم بلوچ، یا بلوچوں کے قبیلے، یا قبیلوں کے فرقے محض ایک فرد واحد کی اولاد ہیں۔ بلکہ ہم دیگر زندہ انسانی سماجوں کی طرح بہت سے عناصر اپنے اندر جذب کرتے رہے ہیں اور دوسروں کی ساخت میں بھی شامل ہوتے رہے ہیں۔

چنانچہ تمام بلوچ اور غیر بلوچ قبیلے دوسرے افراد کو شامل کرتے رہنے کی آسان شرائط کی بدولت پچھلے سو ڈیڑھ سو برسوں میں اپنی تعداد بہت بڑھا چکے۔

4۔ بلوچ قبائلی جنگی معیشت

رواج کو استحکام و دوام بخشنے کے لیے بہت ساری مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ایک دفعہ مری کا لشکر مال لوٹنے کی خاطر جنگ میں گیا تو ان کا مشہور جنگجو کمانڈر دلیل ساتھ نہ تھا۔ وہ دلیل جو صرف اپنی بہادری اور جنگی مہارت کی بدولت غنیمت کا بچک لیتا رہتا تھا۔

ادھر جب قبیلے کے بہادر جنگ میں گئے ہوئے تھے تو دلیل اپنے ساتھیوں سمیت علاقے میں گھوم پھر رہا تھا جہاں اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت کسی قبر کے پاس بیٹھی آہ فریاد کر رہی ہے۔ قبر کافی پرانی تھی اور دلیل کو شک پڑا کہ غالباً یہ قبر نہیں ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اس بڑھیا کا سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ اور پھر جب قبر کھدی تو اس میں خزانہ چھپا ہوا تھا۔ دلیل نے خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ ادھر جب مری لشکر چپاؤ سے واپس لوٹا تو انہوں نے دلیل کو رواج کے مطابق حصہ دینے سے انکار کر دیا۔

دلیل نے کہا ”اچھا، تمہارا حصہ تمہارا، اور میرا حصہ میرا“۔ مری جنگجوؤں کو شک گزارا کہ یقیناً دلیل کے پاس ”آوار“ (غنیمت) ہوگا۔ اس لیے انہوں نے کہا: ”نہیں، ہمارے مال میں آپ کا حصہ ہے اور آپ والی دولت میں ہمارا“۔ چنانچہ دلیل کو اپنا سونا چاندی اس لیے بانٹنا پڑا کہ جنگ میں حاصل کردہ فضول اشیا میں حصہ دار بن سکے۔ بات مال کے قدر کی نہ تھی، بات جنگ میں غنیمت والے مال میں حصہ کے اعزاز کی تھی۔ اس طرح پہلی بار ایک بہادر بلوچ نے جنگ میں شامل نہ ہو کر بھی، اپنا حصہ لے لیا۔ جنگی قوانین میں یہ ایک غیر معمولی ترمیم تھی۔

بلوچوں کے تقریباً ہر قبیلے میں، مری قبیلے کے میہ کا نڑیں فرقے کی طرح، ایک کرامت والا گھرانہ ہوتا ہے جو اپنی روحانی طاقت کے بل پر دشمن کا مقابلہ کرتا تھا اور دشمن کے جادو کو بے اثر کرنے کے علاوہ خود ان پر اپنی کرامت کے ذریعے حاوی ہوتا تھا۔ وہ اپنی کرامت کے ذریعے دشمن کی بندوقیں جام کرتا تھا یا ان کی تلواروں کے ساتھ تیغ بندی کرتا تھا۔ اس لیے اسے بھی حصہ ملتا تھا۔ اس کو جنگ کے میدان سے ہمیشہ دور، ایک تیرکش کے فاصلے پر رکھا جاتا تھا تاکہ وہ خود دشمن کے ہتھیاروں سے بچا رہے۔ اس لیے کہ قبیلے کے روحانی کمانڈر کے زخمی ہونے یا مرنے کی صورت

جنگ بلوچوں کا من پسند مشغلہ بالکل نہیں رہا، یہ مجبوری تھی۔ یہ بد بخت فعل دوسری قوموں کی طرح بلوچوں کی بھی معیشت کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ سر قبیلوی نظام میں شکار کے جانور، اور گھروں میں سدھائے ہوئے جانوروں پہ جنگیں ایک معمول ہوا کرتی تھیں۔ بقول ڈائر ”قبائل در حقیقت لوٹ مار پر گزارہ کرتے ہیں“ (1)۔ اس لیے اُس دور میں سارا تو قیر، سارا احترام جنگ کو حاصل تھا۔ اولیور لکھتے ہیں کہ ”حتیٰ کہ (جنگ کے مقابلے میں) زراعت بھی بچ ہے اور آرٹ و فن کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لکھنے کا فن تو حقارت سے بھی نیچے کا درجہ رکھتا ہے“۔ (2) ویسے بھی انسانی تاریخ میں معیشت کا جو بھی وسیلہ ہوتا ہے، اور روزی دینے والا جو بھی پیشہ ہوتا ہے، وہی ہمیشہ انسان کے لیے احترام کا باعث رہا ہے۔

بلوچ جب مال غنیمت والی جنگوں پر جاتے تھے تو حاصل شدہ سارے مال و متاع کی قیمت لگا کر لڑائی میں شامل افراد میں تقسیم کرتے تھے۔ سارے مال کا پانچواں حصہ یعنی ”چٹک“ جنگ کے کمانڈر (یا پھر سردار) کو دیا جاتا تھا اور بقیہ میں سے جنگ میں شامل ہر فرد کا ایک حصہ، اس جنگ میں شامل لوگوں میں کوئی اگر گھوڑے پر ہوتا تو اس کے گھوڑے کا ایک حصہ اور اگر کسی کے پاس بندوق ہوتی تو نصف حصہ مزید دیا جاتا تھا۔ قبیلہ کی طرف سے جاسوسی کرنے والے (چاری) کو دو حصے دیے جاتے تھے، اس لیے کہ اس کے کام میں رسک بہت تھا۔ (3) اگر وہ جنگ میں مارا جاتا تو اس کا نصف حصہ اس کے رشتہ داروں کے حوالے کیا جاتا تھا۔

لوٹ مار کے سارے مال کی قیمت بیل کی اکائی پر مقرر کی جاتی تھی۔ ایک گھوڑی چار گائیوں کے برابر تصور کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ گھوڑی جنگ میں بہت کارآمد ہوتی تھی جبکہ جنگی ماحول میں گائے تو بہت بے کار اور حقیر جانور ہوتی ہے۔ (4)

چپاؤ (جنگ) میں حصہ نہ لینے والے کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ اُس کے لیے ایک حقیر سا لفظ استعمال کرتے تھے جسے اردو جیسی میدانی زبان میں لکھنا نا مناسب لگتا ہے۔ بلوچ اپنے کوڈیا

میں جادو ٹوٹے اور قبیلے کو شکست ہونے کا خطرہ ہوتا۔

قبیلے کے سردار کو بھی جنگ سے دور رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح دستار بند وڈیرہ اور قبیلے کا قومی شاعر بھی جنگ کی حد سے باہر رکھے جاتے تھے۔ سردار اور وڈیرے جنگی کونسل کا کام دیتے تھے۔ وڈیرہ اپنے سیکشن کا بڑا ہوتا ہے اور اس کا عہدہ موروثی ہوتا ہے۔ اس کا سیکشن اس پہ دستار بندی اسی طرح کرتا ہے جس طرح کہ پورا قبیلہ اکٹھا ہو کر سردار پر دستار بندی کرتا ہے۔ اس لیے وہ ”قبائلی ہیرارکی“ میں اہم عہدیدار ہوتا ہے۔ وڈیرہ کے ساتھ کبھی کبھی ”مقدم“ بھی ہوتا ہے۔ جو اس کے ایگزیکٹو افسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ وڈیرہ کے احکامات ذیلی شاخوں کے معتبروں تک پہنچائے۔ مقدم کا عہدہ موروثی نہیں ہوتا۔ (5)

جنگ کے زمانے میں وڈیرہ کی ڈیوٹی تھی کہ مقرر کردہ فارمولے کے تحت اپنے لوگوں میں سے جنگجو جمع کر کے روانہ کر دے۔ وہی اپنی مہیا کردہ نفری کے لیے پلٹون کمانڈر مقرر کرتا تھا۔ اس طرح قبیلوں کا مکمل طور پر ایک ورکنگ سسٹم اور نیٹ ورک موجود ہوتا تھا۔ فرد سے سفید ریش تک اور سفید ریش سے معتبر اور مقدم تک، مقدم سے وڈیرہ اور پھر سردار تک۔ یہ سارا نیٹ ورک جنگی ماحول اور اس کے تقاضوں کے مطابق بنا ہوا ہے۔ یہی جنگی قبائلی تشکیل آج کے فیوڈل بلوچستان میں اب تک جاری ہے۔ یہ اس قدر مضبوط اور گہری جڑوں والا ہے کہ زرعی اتحاد یہ آج تک اس کا مکمل متبادل نہ بن سکا۔

جنگی قواعد و ضوابط

جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جنگ اور اس کی کوئی کارروائی کبھی اصول و ضوابط سے باہر نہیں ہو سکتی تھی۔ چونکہ بلوچ جنگ کا اسپیشلسٹ ہے اس لیے اس کے جنگی قوانین بہت باریک اور مفصل ہوتے ہیں۔ ہر جنگجو کے لیے لازمی ہے کہ ہمیشہ لڑائی کے اصول و قائدہ کی پابندی کرے، بصورت دیگر وہ بزدل، اور سطحی شخص تصور ہوتا تھا۔ (جو جنگی سیٹ اپ میں خود کشی یا جلا وطنی پر منتج ہوتا تھا)۔

بلوچوں کے جنگی اصول دراصل بہت قدیم عہد سے چلے آ رہے ہیں۔ معقول و روایتی

بلوچ آج بھی بڑی سختی سے ان پر عمل درآمد کرتا ہے۔ مثلاً انفرادی لڑائی میں حملہ آور کے لیے لازمی ہے کہ بہت دور سے دشمن کو لاکار کر خبردار کر دے تاکہ اسے اپنے دفاع کا وقت مل سکے۔ (مگر، آج کے کلاشنکوف، بارودی سرنگ، راکٹ لانچر اور میزائل نے اس اصول کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے)۔ اسی طرح لڑائی میں کوئی بھی ناجائز طریقہ اختیار کرنا برا فعل تصور ہوتا ہے۔ لڑائی میں آخر تک راست بازی سے کام لینا لازمی ہوتا ہے۔ زہر آلود تیر اور چھپائے ہوئے اسلحہ کا استعمال منع تھا۔ اسی طرح مہمان کو، سوئے ہوئے آدمی کو، قیدی کو، اور پناہ میں آئے ہوئے شخص کو قتل کرنا سخت معیوب کام تصور ہوتا تھا۔ خون کا بدلہ خون ہوتا تھا۔ پناہ میں آئے ہوئے شخص کے تحفظ کے لیے لڑنا حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کر دینا لازمی ہوتا تھا۔ مہمان کے جان و مال کو ہر خطرے سے بچانا اور امانت کی حفاظت حتیٰ ہوتی تھی۔ سوائے سیاہ کاری کے عورت کو قتل کرنا عظیم جرم تصور ہوتا تھا۔ ہندو (مذہبی اقلیت) کو مارنا گویا گناہ کبیرہ تھا۔ شلوار سپنے کی عمر سے کم سن لڑکے کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ پیر کے دربار یا مسجد میں گھس جانے والے شخص کو قتل سے امان ملتی تھی۔ جس نے جوتے ہار بنا کر پہنے ہوں یا جوتا دانٹوں میں پکڑا ہو، اسے بھی قتل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ تھا بلوچی کوڈ۔ جس کی پاس داری ہر قیمت پر کرنا لازمی تھی۔

بلوچی میں دوا لگ الگ اصطلاحیں، جن کی ادائیگی سے مطلب کچھ سے کچھ بنتے ہیں۔ ”پلو بندغ“ طرفداری یا جانبداری کو کہتے ہیں۔ لیکن ”پلوہ بندغ“ بلوچوں میں ایک عمومی جنگی رواج ہوا کرتا تھا۔ زور اور کی تلوار کے سامنے ایک دوسرے کی قمیصوں کے دامنوں کو گرہ دے کر گویا سیسہ پلائی دایوار بنائی جاتی تھی۔ یہ گویا بہادری، اتحاد کی انتہا ہوتی تھی۔ مرنا جینا ایک ساتھ۔

گٹی قبیلے میں ”چیف“ اور مری قبیلے میں ”راہ زن“ انگریزوں کے ہاں ”نائٹ“ کی طرز کے دوا ایسے عہدے تھے جو صرف اور صرف جنگی امور میں اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ جنگی حالت میں سردار کے بعد دوسرا نمبر اسی کا ہوتا تھا۔ سردار کی طرح اس کا ٹائٹل بھی خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ انگریز نے آ کر اس کی اہمیت ختم کر دی۔ اس لیے کہ ایک تو ذرا سا امن بحال ہوا۔ پھر ویسے بھی بارود نے آ کر کئی ادارے تہس نہس کر کے رکھ دیے۔ چونکہ ہندو اور توپ بہت دور سے نشانہ بناتی ہیں

اس لیے اب جنگ اُس طرح عزت و وقار کا ذریعہ نہیں رہی جیسے کہ پہلے تھی۔ اس ایجاد نے شخصی بہادری و شجاعت پر گہری ضرب لگائی۔ (6)

راہزن اور چیف کا عہدہ بہت عرصے تک سردار ہی کی طرح موروثی نہ تھا مگر یہ بھی بہت بعد میں جائیداد کی طرح یہ بھی وارثت میں منتقل ہونے لگا۔ یہ جنگ کے تمام امور کی نگرانی میں سردار کا چہیتا شخص ہوتا تھا۔ وہ ایک راہنما کی حیثیت سے گروہ کی راہنمائی کرتا تھا اور یہ حق بھی رکھتا تھا کہ اگر لڑائی میں شامل افراد میں سے کوئی میدان جنگ سے بھاگ جاتا تو وہ اسے قتل کر دے۔

اگر کسی سردار، راہزن یا وڈیرہ کا بیٹا اپنے باپ کی موت کے وقت کم سن ہو تو اس کی مدد کے لیے قبیلہ کا کوئی معمر یا تجربہ کار شخص مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ شخص اصل سردار یا وڈیرہ کے بالغ ہونے تک اس کے سارے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسطی زمانے میں خان قلات نے ”قومی عدل“ کا اصول نامہ وضع کیا اور بلوچستان کے سارے قبیلوں کے رسم و رواج کو قانونی شکل دے دی۔ (7)

حوالہ جات

1۔ ڈائر، جنرل / گل خان نصیر۔ بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔ 1979۔ نساء ٹریڈرز کوئٹہ۔ صفحہ 60

2۔ اولیور.....Pathan and Baloch Across the Border..... 1890۔ چیپ مین

اینڈ ہال لمیٹڈ۔ لندن۔ صفحہ 27

3۔ بی گزٹیز۔ صفحہ 310

4۔ اولیور..... صفحہ 62

5۔ بی گزٹیز۔ صفحہ 308

6۔ مبارک علی۔ جاگیر داری۔ 1996۔ فکشن ہاؤس لاہور۔ صفحہ 36

7۔ پیکولین۔ صفحہ 156

دوسرا باب

بلوچ مویشی بانی

پانی سے مقامی زراعت ہوتی تھی۔ اُس کے علاوہ پورے خطے میں بڑی بڑی نہریں نہیں تھیں۔ تقریباً ساری کاشتکاری بارش پر ہوتی تھی۔ اسی لیے بلوچ عوام صرف کھیتی باڑی پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں بہر حال مویشی بانی کے عرصے کو وسعت دینی پڑی۔ اپنے وسیع رقبے کی بنا پر آج بھی پاکستان کی 50 فیصد بھیڑیں اور 28 فیصد بکریاں بلوچستان میں پالی جاتی ہیں۔ مویشی بانی چونکہ ایک جگہ پر آباد ہو کر نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے موسموں کے مطابق اور بارشوں کے مختلف جگہوں پر ہونے کے باعث خانہ بدوشی کرتے رہنا بلوچوں پر مسلط ہو گیا۔ (1) جنوب مغربی سطح مرتفع کے تقریباً ایک تہائی مویشی سردیوں کی سہ ماہی میں سب اور کچھ کے میدانوں میں ہجرت کرتے ہیں۔

مویشی بانی ایسا کام ہے جسے بلوچ آٹوینک انداز میں کیے جاتے ہیں۔ قدیم زمانوں سے ہمارے آباؤ اجداد یہ کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور جیسی مویشی بانی وہ کرتے تھے، ہم آج بھی بالکل اسی طرح کی مویشی بانی کرتے ہیں۔ اس بارے میں کسی نئی تخلیق کاری اور تبدیلی کی نہ تو ضرورت محسوس کی گئی اور نہ اس کی گنجائش رکھی گئی۔ اپنی مخصوص جغرافیائی ساخت کی بدولت بلوچستان میں مویشی کی نسل وہی ہے جو آباؤ اجداد کے زمانوں میں ہوا کرتی تھی۔

بلوچ عموماً بھیڑوں کی مالداری کرتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر بکریاں آتی ہیں۔ تیسرے نمبر پر ان کے پاس اونٹ ہیں۔ چوتھے نمبر پر گدھے آتے ہیں جنہیں یہ گھر کی نقل مکانی اور، لکڑی پانی کی بار برداری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد گائیں آتی ہیں۔ گھوڑے رکھنے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ بھینسیں تو بالکل کم پالی جاتی ہیں۔ (3 اگست 1996 کے روزنامہ ”ڈان“ کے مطابق اتنے بڑے بلوچستان میں صرف ایک لاکھ بھینسیں تھیں)۔

بھیڑوں میں مشہور نسلیں ہیں؛ ہرنائی، بیورغ، رخشانی اور بلوچی۔

بیلوں میں مشہور نسل بھاگ ناڑی ہے۔

صوبے میں بھیڑ بکریاں اندرونی صوبائی ضرورت سے زائد ہیں اور ہم ہر سال دو ملین صوبے سے باہر فروخت کرتے ہیں۔ 1986ء کے سینس کے مطابق مری کے ضلع میں بڑے جانوروں کی کل تعداد ایک لاکھ سولہ ہزار تھی۔ بھیڑوں کی سرکاری تعداد چودہ لاکھ دو ہزار تھی اور

اپنی تاریخ کے ایک بہت بڑے حصے میں بلوچ سماج کے فیبرک کا اہم ترین سیل (Cell) بہر حال چرواہا ہی رہا ہے۔ اور یہ دورانیہ ابھی ختم نہ ہوا۔ نوے فیصد اگر زیادہ لگے تو اسی بنائے، ستر بنائے مگر فیصدی کے حساب سے بلاشبہ ساٹھ سے زیادہ تعداد میں بلوچ آج بھی مویشی بانی کرتا ہے۔ صنعتی سبیلہ ہی میں آپ کو اکثریتی آبادی لائیوٹاک سے وابستہ ملے گی۔ فیوڈل نصیر آباد و سبکی و کچھی میں بھی بعینہ یہی حال ہے۔ اور بقیہ بلوچ معاشرہ تو ویسے ہی سر قبیلوی سماج میں رہتا ہے جہاں مویشی بانی واحد ذریعہ معاش ہوتی ہے۔

مویشی بانی میں اصل شخص تو چرواہا ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف محنت کرتا ہے، نہ صرف واضح اکثریت میں ہے بلکہ وہ بلوچ ثقافت، سیاست اور معیشت میں بنیادی تبدیلیوں کے عنصر سے بھرپور طبقہ ہے۔ آئیے ذرا اس چرواہے کی زندگی کو تفصیل سے دیکھیں۔

زمانوں سے بلوچستان میں پانی کی نایابی کے سبب زمینداری کو ترقی ملی۔ پٹ فیڈر تو نسبتاً حالیہ مظہر ہے۔ اُس سے قبل محدود پیمانے پر مقامی گور بند باندھ کر ایک آدھ ٹیوب ویل جتنے

2- بھیڑ پال معیشت میں طبقاتی درجہ بندی

بلوچستان کی بھیڑ پال معیشت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک جگہ تک آباد ہونے نہیں دیتی۔ انسان ہر وقت بال بچوں سمیت چارہ، اور پانی کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ ایک مسلسل خانہ بدوشی کی حالت۔ اس سفر خانہ بدوشی کو بلوچی میں ”لڈو بوڑ“ کہتے ہیں۔

زیادہ بھیڑیں رکھنے والے شخص کو ”بھاگیا“ کہتے ہیں۔ پیہرن کے مطابق یہ ہندی لفظ ”بھاگ“ سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے؛ ”ادھر ادھر بھاگنا“، جہاں بارش ہوئی بھاگیا دوڑ کر وہاں پہنچا“۔ (5) مگر بھاگ سے مراد قسمت اور مقدر بھی ہے۔ یعنی بھاگیا خوش قسمت کو کہتے ہیں۔ سرپلس پیداوار پر پلنے والے لوگ بھاگوان یعنی قسمت والے کہلائے۔ بھاگوان سے بھگوان کا لفظ بنا جس کا مطلب ہے سب سے بڑا قسمت والا اور دوسروں کی قسمیں بنانے والا۔

اندازہ ہے کہ بلوچستان میں بڑے بڑے بھاگیاؤں کے پاس مویشیوں کی تعداد کی آخری حد پانچ ہزار ہے۔ لوگ خود بھی مالدار کرتے ہیں اور چرواہے بھی رکھتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں گھر کے سارے افراد بھیڑوں کی خدمت میں جتے رہتے ہیں۔

پہوال (چرواہے) کی حالت بہت گری ہوئی ہوتی ہے اس لیے کہ اسے معاوضہ بہت ہی کم ملتا ہے مگر کام (اوقات اور شرائط دونوں اعتبار سے) بہت دشوار و مشقت آمیز۔ دوسروں کے مویشی چرانے والے کو ”پہوال“ کہتے ہیں جبکہ اجرت پر دوسروں کی گائیں چرانے والے کو ”گوال“ کہتے ہیں، اونٹ چرانے والا ”جت“ یا گجت کہلاتا ہے۔ ”گلپان“ البتہ گھوڑے چرانے والے کو نہیں بلکہ سردار اور وڈیرہ کے گھوڑے کو زین پہنانے، گھوڑے کو بنانے سنوارنے اور سردار کے خدمتگار کے بطور اصطبل کے علاوہ دیگر سارے کام کرنے والوں کو کہتے ہیں۔ مویشی، گائے اونٹ اور گھوڑوں کا مالک ”بھوتار“ ہوتا ہے۔

پہوال

پہوال تعداد کے لحاظ سے بلوچستان کا سب سے بڑا طبقہ ہے۔ یہ نچلا طبقہ ہے، دکھوں

بکریاں چھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار تھیں۔ (2) 1996 میں چاغی میں چار لاکھ بھیڑیں، دو لاکھ بکریاں، ساڑھے سترہ ہزار نیل گائے، اور ساڑھے تینیس ہزار اونٹ تھے۔ (3) ضلع پشین میں 1996 میں تین لاکھ بھیڑیں، ڈیڑھ لاکھ بکریاں، بیس ہزار بڑی سنگیوں والے جانور، ڈیڑھ ہزار بھینسیں اور تین سو اونٹ تھے۔ (4) پورے بلوچستان میں روزنامہ ”ڈان“ کے اس اعداد و شمار کے تحت 18 ملین بھیڑ بکریاں ہیں۔

1- بھیڑ..... بلوچ کی روزی روٹی

بھیڑ چونکہ بلوچ کی روزی کا وسیلہ ہوتی ہے، روٹی اور کپڑا مہیا کرتی ہے، دکھ درد کی محافظ ہوتی ہے، جرمانہ اور تاوان کا درمان ہوتی ہے، چادر اور چار دیواری کا نگہبان ہوتی ہے اور شادی، لب اور غم کے وقت کی کرنسی ہوتی ہے، اس لیے بھیڑ کو بلوچ معاشرے میں کرامت اور برکت والا سمجھا جاتا ہے اور بختا ور بھی۔ سردار کے سر کی قسم کے بعد ہماری بڑی قسم ہے؛ ”یثانی سریں“ (قسم ہے بھیڑوں کی)۔

یہ عجب ہے کہ انگریز بھیڑ کو احتجاج نہ کرنے والی، غلام اور بے ہمت مخلوق سمجھتے ہیں۔ اسے جتنا مارو پیڑو، گھسیٹو یا زنج کرو، یہ کچھ نہیں کہتی، کوئی فریاد نہیں کرتی۔ بغیر احتجاج اور بے نوائی میں دکھ جھیلی رہے گی۔ اسی لیے انگریز بھیڑ کو بزدلی کی علامت سمجھتے ہیں اور بزدل آدمی کو بھیڑ کی طرح ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ جبکہ بلوچ بھیڑ کو ولی اللہ سمجھتے ہیں۔ بلوچ شاید چیخنا چلانا فریاد کرنا اچھا نہیں سمجھتے۔ اسی لیے وہ بکری کی بالکل بھی عزت نہیں کرتے۔

بھیڑ پال لوگ اپنے مویشی کو ٹولی یا یونٹ کی صورت میں ترتیب دیتے ہیں۔ ہر یونٹ کو ”مُہر“ (ریوڑ) کہتے ہیں۔ ایک مہر میں عموم ساٹھ مویشی ہوتے ہیں۔ بھیڑوں کے مہر کو ”میگو“ کہا جاتا ہے اور بکریوں کے مہر کو ”رمغ“۔ ایک مہر کو ایک شخص سنبھالتا ہے، چراگا ہوں تک چرانے لے جاتا ہے، اس کی سلامتی اور بہبود کا خیال رکھتا ہے۔ اس شخص کو ”پہوال“ کہتے ہیں۔

چیار کوئی والی پہوالی میں مویشی، مالک کی بجائے پہوال کے گھر میں ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اکیلا کام نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر اس کا سارا گھرانہ چار سال تک کل وقتی طور پر مشقت کرتا ہے۔ بڑے جانوروں یعنی گائے بیلوں میں ”چیار کوئی“ کی صورت میں ”گوآل“ کو چار کے بجائے آٹھ سال تک بیل چرانے پڑتے ہیں۔ تب وہ چوتھائی کا حقدار بن سکتا ہے۔ گائے کے نہ بچے کو گوآل ایک سال تک اپنے ہل میں جوت سکتا ہے جس کے بعد بھوتار اسے چیارک پہ تقسیم کرتا ہے۔ چونکہ بڑے جانوروں کے مقابلے میں چھوٹے مویشی زیادہ رکھے جاتے ہیں اس لیے بڑے جانوروں کا ”چیار کوئی“ بھی زیادہ نہیں ہے۔

(ii)۔ سیٹکوئی پہوال

پہوال اور بھوتار کے مابین معاہدہ کی یہ شکل چھوٹے قسم کے مویشی میں بھی موجود ہوتی ہے، اور گائیں اور اونٹنیوں میں بھی۔ یہاں بھوتار اپنے حیوان بہت مہنگے داموں پہوال کو فروخت کرتا ہے۔ مال خریدنے والا اگر اس تقریباً گنی قیمت کا نصف ادا کرے تو وہ مویشی کے آدھے حصے کا حقدار بن جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی جیب سے یعنی خود مویشی سے (پشم یا نر بچے کے فروخت کرنے سے) قیمت کی رقم بھوتار کو دے دیتا ہے تو جس وقت وہ ساری رقم کی ادائیگی مکمل کر پائے اس وقت وہ نصف حصہ کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ یعنی پشم اور نر بچے پہوال کے ہیں۔ وہ انہیں بیچتا جاتا ہے اور پیسہ بھوتار کو دیتا جاتا ہے۔

(iii)۔ نیمغوائی پہوال

گھوڑے، گائیں اور مرغیاں نیمغوائی (نصف نصف۔ نیم نیم) پر دی جاتی ہیں۔ مرغیوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے مگر گھوڑے اور گائیں جب نیمغوائی پر دی جاتی ہیں تو اس میں گوآل قسطوں پر آدھی قیمت ادا کرتا ہے۔ وہ پہلے یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک مقررہ تعداد میں بچے دینے تک وہ مال تقسیم نہیں کریں گے۔ جس وقت آدھی قیمت کی ادائیگی مکمل ہو جائیگی، مال کو نر اور مادہ دونوں صورتوں میں آدھو آدھ کیا جاتا ہے۔

مرغی کا قانون یہ ہے کہ اصل مرغی مالک کی ہوتی ہے اور مرغی کی آل اولاد نصف نصف

میں لپٹا، بے دولت و بے زر، لٹا ہوا، استحصال شدہ طبقہ۔ دُہائی دینا مطلوب نہیں ہے صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ اس طبقے کے ساتھ جو سب سے بڑی زیادتی کی گئی وہ یہ ہے کہ آج تک اس کا طبقاتی وجود تسلیم نہیں کیا گیا۔ ابھی حال ہی تک ہوٹلوں، ہاسٹلوں اور سیکریٹریٹ میں براہمان ہمارے کچھ دانشور، سیاسی لیڈر اور کچھ نظریہ دان یہ واہمہ پھیلاتے رہے ہیں کہ بلوچستان ایک غیر طبقاتی معاشرہ ہے۔ اگر یہ فقرہ سامع میں مزاحمت کا باعث بننا تو فوراً ”کوچرائی“ چھپانے کو اسے اس طرح ترمیم کرتے: ”بلوچستان میں طبقات واضح نہیں ہیں“۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ اُن کے ”آقا“ کے دامن کو تھام لیا جائے اور جس بے درکھڑے میں وہ پھینکنا چاہے ہم واری صدقے جاتے۔ (ہم کن کن میکاویوں، سائیسر ووں اور چانڑکاؤں کی شیطانی چالوں بھری شاہراہ پہ چلتے رہے ہیں !!)۔ ہمارے بھیڑپال اور فیوڈل معاشرہ میں نہ صرف یہ کہ طبقات موجود ہیں بلکہ پہوال اس طبقاتی سماج میں یہاں کا نچلے طبقہ ہے۔ یہ طبقہ پورے نچلے طبقے کا سب سے بڑا حصہ تشکیل کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہوال ایک دوسرے سے بہت دور دور رہتے ہیں، انہیں کسی نے کوئی شعور نہیں دیا ہوتا، کسی نے ان کی سادگی کو علم کی روشنی عطا نہ کی۔ یہ ہمیشہ نقل مکانی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ سیاسی و تنظیمی طور پر سب سے غیر منظم طبقہ ہے۔ اس کے اکٹھے کی اب تک کوئی صورت نہ بن سکی۔ اسے تو اہمات میں رکھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس طبقہ میں کسی قسم کا منظم طبقاتی شعور نہیں پہنچا۔ آئیے دیکھیں کہ پہوال کا طرز معاش، طریق و شرائط کار اور اس کی قسمیں کیا ہیں۔

(i)۔ چیار کوئی پہوال

چیارک بلوچی میں چوتھائی کو کہتے ہیں۔ یہاں بھوتار (مالک) اپنا مال چار سال کے لیے پہوال کو دیتا ہے۔ پہوال چار سال تک یہ مال چراتا ہے اور جب یہ مدت پوری ہوتی ہے تو وہ بھوتار کے ساتھ مویشی بانٹ لیتا ہے۔ یہاں پہوال کا حصہ مادہ بھیڑ بکریوں پر چوتھائی ہے۔ مال کی تعداد خواہ جتنی بڑھے۔ نرا البتہ (دنبہ یا بکرا) ہر سال تقسیم کیا جاتا ہے۔ بھیڑ کے نر بچوں میں پہوال کا حصہ ایک تہائی ہوتا ہے۔ جبکہ بکری کے نر بچوں میں اس کا حصہ نصف ہوتا ہے اور مادہ بھیڑ بکریاں جب چار سال بعد تقسیم ہوتی ہیں تو پہوال کو ایک چوتھائی حصہ مل جاتا ہے۔

بانٹ دی جاتی ہے۔

(iv)۔ کریبہ واری پھوال

(کرائے والا چرواہا)

الف۔ سالانہ کریبہ واری پھوال: یہاں پھوال کو سال تک مال چرانا ہوتا ہے اور معاہدہ کے مطابق اسے ادائیگی مقررہ تعداد میں مویشی کے بچوں کی صورت میں کی جاتی ہے۔

ب۔ ماہانہ کریبہ واری پھوال: یہاں ہر ماہ نقدی کی صورت میں معاوضہ پہ مال چرانا پڑتا ہے۔ یہ معاوضہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ضروریات زندگی کی مہنگائی اور چرواہوں کی بہتیا کی کمی کے تناسب سے عموماً بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ ڈیمانڈ اینڈ سپلائی!!

ج۔ دروڑ کا پھوال: یہاں پھوال کو پورے سال تک مال چرانا پڑتا ہے۔ اسے معاوضہ میں معمولی رقم بھی ملتی ہے، نیز سال کے بعد مویشی کے زبچوں کا تیسرا حصہ بھی۔ اسی طرح وہ مادہ بچوں کا ستار ہواں حصہ، پشم میں چھٹا حصہ، کپڑے کا ایک جوڑا، چپلی کا ایک جوڑا، سر پر لگانے کے لیے سرسوں کے تیل کی ایک بوتل، دو وقت کی روٹی (زیادہ تر روکھی، اور وہ بھی عموماً ستے ترین اناج کی) پاتا ہے۔ اسے ماہانہ تین دن کی چھٹی ملتی ہے۔

ایک بات ٹوٹ کرنے کی ہے کہ مویشی کے چھوٹے بچوں کو انسان کا بچہ ہی چرانے لے جاتا (یا لے جاتی) ہے۔ اگر دو یا تین ”مُہر“ (ریوڑ) ہوں تو عورت بھی مال چراتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے ہاں پھوال مرد بھی ہوتے ہیں، عورت بھی اور نوعمر بچے بھی۔ مڈل کلاس کا ”متبرک“ اور ”پاک“ پردہ موجود نہیں ہے۔ برقع، ابا یہ جسمانی کام نہ کرنے والے ”بابوؤں“ کی بیگمات کے تو اہامات ہیں، محنت کش انسانوں سے اس کا کیا تعلق ہے کہ وہاں تو عصمت، کام کرنے کو سمجھا جاتا ہے۔

پھوال ہمارے علاقے کا نچلا طبقہ ہے۔ خواہ خود انہیں اپنے طبقے کے وجود اور اس کے مسائل کا شعور ہو یا نہیں، یا خواہ سیاست کار اور ان کے ہم زبان دانشور انہیں نچلا، اور خود کو بالائی

طبقہ تسلیم کرتے ہوں یا نہیں، اور خواہ وہ بطور نچلا طبقہ متحد و منظم ہوں نہ ہوں ان کی زندگی میں بہت ساری آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ حتیٰ کہ فارمنگ کا نظام بنا کر ان کے طبقے کو بلند کیا جاسکتا ہے۔ گذشتہ کچھ سالوں میں زراعت میں معمولی سی ترقی ہوئی ہے، مگر پھر بھی مجموعی طور پر مویشی بانی معیشت میں بنیادی وسیلہ ہے۔ اور پھوال اس کا سب سے نچلا حصہ ہے۔

ادھر ادھر وانڈھ میں بکھیر دیے گئے پھوالوں کے پاس جانا، اور دور دور بسیرا کرنے والے پھوالوں کو منظم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ (وانڈھ اس تنہا گھر کا نام ہے جہاں مویشی چرانے کی خاطر پھوال اپنے گھروں سے بہت دور بیابان میں ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ دن کو مویشی چرائی اور شام مویشیوں سمیت اس عارضی گھر میں گزاریں)۔

آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ پھوال صرف چھ گھنٹے ہی کام نہیں کرتا بلکہ وہ رات دن مشقت کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ سوتا بھی ریوڑ کے اندر ہے۔ اسے کسی قسم کے انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اسے نہ تو بل الاؤنس ملتا ہے اور نہ یونیفارم کے لیے رقم۔ وہ نہ تو ہڑتال کر سکتا ہے نہ اسے روزگار کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہے۔ وہ مالکن کے لیے ہر شام لکڑی کا گٹھا بھی جمع کر کے سر پر اٹھا کر لاتا ہے۔ درندوں سے چوروں سے اپنے ریوڑ کی چوکیداری بھی کرتا ہے۔ گم شدہ مویشی کو ڈھونڈنے بھی وہی جاتا ہے اور درندوں کے خلاف ”جبرِ ابندی“ کا دم بھی وہی کرتا ہے۔ مگر بھوکے یا پھر بدعادت انسان (چور) کے جبرے کو کون بند کر سکتا ہے؟ پھوال کو اپنے بھوتار کے مہمان کی خدمت بھی کرنا ہوتی ہے۔ اسے کوئی گزیٹڈ چھٹی نہیں ملتی۔ اس کا کوئی اجلاس اپنے دوسرے پھوال ساتھیوں سے نہیں ہو سکتا۔ نہ عید نہ بڑادین۔ بارش نہ ہوئی تو اُس علاقے کی طرف نقل مکانی کرنا پڑے گی، جہاں گھاس موجود ہو۔ اس صورت میں کھانا پکانا بھی خود کرنا پڑے گا، اوطاق بھی سنبھالنا ہوگا، مسافروں کو روٹی دینی پڑے گی، مال چرانا تو ویسے ہی بھاگ میں لکھا ہے۔ اس عمل کو ”کاشر“ کہتے ہیں۔

پھوال کے یارِ غار دو ہوتے ہیں: اس کا مددگار کتا اور ریوڑ میں سے اس کی سب سے پیاری بھیڑ جسے وہ ”سربر“ کہتا ہے۔

3- اون اور منڈی کا پھندا

پاؤں باندھ کر اسے لٹایا جاتا ہے اور کام شروع۔ ماہر اور اچھا ”لاوا“ کام تیز بھی کرتا ہے اور پشم بھی بڑی خوبصورتی سے اتارتا ہے۔ خاص کر پہوال کی محبوب بھیڑ کی پشت پر تو بہت خوبصورت چوٹی بناتے ہیں۔

لاوا کی خدمت زبردست طور پر کرنا پڑتی ہے وگرنہ ایک تو وہ سارے علاقے میں مالک کی کنجوسی کی شکایت کرتے پھریں گے اور دوسرا اس لیے کہ وہ بلندوزر کے ڈرائیور کی طرح مرغی کھلانے کا ایک الگ گنیر چلاتا ہے اور آلو کھلانے پر اس کا گنیر دوسرا ہوتا ہے۔

بھیڑ بے چاری جب ہرل کے نیچے آتی ہے تو وہ مسکین اتنا confuse ہو جاتی ہے جیسے چھوٹے بچے کو سکول لے جایا جائے۔ پشم اتر جانے کے بعد جب اس کے پاؤں کھول دیے جاتے ہیں تو وہ بھاگ کر اس خوارستانی سے خود کو دور کرتی ہے، نگلی نگی، بد صورت بد صورت، بدلی بدلی سی۔ وہ بہت دیر تک اپنے پشم کی غیر حاضری اور اس تبدیلی کے بارے میں پریشان پریشان گھومتی ہے۔

”لاوا“ کے قریب ایک دو شخص بیٹھ کر اتارے گئے پشم کو گول گول دائرہ نما شکل میں باندھتے جاتے ہیں جسے ”گوڑی“ کہتے ہیں۔ اتارے گئے پشم کو لمبائی میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر پیش کے ایک دو پتے لمبائی میں بچھاتے ہیں، بھیڑ کے فضلے کی ایک دو مٹھی بھر کر اس پر چھڑک دیتے ہیں۔ پھر اس لمبائی میں رکھے گئے پشم کو تہہ کرتے ہیں اور بڑی مہارت سے اس طرح بل دیتے ہیں کہ نہ تو فضلہ گرتا ہے اور نہ ہی پیش کے پتے نظر آتے ہیں۔ انہیں پھر پگڑی کی طرح لپیٹ کر اس کا سرا اسی میں اڑس دیتے ہیں۔ اس طرح گوڑی بن جاتی ہے۔ ایماندار شخص ایک دنی کے پشم سے ایک گوڑی بناتا ہے مگر کھوٹ والا شخص گھپلا بازی کرتے ہوئے اپنی گوڑیوں کی تعداد میں برکت دیتا ہے۔ پیش کا پتہ پشم کو اکٹھا رکھنے اور مضبوطی سے گوڑی کی تشکیل دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے لیکن بھیڑ کا فضلہ ڈالنا اور اس پر پانی چھڑکنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ گوڑی کا وزن بڑھ جائے اور بیوپاری سے پیسہ زیادہ ملے۔

بہر حال دھوپ اور چین لوازمات اور روایات سے بھرے ہوئے ہیں جنہیں بہت عرصے

بھیڑ بکریوں کا پشم سال میں دو بار اتارا جاتا ہے۔ اس حجامت کو ”چین“ کہتے ہیں۔ یہ چونکہ فصل کاٹنے کے مترادف ہوتا ہے اس لیے یہ قرض خواہوں، شادی بیاہ کے اخراجات کرنے اور دیگر لین دین کا موسم ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ کسان اپنی ضروریات زندگی فصل اٹھاتے وقت پوری کرتا ہے۔

چین سے قبل مویشی کو دھو کر صاف کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ جب پشم اتارا جائے تو یہ صاف اور اجلا ہو۔ مویشی کے دھونے کو ”دھوپ“ کہتے ہیں۔ بھوتار کے نزدیکی عزیز اور اقارب اور کام کرنے والے توانا جوان اکٹھے ہو جاتے ہیں اور نزدیک ترین جو ہڑ یا جھیل پر چلے جاتے ہیں۔ مویشی دھونے یعنی ”دھوپ“ کا دن پہلے سے مقرر کیا جاتا ہے اور دھوپ کی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں دن فلاں کے مویشیوں کے ریوڑ کا دھوپ فلاں جگہ پر ہوگا۔ دھوپ کے دن خیرات بھی کی جاتی ہے۔ (ایک یا دو بھیڑیں، حسب توفیق یا مال یا دھوپ کی لوگوں کی تعداد کے مطابق)۔ آدمی دھوپ پہنتے ہیں اور بھیڑ کو بازوؤں میں اٹھاتے ہیں اور پانی میں ڈکی لگواتے ہیں۔ بھیڑ کو بہت زیادہ دھونا نہیں پڑتا۔ محض ہاتھ پھیرنے سے پشم جھاگ ہو جاتا ہے اور خود بخود فوراً اجلا ہو جاتا ہے۔ ایک دو آدمی کھانے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ رواج یہ ہے کہ کوئی مسافر راغبیر راستے سے گزرتے ہوئے اگر گوشت خوری کرنا چاہے تو وہ یہ حق رکھتا ہے کہ ایک بھیڑ کو اٹھائے اور جھیل میں ڈکی دے کر دھو ڈالے۔ اس طرح وہ کھانے کی برابر مقدار کا شریک تصور ہوگا۔ اگر کوئی راغبیر کھانے کا خواہشمند نہ ہو، یا تکلف سے کام لے مگر بھوتار قسم کھا کر اسے کھانے پر مجبور کرے تب بھی اسے رواجاً ایک بھیڑ پکڑ کر دھونا ہوگا (خواہ یہ بھیڑ ابھی دھوپ گئی کیوں نہ ہو) تبھی وہ خوبصورتی سے کھا سکے گا۔

”چین“ کا دن بھی پہلے سے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس لیے علاقے میں بھیڑوں کے پشم اتارنے والے ”لاوا“ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں جبکہ موسم کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے لاوا سے پہلے ہی ٹائم لینا پڑتا ہے۔ لاوا عموماً دو یا تین آدمی ہوتے ہیں جن کے پاس قینچی کی طرح کے تیز بہت لمبے ہتھیار ہوتے ہیں۔ اس قینچی نما اوزار کو ”ہرل“ کہتے ہیں۔ چٹائی پر بھیڑ کے چاروں

4- جلو اور سات

Julav & Saath

نقد پیسہ، روکڑا یا کرنسی بہت ساری مصیبتوں کو دور کرنے والا جادوگر ہے۔ اس کا وزن تو اتنا نہیں ہوتا مگر اس کا اختیار بہت زیادہ ہے۔ نظر آتے ہی لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں احترام میں، چلے تو لوگ کام دھندا چھوڑ کر ارمان سے اسے تکتے ہیں، اگر کم ہو تو زیادہ کرنے کی تگ و دو میں ہوتے ہیں۔ پیسہ..... جب بولتا ہے تو لوگ سنتے ہیں۔

کرنسی یا پیسہ سے پہلے لوگ اپنی اضافی چیزیں دے کر اپنی ضرورت کی چیزیں لے لیتے تھے۔ مثلاً ایک بھیڑ دے کر ایک بوری گندم، ایک لیلا کے بدلے کپڑے کا جوڑا یا ایک مزدور سارا سال کام کر کے آٹھ بھیڑیں لے لیتا تھا۔ پیسہ ایجاد ہونے کے بعد چیزوں کے تبادلے کی بجائے ان کی قیمت مقرر ہونے لگی اور پیسہ پہ اپنی چیزیں فروخت کرنے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کا رواج ہوا۔ اس طرح پیسہ اور سرمایہ اکٹھا کرنے، زیادہ کرنے اور مزید زیادہ کرنے کی طرف ساری توجہ مبذول ہو گئی۔ اس نے دنیا کے اندر ایک نیا تماشا پیدا کر دیا، جسے سرمایہ داری کہتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی تک مکمل طور پر اپنے پرانے معاش سے نکل نہ سکے اور مکمل طور پر اس نئی پیچیدگی میں داخل نہ ہو سکے۔ ہم سرمایہ داری کی عمومی عالمی فضا میں سانس بھی لیتے ہیں اور فیوڈل باقیات کو بھی گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ شہر جو سرمایہ داری کے ارتقا کا ممتاز مظہر، نتیجہ اور سبب ہوتے ہیں، ہم نے اپنے لیے ممنوعہ علاقے قرار دے رکھے ہیں۔ ہم شہروں، سرمایہ اور سرمایہ داری سے بہت دور پہاڑوں میں مولیشی بانی کرتے ہیں۔ جب ہمارا رشن آٹا ختم ہو جاتا ہے اور تن کا لباس بہت خستہ ہو جاتا ہے تو ایک آدھ بکری سینگلوں سے پکڑ کر منڈی میں جا کر بیچتے ہیں اور اس نقدی سے کپڑا لیتا اور دیگر ضرورت کی چیزیں خرید کر تیزی سے واپس اپنے سماج میں جاتے ہیں۔

مولیشی کو منڈی (پڑی) لے جانے کے لیے آس پاس کے پڑوسیوں کو اطلاع کی جاتی ہے اور گروہ کی صورت میں ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق ایک ایک، دو دو بھیڑ بکری ساتھ لیتا ہے۔ اور یہ گروپ پڑی کی طرف رواں ہو جاتا ہے۔ منڈی قریبی شہر میں ہوتا ہے جو کم از کم چالیس

تک پورا کرتے رہنا بہر صورت ضروری ہے۔ سرکار ہمت کرے یا پھر کوئی سرمایہ دار اپنے سینے پر ہاتھ مار کر چین کے لیے ایک کارخانہ لگا دے تو نہ ضرورت پڑے لاوا کی نہ گوڑی بنانے کی اور نہ گوبر ڈالنے کی۔

پشیم کا سودا عموماً لوگ پہلے سے طے کر بیٹھتے ہیں۔ جس طرح فروٹ کے باغات کے فصل کا سودا ٹھیکیدار پہلے جا کر لگا آتے ہیں، اسی طرح مولیشی کے پشیم کا سودا بھی بہت پہلے سے لگایا جاتا ہے۔ سودا گریا تو مقامی ہوتے ہیں یا پھر ڈیرہ غازی خان اور ملتان کے لاکو (دھوتی پوش)۔ مقامی سودا گر ”گوڑی“ کے حساب سے پشیم خریدتے ہیں نہ کہ تول کے حساب سے۔ قیمت عموماً نقد نہیں ملتی بلکہ دکان کے سامان کی صورت میں دی جاتی ہے جس میں دکاندار کی عیاشی ہوتی ہے۔ وہ پشیم لیتا سستا ہے اور اپنا سودا سلف مہنگا بیچتا ہے۔ بلوچ شہری مخلوق تو ہے نہیں، وہ شہر جانے اور وہاں اپنے پشیم کو اچھے نرخ پر بیچنے سے ہچکچاتا ہے۔ لہذا وہیں مقامی لوگوں کے ہاتھ بیچ کر اپنی جان چھڑاتا ہے۔ دکاندار فضول چیزوں سے اسے لاد کر روانہ کر دیتا ہے۔ دکاندار بعد میں بہت بڑی بوریوں میں پشیم ڈال کر ٹریکٹریاٹرک میں ڈال کر بڑے شہر لے جاتا ہے۔ جہاں کیپٹل ازم والی منڈی دانت تیز کیے پہلے ہی سے اس کے انتظار میں ہوتی ہے۔ وہاں من کے حساب سے پشیم فروخت ہوتا ہے۔ وہ سودا گر دیگر حیلہ اور تدابیر کے علاوہ ایک حرکت یہ کرتے ہیں کہ چار چھ دن تک اسے کوئی لفٹ نہیں کراتے۔ روز بہ روز بلوچ آدمی اپنے علاقے کی یاد میں مرجھاتا جاتا ہے اور بالآخر دعائیں مانگنے لگتا ہے کہ کسی صورت اس کی جان چھوٹ جائے۔ سودا گر اس کی دعا بہر حال قبول کرتے ہیں۔

پہوال سے لے کر بھوتار تک اور پھر مقامی سودا گر تک کسی کو بھی معلوم نہیں کہ یہ پشیم بالآخر جاتا کہاں ہے۔ مارکیٹ میں اس کے ریٹ مقرر کون سی قوتیں کرتی ہیں۔ بڑے سودا گر کو کتنا منافع ہوتا ہے اور اس کے پشیم کا آخری استعمال کیا ہے؟ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس ارزاں فروخت کردہ پشیم سے بے شمار چیزیں کارخانوں میں بنتی ہیں اور پھر دوبارہ خود انہی پر (یا ان کی طرح کے لوگوں پر) مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔

”چائے نوش“ کی تسکین کے لیے چائے پکانا ہر خیمہ، ہر گھر کا عمومی خاصہ بن کر رہ گیا ہے۔ تھکاوٹ دور کرنے یا پُر کیف پسینہ بخش نشہ کرنے کے لیے گڑ منہ میں ڈال کر چائے کی چسکیاں لی جاتی ہیں جسے ”ترخ“ کہا جاتا ہے۔ جبکہ فضول خرچی یا شوشا اور مہمان نوازی کے لیے چینی والی چائے پیش کی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ کھانے سے زیادہ خرچ آج کل چائے پرائیوٹ ہے۔

سگریٹ نوشی بھی بڑھتی جا رہی ہے حالانکہ؛

حقہ و چلم پوڑانی

درمانہء نواں دورانی

ہشکیں شوشغ ایس جوڑانی

ترجمہ:

حقہ اور چلم

در کا در مان نہیں ہیں

یہ تو محض ہونٹ جلانے کا سامان ہیں

مگر یہ سٹیٹس سمبل جیسی بات بھی ہے۔ تقریباً جو بھی شخص علاقے سے باہر گیا اور کوئی شہر دیکھ آیا، وہ سگریٹ سے ضرور آشنا ہو گیا۔ سولائزیشن کی پہلی نشانی کس قدر بد صورت ہوتی ہے!! اب چلم، پوڑ، تمباکو کی تھیلی، اور، لوہے اور پتھر کی رگڑ سے چنگاری پیدا کرنے والا سامان ”پڑز اور آڑ گیز“ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔

گھر کے افراد کے لیے جو تے خریدے جاتے ہیں۔ کپڑا، پوشاک تو ایسی چیز ہے جو عریانی کے دفاع کے لیے لازم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ مرد اور عورت دونوں کے لیے خریدے جاتے ہیں۔ ہاں شوٹک (شوق) کی بات البتہ اور ہے۔ کبھی کبھی نوجوان بہت احتیاط اور قریب سے دل کے حُب میں ایک انگوٹھی یا مصری کا ٹکڑا ایک منتظر دل کے لیے خرید لیتا ہے، اسے کئی پوشوں میں ڈال کر جیب میں ڈال دیتا ہے۔ ارزاں قیمت پر اگر کوئی نزل جائے تو اپنے یا اپنے ناڑی ساتھی کے لیے خرید لیتا ہے۔ بندوق کے لیے کمر بند خریدنا تو ایسا جرمانہ ہے جو بہر حال بھرا پڑتا ہے۔ یوں

پچاس میل دور ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے موٹے تازے مال کے ساتھ پیدل تین چار دن لگا کر بالآخر اپنی منزل تک پہنچتے ہیں۔ اس کا رواں کو ”جلو“ کہا جاتا ہے اور کارواں میں شامل لوگوں کو ”جلوی“۔ کاک پکاتے ہوئے مشکیزے ساتھ لیے، مویشی کو ہانکتے ہوئے جب پڑی پہنچ جاتے ہیں تو ہٹی رب دے حوالے۔

سوداگر نہ تو مانتا ہے پیر فقیر کو، نہ دم درود کو، نہ ہی قسم قرآن کو۔ وہ تو بیٹا ہوتا ہے ڈیمانڈ کا، سپلائی کا۔ اگر مویشی منڈی میں زیادہ ہے تو قیمت کم ہے اور اگر مال کم ہے تو قیمت میں کچھ اضافہ ملتا ہے۔ مصنوعی کمی بیشی تو بہر حال سرمایہ داری نظام کا امرت دھارا ہوتی ہے۔

مال فروخت ہونے کے بعد شاپنگ شروع ہو جاتی ہے۔ کھانے کے لیے غلہ خریدنا ہے جسے گھر والی نے ادھر راتوں کو اپنی نیند تلخ کر کے صبحوں تک پینا ہوگا۔ آٹا اس لیے نہیں خریدا جاتا کہ اونٹ پر دو دن دورات کے سفر میں آٹا تو سارا تھیلوں سے نکل نکل کر بے برکت اور کم ہو جاتا ہے۔ غلہ ایک زمانے میں جوار اور باجرہ ہوتا تھا مگر اب کچھ برسوں سے لوگ عموماً گندم کھاتے ہیں۔ اور گندم کی روٹی تو خود سالن ہوتی ہے، اللہ کی رحمت ہوتی ہے، نور ہوتی ہے۔ لہذا سالن وغیرہ کا رواج کچھ زیادہ نہیں ہے۔ دودھ دہی ہے تو ٹھیک ورنہ روٹی خود نعمت خداوندی ہے۔

کاک

لکڑیاں جلا کر دھکتے کوئلہ کے گرد پکاتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے گول پتھر، مُشت پُری (جو مٹھی میں آجائے) کو آگ میں ڈال کر خوب گرم کیا جاتا ہے۔ گوندھے ہوئے آٹے کو روٹی کی طرح چپٹا کیا جاتا ہے۔ اُس گرم پتھر کو اُس آٹے پر رکھا جاتا ہے اور وہ آٹا اس کے گرد لپیٹا جاتا ہے۔ یوں کہ سوراخ تک نہ رہے۔ اب گول چیز کو دھکتے کوئلوں کے پاس رکھا جاتا ہے۔ اندر سے گرم پتھر اور باہر سے کوئلوں کی پتیش اسے پکا دیتی ہے۔ کاک موجودہ رسم نہیں ہے۔ یہ گیارہ ہزار قبل مہر گڑھ میں بھی دریافت ہوا ہے۔

چائے

چینی، پتی خریدنا البتہ ضروری ہے۔ مہمان، مسافر، بیماری، بارش، سردی..... پھر عادی

باخبر کر دیتا ہے۔ حال شریکی کے علاوہ کبھی کبھی ناڑی سُری مل جاتے ہیں تو سارے گھرانے کے نرینہ افراد کی روح کو غذا میسر ہو جاتی ہے۔ تاریخ دان مہمان، رند و لاشار کی جنگ، مست و سمو کی محبت اور صحابیوں کے قصے بیان کرتے ہیں۔ یوں واقعتاً مہمان خدا کی ایک نعمت ہوتا ہے۔

میزبان، مہمان کی سماجی حیثیت اور ان کی تعداد کے حساب سے مولیٰ لاتا ہے۔ جاندار میزبان، مولیٰ لاتے ہی طلاق کہہ دیتا ہے اور مہمان سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی درخواست کرتا ہے۔ اگر وہ طلاق نہ کہے تو مولیٰ ذبح کرنے یا نہ کرنے کے لیے گویا مذاکرات کی گنجائش چھوڑ دیتا ہے۔ مہمان یا تو طلاق کہہ کر مولیٰ ذبح کرنے سے منع کرتا ہے، یا طلاق کہہ کر ذبح ہونے والے مولیٰ کی تعداد کو کم کرتا ہے ورنہ مولیٰ ذبح کرنے کا خرچہ ”نہ“ کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ کچھ گوشت خور مہمان فوری طور پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

بہر حال مہمانداری کی مد میں مولیٰ کی ایک اچھی خاصی تعداد قربان ہوتی ہے۔ مہمان کو البتہ ایک تکلیف کرنا پڑتی ہے کہ اس نے دنبہ خود ذبح کرنا ہوتا ہے اور گوشت خود ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہوتا ہے۔ لکڑی خود چُکن کرنا پڑتی ہے اور رواج کے مطابق بھی خود پکانا پڑتی ہے۔ تاکہ میزبان کے کام کو شہر کیا جاسکے۔ مہمان میزبان کو کھانے میں شریک کرتا ہے۔ دوسرے نرینہ افراد بھی کچھ کھا لیتے ہیں۔

ساج میں بڑے دن آتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ زردہ پلاؤ نہیں ہے۔ تب بسم اللہ کر دو اور چھری کو تیز کرنے والے پتھر پہ رگڑو اور کھینچ لاؤ ایک دنبہ۔ دعا مانگو، اس کی ٹانگیں پکڑ ڈالو۔ بسم اللہ، اللہ اکبر، بسم اللہ، اللہ اکبر کہتے ہوئے دنبے کی گردن پر چھری چلاؤ۔ بڑے دن دونوں عیدوں والے دن ہیں، سال میں دو پیشینہ ہیں، دھاگ کا دن ہے، ہزاری اور خدائی ہیں، اسی طرح رسول کی پندرہویں ہے، جہاں کہ مال خیرات کیا جاتا ہے۔

مَنت اور نذرانہ مال گشی کا ایک اور موقع ہوتا ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگ اپنے سر کے بالوں یا داڑھیوں کے استرا کرنے کو نذرانہ کے بطور عہد کرتے تھے مگر آج کل اپنے کسی خاص کام کو پورا کرنے کے لیے بھیڑ بکریوں کی گردنیں حاضر ہیں۔ ”پیر صاحب! میرے ریوڑ کا فلاں مولیٰ

ایک دو دن غلیظ شہر کی سالن خوری والے فضول کھانے سے پیٹ کا جہنم بھرنا پڑتا ہے۔ پھر اپنے گراں بہا، گراں مایہ، قییش اور ضرورت کی ساری چیزوں کے ساتھ فلک بوس پہاڑوں اور دشوار گزار درروں کی طرف حرکت۔

خریدے ہوئے اناج کے قافلے کو ”سات“ کہتے ہیں اور قافلے میں شامل لوگوں کو ”ساتی“۔ اور ان ساتیوں کے اندر بہر حال ایک جوان تو ضرور ہوگا جس کی جیب میں ”کسی“ کو ساتی (زیور پوش) بنانے کیلئے ایک انگوٹھی ہوگی۔

جی بلوچ عکارواں۔

5- جانوروں کا قتل عام

بلوچ کے مولیٰ ہمیشہ چھری کے نیچے ہوتے ہیں۔ بھیڑ بکری کو ذبح کرنے اور انسان کو قتل کرنے کی عادت کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوگا۔ معلوم نہیں اس بارے میں نفسیات کے ماہرین کی ریسرچ کیا کہے گی۔ چھری اور مولیٰ کی یاری شاید مالدار کی اولین دن سے شروع ہوئی ہوگی جو شاید ابد تک چلے گی۔ خود مرنے والی بھیڑ پر چھری پھیرنا تو خیر مجبوری ہے کہ دوسری راہ نہیں ہے مگر دوسرے مواقع پر بھی چھری عموماً رواج و رسم اور عقیدہ و ایمان کے حکم سے بلند ہوتی ہی رہتی ہے۔ قبیلہ میں انسان واقعی مجبور محض ہے کوئی اختیار، کوئی فرار نہیں۔ نرینہ اولاد اللہ نے دی ہو تو اس خوشی یعنی ”بیشن“ کے مواقع پر مال ذبح کرنا پڑتا ہے، اس پر نام رکھنے (شغنان) کے وقت کا جشن تو مولیٰ کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ پھر اسی بچے کا ختنہ کرنا ہو تو جرمانہ پھر بھیڑ بکری کو بھرنا پڑتا ہے۔ پھر مگنی، شادی، بالآخر موت اور برسی اور بھیڑ کی گردن۔ نرینہ انسان کی پیدائش سے لے کر بعد از مرگ کی ہر رسم اور بھیڑ بکریوں کا قتل عام چولی دامن کے ساتھی ہیں۔

مہمان اور مہمانداری قبائلی زندگی کی ضرورت بھی ہے اور خوبی بھی۔ بیابان میں کسی آدم زاد سے ملنا تو ویسے ہی ایک خوش بختی ہوتی ہے۔ مگر بلوچ کے علاقے میں مہمان سیاسی، سماجی، معاشی، تجارتی، نشانہ بازی، اور گھر دوڑ کی خبریں تفصیل سے لاتا ہے اور میزبان کی پوری برادری کو

گوشت کو ابالا جاتا ہے، مٹی کے دیگ (دیز) میں۔

ہر کام قاعدے قانون کے مطابق

مویشی کو ذبح کرنا، اس کے گوشت کے ٹکڑے بنانا اور پکانا، سب کچھ قاعدے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ مال ذبح کرنے کا طور طریقہ مقررہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے یار کے پاس اگر چاقو نہ ہو تو نوکدار پتھر ہی تکبیر کی چھری ہوتا ہے۔ تکبیر (سچی بات ہے اور سچی بات اللہ کو اچھی لگتی ہے) ہماری اکثریت کو نہیں آتی۔ بس مویشی لٹایا، چھری پھیر دی اور گردن میں ریڑھ کی ہڈی کے اندر والے سفید مغز کو کاٹ دیا اور مویشی چھوڑ دیا تڑپنے کے لیے۔ ہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ غیر ہنگامی حالت میں ذبح ہونے والا مویشی بیا سنا نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ باقی مویشی اس وقت آس پاس موجود نہ ہوں تاکہ اپنے نسل اور جنس کو تڑپتے نہ دیکھ پائیں۔ ورنہ وہ واقعاً بہت تکلیف میں ہوتے ہیں۔ دکھی ہو کر دھاڑیں مارنے لگتے ہیں، پیر زمین پر مارنے لگتے ہیں (یہ محض انسان ہے جو ضیاع کوڑے لگتے اپنے انسان بھائی کا تماشا دیکھنے ہزاروں کی تعداد میں سٹیڈیم جاتے رہے ہیں۔ اللہ جانے کون انسان ہے، بکری یا انسان؟)۔

مال ذبح کرتے وقت ایک بلوچی اور شارٹ کٹ دعا مانگی جاتی ہے اور چھری پھیر دی جاتی ہے۔ جب مویشی تڑپ کر ٹھنڈا پڑتا ہے تو اس کی کھال اتار دی جاتی ہے۔ یہ کھال بہت احتیاط، استادی اور انکل سے نکالی جاتی ہے۔ مگر اب تک ان کھالوں سے مشکیزے، لسی بنانے والے ہیوز، آثار رکھنے والا اپان، روٹی رکھنے کے لیے بڈگی اور دیسی گھی رکھنے کا زنک بنائے جاتے ہیں۔ اس لیے نہ تو ان میں سوراخ اور چھید برداشت کیا جاتا ہے اور نہ ہی باید ہے کہ گوشت چھڑے کے ساتھ جانے دیا جائے۔

مویشی بانی چونکہ ہماری روزی بھی ہے اور پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ بھی، اس لیے اس کے بارے میں ہماری ہر حرکت، ہر قدم رواج بن گیا ہے۔ اس رواج سے ذرا اُدھر اُدھر ہوئے تو فوراً فتویٰ لگ جاتا ہے؛

گندیں مڑد ء مازنا

تمہارے نام پہ خیرات ہے اگر میرا فلاں کام ہو جائے.....“

مویشی بلا دور کرنے والا میزائل ہوتا ہے۔ اگر کوئی برا خواب دیکھا تو سویرے ڈھیر کر دو ایک بکری، اللہ خیر کرے گا۔ کوئی بیمار ہو تو ایک دنبہ قتل کر دو، اللہ دکھ آسان کرے گا۔ گہانچ نامی پرندہ بانیں جانب بیٹھا بول رہا ہو تو ایک بکری ذبح کرو، یہ برا شگون نیوٹرل ہو جائے گا۔ کوئی جن وغیرہ تنگ کرے تو مویشی کا خون بہا دو، جن بھاگ جائے گا۔ کافر اسپرین اور ٹیٹراسائیکلین اگر کام خراب نہ کرتے تو جسم کے درد اور نمونیا جیسی بیماریوں کا علاج مویشی کا چڑا چڑھانے سے ہو جایا کرتا تھا۔ مویشی ذبح کرو اور اس کی کھال مریض کو پہنا دو، شفا کا دیوتا بچانے آن پہنچے گا۔ ایک کھال سے گزرا نہ ہو تو دوسرا، ورنہ اگلے دن پھر ایک۔ میں نے بیس بیس کھال چڑھانے کا بھی سنا ہے۔ ایک مویشی اگر کم از کم ہزار روپے قیمت کا ہو تو بیس کھالیں پہنانے پر بیس ہزار روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت گراں بہا علاج ہے۔ اب بلوچ دس پندرہ روپے کی انٹی بائیوٹکس پر جانے کا سوچ رہا ہے۔

کھال استعمال کیے جانے والے مویشی کا گوشت بے ذائقہ اور بے مزہ ہوتا ہے۔ کئی لوگ یہ گوشت کھاتے ہی نہیں ہیں حتیٰ کہ اگر بے خبری سے کھانا پڑے بھی تو وہ پہلے ہی نوالے میں بتا دیتے ہیں کہ اس مویشی کی کھال مریض کو چڑھائی گئی ہے۔ ایسے لوگ اگر یہ گوشت کھا بھی لیں تو بیمار ہو جائیں گے۔ الٹی کر کے اسے نکال دیتے ہیں۔ اس کا سائنسی سبب معلوم نہیں کیا ہوگا، بہر حال یہ مظہر موجود ہے۔

بیمار مویشی کو ذبح کرنا ویسے ہی ضروری ہوتا ہے۔ درندے کی زخمی کردہ بھیڑ کو کون حرام موت مرنے دیتا ہے؟ اس کے علاوہ مویشیوں کی بیماریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ہماری چھری کو کند ہونے دیتی ہی نہیں ہیں۔ مثلاً مویشیوں کا چچک، اسہال، بینزارو، چرواہے کا پتھر لگ جانا، مویشی کا پہاڑ سے پھسل کر گرنا وغیرہ۔

بلوچ گوشت خور قوم ہے مگر پہاڑ اور دڑوں کے اندر پکوان بنانے کی بڑی سہولتیں چنداں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ہم گوشت کو زیادہ تر آگ پر پکاتے ہیں۔ جسے سچی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی

بھیدی بڑتی گوں پاذا

ترجمہ:

دیکھو نامرد آدمی کو

اس سے پائے کے ساتھ بھیدی چلی گئی

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو بھیدی خواہ پائے میں جائے یا ران کے ساتھ، یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں کہ آدمی کسی اچھے، گھبر اور چست و چو بندو جوان کو نامرد قرار دے۔ مگر بلوچ کی زندگی اس طرح کے کئی رواجوں کے ساتھ اتنی سختی سے جکڑی ہوتی ہے کہ اس کا توڑنا ایک دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں۔

اُبالے جانے والے گوشت کو ”بند بند“ کرنا پڑتا ہے۔ اسے مجموعی طور پر بارہ بند میں کاٹ دیا جاتا ہے جو نمایاں اور معین دستور کے مطابق کاٹ دیے جاتے ہیں۔ سچی کے لیے البتہ چاروں پیر، پیٹھ اور گردن، سیدہ پسلیوں سمیت، جگر، معجکلی دو طرفہ آگ کے درمیان پکائی جاتی ہیں (چکی اور اس کا تیل پہاڑوں، چٹانوں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے انرجی کا زبردست منبع ہوتا ہے)۔

مری کی بھارانی شاخ کے لوگ گردہ نہیں کھاتے، خاص کر کثیر القومی اجتماعات میں گردہ کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ گردہ کیوں نہیں کھاتے، کسی کو خبر نہیں۔ نہ عقلمند و نادان لوگوں کو معلوم ہے اور نہ سفید ریش اور جہاندیدہ لوگ کچھ بتا سکتے ہیں۔ یہ پابندی اس قدر زیادہ ہے کہ کسی جگہ لوہارانی، گزینی یا کوئی دوسرا پڑوسی قبیلہ میزبانی میں اجتماع کے اندر اگر جان کر، بھارانی کی تھال میں گردہ ڈال دے تو جان جائے کہ اس نے قتل جتنی دشمنی مول لی۔

سجی

سجی لگانے یا گوشت ابالنے کے لیے آگ جلانے کی بھی خاص علامتیں ہیں۔ اگر آپ سفر میں راستہ گزر کر جا رہے ہیں اور آپ نے حالیہ سجی کی راکھ دیکھی تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ خیر والی سجی تھی یا غم اور سوگ والی۔ اگر تو اس راکھ کی سمت مغرب مشرق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی اور شادی کا مجمع تھا، یا پھر کوئی خیرات، مہمان یا جرگہ کی گوشت خوری تھی۔ اگر یہ راکھ شمال

جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی فوتیدگی ہوئی ہے اور یہ اس کی خیرات (آسروخ) کی نشانیاں ہیں۔ (سمتوں کا برقرار رکھنا سخت ضروری ہے)۔

اسی طرح سچی خود ایک ترتیب کے ساتھی پکانی پڑتی ہے۔ اس کے پاؤں Limbs اس طرح لگانے پڑتے ہیں کہ قطار مغرب سے مشرق کی طرف رہے، پہلے پہلے گردن، پھر دونوں اگلی ٹانگیں، پھر دونوں کچھلی رانیں، پھر پیٹھ اور پھر پسلیاں اور آخر آخر میں کلیجہ تیخ میں پرو کر لگا دیں گے جس کے اوپر چکی رکھ دی جاتی ہے تاکہ کلیجہ چربی سے پک جائے۔ قدیم قبائلی دشمنی کا ایک کم بخت تصور یہ ہے کہ مری اپنی سچی کی Medial Sides کا رخ بگٹی علاقے کی جانب کر دیتے ہیں اور بگٹی ہر فنکشن میں ان سمتوں کو مری کی طرف موڑ دیتے ہیں اور دشمنی کے عہد اور یادداشت کو تازہ کر دیتے ہیں۔ یا اللہ اس توضیح کو بدل ڈال، بھائیوں کو بھائی بنا دے، قبائلی جنگوں کے شعلے بجھا دے اور ہمیں اکیسویں صدی کے تقاضوں کے تکمیل کی توفیق دے دے!

سچی کی بات ہو رہی ہے تو ایک عظیم انسان کی بڑائی کی یادگیری بہت ضروری ہے۔ وہ عظیم المرتبت پہاڑ جیسی شخصیت مست تو کلی کی ہے۔ مست جب تک زندہ رہے، ایک فضول اور غیر انسانی رواج کو ختم کیے رکھا۔ مست نے مری کے علاقے میں بہت آہستہ اور مستقل مزاج لڑائی کے بعد یہ کام کر دیا تھا کہ کھانے میں، خیرات میں، مہمانی، شادی بیاہ یا کسی دوسرے جشن میں پہلے پہلے سموراج (عورتوں) کا حصہ نکالا جائے اور زینہ افراد بعد میں اپنے حصے کا گوشت کھالیں۔ جو شخص ظاہر یا خفیہ طور پر یہ بات نہ مانتا مست اس سے ناراض ہو جاتے اور اس گھرانے کا کھانا نہ کھاتے۔ تب انہیں مجبوراً دنیا دہ ذبح کرنا پڑتا۔ مست اس گھرانے کی عورتوں کا حصہ پہلے الگ کر دیتے اور انہیں بھجوا دیتے، پھر خود کھانا کھاتے۔ لوگوں میں بہت سی روایتیں اور بہت سے قصے اس طرح کے موجود ہیں کہ مست نے عورتوں کے اس حق کے لیے کیسی کیسی لڑائی لڑی۔ ایک قیصرانی کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ قصہ سلطان قیصرانی نے مجھے سنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ مست ایک بار قیصرانی قبیلہ کے علاقے گئے۔ مہمانی، مویشی کشی اور خیرات کی گئی۔ مست نے گوشت میں سے عورتوں کا حصہ (سموراج کا حصہ) الگ کر کے کسی کو دے دیا کہ لے جا کر عورتوں کو پہنچا دے۔ تکیا نامی اس

کم نہیں ہوتی۔ شاید بلوچ مویشی سٹور کرنے کے لیے پالتے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت بیچ کر کیش کیے جاسکیں۔ بس خدا ہمارا جہاز چلا رہا ہے۔ بلوچ کا مویشی صحت مند بھی نہیں ہے۔ 79 فیصد بھیڑوں کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ پھیپھڑوں اور دوسری بیماریاں تو ایک طرف رکھیں، سرکار کا خانہ بھی خراب ہے، انسانوں کی دوا نہیں کر سکتی۔ مویشی تو گنگ حیوان ہے۔ سرکار ایک اچھی دودھ دینے والی نسل بھی مروج نہیں کر سکتی۔ بس سوکھے پروپیگنڈے ہیں کہ یہ کیا ہے، یہ کریں گے۔ کرتی راکھ بھی نہیں۔ قہر خدا کا، صرف مری لگٹی قبیلوں میں چودہ لاکھ بھیڑیں ہوں اور لوگ دودھ کو ترسیں۔ ان کے بچے بے خوراک کی سے افریقن بچوں جیسے لاغر و نحیف ہو کر بالآخر مر جاتے ہوں۔ بوڑھے اسی دودھ کی کمی کے سبب وقت سے پہلے بہشت کے دودھ کی نہروں میں تیراکی کرنے چلے جاتے ہوں۔ مائیں بہنیں اپنے ناتواں جسم اور کمزور خون سے بچوں کو دودھ پلاتی ہوں اور پلاتے پلاتے خود لکڑی کی طرح سوکھ جاتی ہوں، چہرے ہلدی کی طرح زرد اور انسانی صورت بگڑ جاتی ہو۔ کوئی کیوں چمٹا رہے ایسی سرکار سے!!

بھیڑوں کی زچگی کا موسم سردیوں میں ہوتا ہے۔ سرما کی تیج بستہ ہوا اور علاقے میں گھاس کی نایابی بھیڑ کی پستانوں کو دودھ کی نعمت سے خالی کرتی جاتی ہیں۔ ننھے لیلوں کا پیٹ پالنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کے لیے دودھ بہت ہی کم بیچ جاتا ہے۔ پھر منحوس چائے کا رواج بھی بہت ہو گیا ہے۔ ”چاہ جوش“ نامی کالی بلا چولہے سے اترتی ہی نہیں۔ زندہ رہیں گھر کی گھڑ مالکین، ہمت کر کے پھر بھی کچھ نہ کچھ بچا لیتی ہیں۔

دنی جب بچہ جنتی ہے تو اس کا دودھ بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ اسے پہلے دن ابالتے ہیں اور ”بوہلی“ اور بعد ازاں دو تین دن تک ابال کر ”کٹ“ بناتے ہیں۔ کنبہ شوق سے ان ڈشوں کو کھاتا ہے، یہ بہت لذیذ چیزیں ہوتی ہیں۔

بعد میں تو پھر دودھ خود ایک سالن ہوتا ہے۔ چسکیاں لگا کر نوالے کے ساتھ کھائیں یا لقمہ اس میں بھگو کر کھائیں، ورنہ روٹی ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس میں ڈال دیں تو پھر تو یہ بادشاہی خوراک بن جاتا ہے۔

قیصرانی نے وہ گوشت پہنچایا نہیں بلکہ راستے میں خود کھالیا۔ مست کو کسی طرح خبر ہوئی۔ پھر بھی تکیا سے انہوں نے پوچھا گوشت پہنچا دیا ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ تب مست نے کہا ”برو گرہ تہ دہ سمورا جا گوں کفاغی“ (جاؤ شالا تم بھی سمو کے قبیلے میں شامل ہو جاؤ)۔ کام ہیں رب کے تکیا نامرد ہو گیا۔ اس قصہ کو آپ مائیں یا نہ مائیں، میں اور سلطان اسے مانتے ہیں۔ کاش کہ مست زندہ رہتے۔ تب یا تو بلوچ، عورتوں کے حقوق دے دیتے یا پھر خدا کے حکم سے بہت سے بڑے لوگ سرخی پاؤں لگا لیتے، زمانہ کپڑے پہن لیتے اور گلیوں بازاروں میں ”ہائے اللہ“ کہہ کر زخہ تالیاں بجاتے پھرتے۔

6- شیر و روغن

بلوچ کہتے ہیں کہ اللہ کسی انسان کو بہ یک وقت چار نعمتیں نہیں دیتا؛ زینہ اولاد، گندم کی روٹی، دودھ، اور ایمان۔ بیٹے تو آپ جتنے زیادہ پیدا کریں قبائلی نظام میں وہ کبھی کافی نہ ہوں گے جہاں کہ زینہ افراد کی بہتات بذات خود ایک سٹیٹس سمبل ہے۔ گندم کی روٹی ایک زبردست چیز ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو جب بھی ہمیں گندم کی روٹی دی جاتی تو ہم یہ روٹی بغیر کسی سالن لسی کے، روکھی کھا جاتے۔ اس لیے کہ مائیں کہتی تھیں، ”ابا، گندم کی روٹی تو خود سالن ہوتی ہے“۔ گندم کی روٹی کو اللہ نے نیست کر دیا تھا۔ سیاسی حالتوں نے امن و امان کا سنہرا پرندہ لے جا کر پردیس کر دیا۔ اور زمینداری تو ہوتی ہے امن اور قرار کے ماحول میں۔ ویسے بھی زراعت ہم سے یاری نہ کر سکی ہے۔ البتہ ایمان..... زندہ باد..... ہمارے پاس یہ چیز بہتات میں ہے۔ آپس میں لڑنے مارنے، قتل کرنے، بے عزت کرنے اور اپنی جڑیں کاٹنے کے لیے ہمارا ایمان ہمہ وقت چھلک رہا ہوتا ہے۔ علم کے خلاف، محنت اور شعور کے خلاف، عورتوں کی آزادی کے خلاف اور برے رواجوں سے لڑائی کے خلاف ہمارا ایمان ہر دم تازہ ہے۔

دودھ انسان کے لیے بلا شک ایک نعمت ہے۔ ہمارے علاقے میں جب لوگ دعا مانگتے ہیں تو کہتے ہیں اللہ، ہٹ و شیر (اللہ صحت و دودھ)۔ مگر نہ تو ملتی ہے اچھی صحت اور نہ ہوتا ہے پر نور دودھ۔ جتنی مویشی بانی ہم کرتے ہیں، وہ شاید ہی کوئی دوسری قوم کرتی ہو۔ مگر پھر بھی دودھ کی نایابی

بھیڑیں بیورغ نسل کی ہوتی ہیں جو روزانہ 200 گرام دودھ دیتی ہیں۔ اس دودھ سے مکھن کیا خاک نکلے گا؟ پھر بھی بوڑھیوں کی کفایت شعار ہاتھوں کو سلام ہو، وہ بڑی مصیبت اور محنت سے بالآخر مکھن نکال لیتی ہیں۔ یہ مکھن بہت سارے کام دیتا ہے۔ آٹے کے ساتھ ملا دیں نو مولود بچے کا ناک خوبصورت، ستواں اور سیدھا کرنے کی خاطر دن میں چار پانچ دفعہ معمولی سے پریشر کے ساتھ لگاتے جائیں۔ اگر ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہ ہو تو بچے کو مکھن کھلاؤ۔ یہ الگ بات ہے کہ مکھن اس کا باپ بھی ہضم نہیں کر سکتا۔ یہ بچہ جلد یا دیر یا تو اللہ کا مال بن جاتا ہے یا پھر ساری زندگی صحت کی حسرت میں جیتا ہے۔ مکھن ڈاکٹری کا کام دیتا ہے۔ یہ بہت سی دوائیوں میں ملائی جاتی ہے خاص کر بچوں کے ”نک و کفغ“ نامی بیماری میں اک کے پتوں اور مکھن کا استعمال جسے ناس کہتے ہیں، گویا امرت دھارا ہے۔ ای این ٹی کے ڈاکٹروں کے روزگار کا ضامن۔ سرکار تو ویسے ہی نہیں بنتی۔

مکھن روٹی کے ساتھ بھی زبردست مزہ کرتا ہے، اگر چینی کی چٹکی بھی اس پر ڈال دیں تو پھر تو صاحبوں والی خوراک بن جائے گی۔ اگر گھڑ گھر والی نے کچھ بچایا تو اصلی گھی بن جائے گا۔ یہ گھی کو لیسٹروں سے بھرا ہوا ہے۔ شہری لوگ باید ہے کہ اسے استعمال نہ کریں اس لیے کہ وہ کام کاج کرتے نہیں ہیں۔ سارا دن بیٹھے رہتے ہیں کرسیوں پر، اس لیے یہ صرف پہاڑ کی دکھی اور جفاکش زندگی کے لیے اچھا ہوتا ہے، جہاں سب چلتا ہے۔ آہا! دیسی گھی اگر شہد کی موجودگی میں گندم کی روٹی کے ساتھ مل جائے تو سندھ و ہند اس پر قربان۔

دیسی روغن

معیاری اور اچھی غذا کی ایک بنیادی صفت اس کی ظاہری شکل و صورت ہے۔ اچھی اور دیدہ زیب رنگوں والی غذا نہ صرف آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے بلکہ ذائقے اور غذائیت کے لحاظ سے بھی عموماً بہترین ہوتی ہے۔ بلوچستان کے لوگ مکھن کو گھی میں تبدیل کرنے کے لیے اس میں ہلدی، گندم کے دانے، قدرے آٹا، سونف، زیرہ اور الائچی ملا کر خوب اچھی طرح جوش دے کر اصلی دیسی گھی تیار کرتے ہیں جس میں توت (زکی) ملا کر سالوں مشکیزہ (زک) میں رکھنے سے اس میں مہک اور رنگت نکھرتا جاتا ہے۔

پہوال (چرواہا) جب کٹورا ساتھ لے کر مال چرانے روانہ ہوتا ہے تو اسے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ بگو (گلے سے ایک دھن) بجاتا ہوا کوہی پنیر کے دو تین دانے توڑ کر کٹورے میں نچوڑتا ہے اور اس میں دودھ دوھتا ہے۔ دھوپ پر اسے گھنٹہ دو گھنٹہ رکھ دیتا ہے اور ایک زبردست ڈش نوش کرتا ہے۔ جسے ”پنیر“ کہتے ہیں۔

پنیر بلوچستان کے خوش خوراک قبائل کی پسندیدہ غذا ہے۔ یہاں کے قبائل جو پنیر تیار کرتے ہیں وہ نہ صرف دوران سفر چلتے چلتے بآسانی تیار کی جاسکتی ہے۔ بلکہ بلوچستان کے قبائل کی بنائی ہوئی پنیر یورپ اور امریکہ کی جدید سائنسی تکنیک سے تیار شدہ پنیر سے ہزار درجہ بہتر اور لذیذ ہوتی ہے۔

پنیر بنانے کے ہمارے ہاں دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یوں ہے کہ پنیر باد (کوہی پنیر) نامی پودے کے پھول دودھ میں ملا کر کچھ دیر رکھ دیا جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں دودھ جم جاتا ہے۔ اسے کپڑے کی تھیلی میں ڈال کر لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ اس میں زائد پانی نکل جائے۔

اسی طرح دودھ میں تھوڑی سے لسی (سبھا نڈ) شامل کر دیں، ایک گڈوی کے اندر رات بھر رکھ دیں تو صبح قرار سے بیٹھ کر دہی کی چسکیاں لے لیں۔ اگر آپ نے سبھا نڈ کم مقدار میں ڈالا یا ناٹم کم کر دیا تو پھر دہی کی توقع نہ رکھیں، ”آما کو“ کھانا پڑے گا۔ جو بذات خود ایک ڈش ہوتی ہے۔ دہی کو اگر مخصوص کھال ہینز میں ڈال دیں اور زور سے ہلا دیں تو لسی مہیا ہو جائے گی۔ لسی مکھن ہمارے ہاں سکھی ہونے کی علامت ہے، بڑے پن کی نشانی ہے۔ اللہ جس گھر پر زیادہ مہربان ہوتا ہے تو اس گھر کی خاتون باتوں باتوں میں اپنے گھر میں لسی کا تذکرہ ضرور کرے گی۔ ویسے تو لسی خود ہی ایک نعمت ہوتی ہے مگر اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ گندم کی روٹی اگر نصیب نہ ہو اور قسمت میں خنزیر جو لکھی ہوئی ہو تو یہ کجخت روکھی تو گلے میں سے آگے گزرتی نہیں، پھر بھر اہوتی جاتی ہے۔ اس کے لیے بس ایک گھونٹ لسی کافی ہوتا ہے۔ جس سے وہ نوالہ نظروں سے دور ہو جاتا ہے اور پیٹ کی جھیل میں جامرتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ سردیوں میں دودھ کم ہوتا ہے۔ مشرقی بلوچستان میں

گم ہو جاتی ہیں اور پھر بہت دیر بعد ان کی واپسی ہوتی ہے۔ بارشوں کی واپسی بھی ہمارے علاقے میں بد بخت ہوتی ہے۔ بارشیں جب اپنی طویل آوارہ گردی سے واپس لوٹتی بھی ہیں تو ان کا چہرہ سو جا ہوا، فرعون نما ہوتا ہے۔ غصے سے بھری ہوئی بارشیں آتی ہیں سیلابوں تباہ کاریوں کے ساتھ، طویل ندی نالوں میں آیا ہوا سیلاب مویشیوں کو بہا لے جاتا ہے۔ ان بادلوں کو کیا خبر کہ ان کی غیر موجودگی میں خوبصورت چرواہے اور محنت کش کسان سندھ میں سندھی فیوڈلوں کی جھڑکیاں کھاتے ہیں۔ وہ محنت کرتے ہیں، رات دن محنت کرنی ہوتی ہے۔ ”پرولٹی“ برداشت کرنی ہوتی ہے، بال بچے دوسروں کی جھڑکیوں دھکوں کے زد میں آتے ہیں۔ بادل پھر بھی ناراض ہیں، آتے ہیں تو گالی گلوچ کرتے ہوئے، دھمکیاں دیتے ہوئے۔ وہ دن ضرور آئیں گے جب فارمنگ کا سائنسی نظام وضع ہوگا اور پھول جیسے بلوچ بارشوں کے محتاج نہ رہیں گے اور انسان دوست حکومت ٹیوب ویل، ڈیم اور دیگر طریقوں سے چراگا ہوں کی بہتات کر دے گی۔ مالدار کی کوکڑ پر بیٹو بنیادوں پر چلائے گی۔ اچھی نسل کے جانور لائے گی، قد آور یا دودھ دینے والی یا پھر پشم والی نسلیں بڑھائے گی۔ مویشی کی بیماریاں دور کرنے کے لیے ہسپتالوں کا جال پھیلانے لگی اور ان میں وطن دوست ڈاکٹر بٹھا دے گی.....

چمڑی

بلوچستان پھلوں کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سیب، انگور، انار، بادام، زردالو، آڑو، ناشپاتی وغیرہ کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں۔ زردالو کی پندرہ اقسام میں ایک کو ”شغالی“ کہتے ہیں جسے تازہ کھانے کے بجائے خشک کر کے بطور ترکاری استعمال کیا جاتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں ایسے خشک زردالو کو بھگو کر نرم کرنے کے بعد پانی میں رگڑ کر ایک گھنٹا شیرہ تیار کیا جاتا ہے جس میں جب ذائقہ مختلف مسالہ جات ڈال کر دھیمی آگ پر پکا یا جاتا ہے اور یوں چمڑی کے نام سے ایک نہایت لذیذ میٹھا پکوان تیار ہو جاتا ہے۔

7۔ شتربانی (جت)

مذر

مکھن کو مخصوص طریقے سے پکانے میں گندم کے جودانے پکائے جاتے ہیں، انہیں بھی مذر کہا جاتا ہے لیکن مکران کے علاقے میں کھجوروں سے شیرہ نکالا جاتا ہے اور اس شیرہ سے نہ صرف حلوہ تیار کیا جاتا ہے بلکہ اس شیرہ سے میٹھی روٹیاں بھی پکائی جاتی ہیں، جنہیں مذر کہا جاتا ہے۔

کروت

کو باید ہے نہ بھلایا جائے۔ کروت ایک ایسی خوراک ہے جیسے کہ شہری امیر لوگوں کے فرج کے اندر ذخیرہ کیا ہوا کھانا ہو۔ جب ضرورت ہو نکالو، کھا لو۔

بلوچستان کے وہ قبائل جن کی معیشت کا زیادہ تر انحصار مال مویشیوں کے پالنے پر ہے، ان کی غذا عموماً دودھ اور اس سے بنی ہوئی اشیا پر ہے۔ وہ دودھ سے لسی (قروت، کرت، خروڈ) اور پنیر، مکھن اور گھی جسے خریش بھی کہتے ہیں، تیار کرتے ہیں۔ کرت یا خروڈ ایک قسم کی خشک کی ہوئی لسی ہے۔ یعنی لسی کپڑے کے تھیلے میں لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ اس کا سارا پانی نکل جائے، تب تھیلے کو نچوڑ کر لسی کا بقایا پانی بھی نکال دیا جاتا ہے اور بھی لسی کے ڈھیلے بنا کر خشک کیے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت اس سے لسی بنا لیتے ہیں یا پھر اس لسی میں پیاز اور مرچ مسالا ملا کر ترکاری بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لسی چٹنی میں بھی ملا دی جاتی ہے جس سے چٹنی کی لذت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

یہ ساری نعمتیں بلوچ کو چاہئیں..... یہ ساری نعمتیں انہیں نصیب ہوں..... ان ساری نعمتوں سے محروم رکھنے والے طبقات مردہ باد ہوں۔

دیہی بلوچستان میں دودھ، مکھن یا دیسی گھی کی خرید و فروخت کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نورانی نعمتوں کے بیچنے سے خیر اور برکت نکل جاتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ منڈی اپنی نیک اور بڈٹانگیں پھیلانے لگی۔ اپنے رواج مروج کر کے بہت سی بے برکت چیزوں کو برکت دیتی جائے گی۔

مالدار کی ارتقا، دودھ دہی کی فراوانی اور صحت و سلامتی ابھی تک سب کی سب بارشوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ ہم ابھی تک بارشوں کے محتاج ہیں جو تین تین سال تک ادھر ادھر بھیک مانگنے

(اونٹوں کا گلہ بان)

سیر سپاٹے کا اسے بہت شوق ہوتا ہے کہ کچھ نامی جھاڑی کی جگہ اسے دور دراز کے علاقوں کی زیارت کے لیے اکساتی رہتی ہے۔

اونٹ صدیوں سے بلوچوں کا دست و بازو رہا ہے۔ تاریخ میں لاکھ بلوچ ساحل مکران سے لے کر ڈیرہ غازی خان اور ساحل مکران سے لے کر قندھار تک ساری تجارت اسی اونٹ سے کرتے رہے ہیں۔ یہ ہماری ٹرانسپورٹ کی گاڑی ہے، تبادلہ کا میڈیم ہے، خانہ بدوش کا روزی رساں ہے۔ یہ دلہن کا لب ہے، خون بہا ہے۔ یہ ہمارا مستقل ساتھی ہے، ہمارا ہمراہ ہے۔ ہمارا پالنے والا ہے۔ اس کا دودھ بیماریوں کا علاج ہے۔ دودھ کی جھاگ پکنک کی خوراک ہے، اس کا گوشت میلے اور جشن کی ڈش ہے، اس کا پشم ہمارا خیمہ اور چٹائی ہے۔ (6)

بگ کا جھوک دو مواقع پر بالخصوص میلہ کا سماں پیش کرتا ہے۔

ایک تو اونٹوں کو مخصوص نشان لگانے (دانگ) کے وقت (جب لوگ جمع ہوتے ہیں، ایک دو دنبہ ذبح کرتے ہیں اور اونٹوں کے مالک کے نام کا پہلا انگریزی حرف والا لوہا گرم کر کے اونٹ کی گردن، جبرٹا، پیٹھ یا ران پر رکھ لیا جاتا ہے تاکہ یہ گرم لوہا جلد کو جلا ڈالے اور ساری عمر یہ نشان موجود رہے۔ (دانگ کب سے مروج ہوا..... آیا یہ چاکر کے زمانے میں تھا یا نہیں؟۔ یہ سوال ابھی محققین کے لیے جواب طلب ہے)۔

دوسرا وقت ڈاچی (اونٹنیوں) کے بچے دینے کا ہوتا ہے۔ جب اونٹنی کے دوہے گئے دودھ پر بہت سا جھاگ چاٹنے کے لیے قرب و جوار سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ڈاچی کا دودھ کچھ کچھ نمکین ہوتا ہے۔ یہ جھاگ دوا انگلیوں کی مدد سے چاٹا جاتا ہے۔ ڈاچی کے دودھ، دودھ پہ بنے جھاگ اور جنتڑیں پہ زبردست شاعری موجود ہے۔

اونٹ کا گوشت بہت فضول اور بد ذائقہ ہوتا ہے۔ اونٹ سات جگہ سے ذبح کیا جاتا ہے اور عید کی قربانی کے لیے لوگ مل کر اسے خریدتے ہیں اور کاٹتے ہیں۔

اونٹ بار برداری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ملکیت والے اونٹ بار برداری کے لیے بہت کم استعمال کیے جاتے ہیں۔ کچھ کچھ ”مہری“ البتہ ہیں۔ اونٹوں کے ریوڑ کو ”بگ“ کہتے ہیں

مگر پہوال کی ایک حیثیت دیکھیں تو وہ ایک طرح سے بہت سکھی اور خوش ہے۔ اس لیے کہ اسے کم از کم دوسرے درجے کا انسان کوئی نہیں سمجھتا۔ دن دھاڑے، ظاہر ظاہر کوئی شخص مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا اس کی ماں بہن کی طرف برے ارادوں کے ساتھ نہیں جاتا۔ وہ بگ جت سے بہت بہتر ہے۔ جت کی جتنی تو ہر قسم کے ظلم، زبردستی اور نارروائی میں زندگی گزار رہی ہے۔ چونکہ انہیں بلوچ میں برابری کی حیثیت نصیب نہیں ہوئی ہے لہذا اُس کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک ہوتا ہے۔ جت کا جھوک ہر وقت بد عادت عورت باز مردوں سے بھرا رہتا ہے۔ کسی کی چادر کے پلو میں چینی باندھی ہوئی ہے، کوئی چائے کی پڑی لیے انتظار میں بیٹھا ہے۔ ان تحفوں سے جتنی کے دل کو رام کرنے اور اسے یار بنانے کے حیلے ہوتے ہیں۔ بوڑھے کھوسٹ بھی اپنی سفید داڑھی کو چرب بنا کر لاٹھی ٹیکتے ہوئے جتنی کی یاری کی نیت کیے اس صنم خانے کی طرف رواں ہوتے ہیں۔ یہاں منہ کالا کرنے سے نہ تو بلوچی رسم اور غیرت کسی کو روکتی ہے نہ عقیدہ کسی کو کچھ کہہ سکتا ہے۔ اور نہ ہی بگ جت کی اپنی سماجی معاشی حیثیت اس قدر مستحکم ہوتی ہے کہ دوسرے بلوچوں کی طرح پہاڑی پر چڑھے اور اپنی ماں بہن کی حفاظت کرے۔ گوہر سے لے کر آج تک کی ”جتنی“ ظلم و جور کے اتنے شعلوں میں جلتی رہی ہے کہ ان کے ذکر سے روٹ گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جت ابھی تک بلوچ نہیں بنائے گئے۔ یہ شتر بان لوگ عام بلوچ سے زیادہ فطرت کے قریب ہیں۔ بلوچوں کے ساتھ ان کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ جت کے ہر گھرانے کا اپنا سردار ہوتا ہے۔ یہ سردی گرمی اپنے اونٹوں کے لیے چراگاہ کے پیچھے گھومتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ چٹائی والی کڑی (خیمہ) ہوتی ہے، چکی ہوتی ہے، ایک آدھ برتن، اور ایک آدھ ڈانگ۔ اونٹوں کی گلہ بانی کرنے والے ”جت“ کی اپنی زندگی بھی تلخ زہر ہے۔ اونٹ جیسے بے دماغ جانور کو چرانا اور اسے سنبھالنا خود بہت مشکل کام ہے۔ اونٹ جو بدنیت ہے، بے آرام اور بد عادت جانور ہے، بھلا کہاں جھوک میں آرام سے رہتا ہے۔ نرم اور سارس جیسی اس کی ٹانگیں ٹوٹی بھی جلد ہیں، پہاڑ سے پھسل کر گرنا بھی اس کی دائمی بد بختی ہے، چور بھی اسے آرام سے لے اڑاتے ہیں، خود بھی آوارہ گردی اور

سرے پر بل کھاتا ہوا (Spiral) گڑھا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا نچلا سرا نوکدار بنایا جاتا ہے۔ اوپر سے لمبائی کے چوتھائی حصے پر ایک چپٹی لکڑی ڈال دی جاتی ہے۔ یوں یہ ایک طرح کا صلیب بن جاتا ہے!!۔ یہ سادہ بھی ہو سکتا ہے اور نقش و نگار والا بھی۔ گھٹڑ، جوان اور زندہ دل یا پھر امیر عورتیں اپنے دین پر نقش و نگار بنواتی ہیں۔ نقش و نگار والا کام مرد کرتے ہیں۔ وہ چاقو کی نوک سے لکیریں بنا بنا کر مختلف قسم کے ڈیزائن، پھول، ہرن، پرندے اور دیگر جانوروں کے نقش و نگار بناتے ہیں۔ دین اور لٹک کو خوبصورت بنانا ایک طرف تو مردوں کے جمالیاتی ذوق کی اعلیٰ سطح اور آرٹ کی استادی کی علامت ہوتی ہے، تو دوسری طرف خود عورت کے ذہنی اور سماجی سٹیٹس کا خوبصورت اظہار اور نمائش ہے۔ دین اور لٹک کے یہ نقش و نگار کبھی کبھی مست دوستوں کی نشانی یا پھر بے یاری کے عمیق غم اور بے کیف زندگی کی چغلی بھی کھاتے ہیں۔

دین سے گزارنے کے بعد پشم کے اس دھاگے سے رسی (تیل، یا، ریز) بنائی جاتی ہے۔ سفید و سیاہ والے دو رنگوں سے بنی ہوئی رسی ”کمریں“ کہلاتی ہے۔ بکری سے عموماً کالے رنگ کی رسی بنائی جاتی ہے۔ سبز و سرخ دھاگوں کے گچھے بنا کر ان پر سمندر سے حاصل کردہ سپیاں ”سٹشک اور گر“ پر و کر انہیں مزین کیا جاتا ہے۔ یہ گھوڑے کا ”ریز“ کہلاتا ہے۔ تیل کی باگ بھی اسی طرح بنائی جاتی ہے۔ اسی چیز کو تیز رفتار اونٹ ”مہری“ کی باگ کے بطور استعمال کیا جاتا ہے۔ تیل جانوروں کی بار برداری کے لیے مضبوط رسی کا کام دیتا ہے۔ ریز اور تیل دس دس بارہ سال تک چلتے ہیں۔

دین سے تیار کردہ دھاگے ”کارگاہ“ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ رنگدار دھاگہ دراصل سفید پشم کا دھاگہ ہوتا ہے۔ جسے دین میں دھاگے کی شکل دینے کے بعد اس دھاگے کو فٹبال جیسی گولائی میں پلیٹ دیا جاتا ہے۔ جسے ”ڈیر“ کہتے ہیں۔ ان سفید ڈیروں کو رنگ دینے کے لیے بڑے شہروں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ ”رگلو“ انہیں مطلوبہ رنگ میں ڈال کر باتا ہے تاکہ رنگ پکا چڑھ جائے اور وقت کا گزرنے کی شوخی کو مدہم نہ بنا سکے۔ ہم بنیادی طور پر رنگین مزاج لوگ ہیں۔ اس لیے عموماً شوخ رنگ پسند کرتے ہیں۔ جس زمانے میں سرکاری رنگ نہیں ہوا کرتے تھے تو موسم

اور انہیں چرانے والے کو ”بگ جت“ یا ”جت“۔ تقریباً ہر قبیلے میں سب سے بڑا بگ سردار کا ہے۔ اس کے بعد دو ذریعہ اور معتبروں کے بگ بھی ہیں۔

مشرقی بلوچستان کے اونٹ ویسا کھی کے میلہ میں سخی سرور میں بکتے ہیں۔ اونٹ کے پشم سے بہت مضبوط رے، بوریاں اور اس طرح کی دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اس پشم کو بلوچی میں ”ملس“ کہتے ہیں۔

8- اشیائے ضرورت کی مقامی صنعتیں

مویشی کے پشم کو ”ملخ“ کہتے ہیں۔ وہ پشم جو فروخت ہونے سے بچ جاتی ہے۔ وہ گھر کی ہمدرد مالکن کے ہاتھوں عزیز و مقدر ہو جاتی ہے۔ ایک بھیڑ سے 1.45 کلوگرام پشم دستیاب ہو جاتی ہے۔ یہ پشم تقریباً 100 فیصد سفید ہوتی ہے۔ پشم میں چربی (Grease) 0.60 فیصد ہوتی ہے۔ اس پشم کے دھاگے کا ڈایا میٹر 43.5 مائیکران اور اس کی لمبائی 5.1 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ گھر میں بچی ہوئی پشم تو بہت صاف ستھری ہوتی ہے مگر منڈی میں فروخت کرنے کے لیے پشم کے اندر صاف حصہ 63 فیصد، راکھ وغیرہ 3.3 فیصد، سبز مواد (Green Matter) 1.4 فیصد، اور دیگر ان دھلی، گندی اور ملی جلی پشم 16 فیصد ہوتی ہے۔

گھر کی ستھری پشم کو مالکن دو لمبی، پتلی لٹھیاں (لٹک) لے کر چٹائی پر بچھا کر بیٹھتی رہتی ہے جس سے وہ خوب اچھی طرح تارتا رہو کر الگ ہو جاتی ہے۔

جس پشم سے منہ یا گھوڑے کے لیے ”گندل“ بنایا جاتا ہے اسے بل دینے کی بجائے پشم بچھا دیتے ہیں اور بار بار اسے اپنے گرد لپیٹتے رہتے ہیں اور دوبارہ بچھاتے رہتے ہیں۔ سر کے سائیں کی مرضی ہوئی تو اس گندل کو گھوڑی پر ڈال دیتے ہیں تاکہ اسے سردیوں کی تباہی سے ہواؤں سے بچایا جاسکے، ورنہ سرتاج کے بیٹھنے کے لیے گدیلا یا پھر قالین کا کام لیا جاسکتا ہے۔

پشم سے دھاگہ بنانے کے عمل کو ”بریغ“ کہتے ہیں۔ اور اس کام کے لیے استعمال ہونے والے آلے کو ”دین“ کہتے ہیں۔ یہ ایک فٹ لمبی پتلی لکڑی ہوتی ہے، جس کے اوپر کے

خزائیں میں گرے ہوئے خشک پتوں کو جمع کر کے ان کے رنگ سے کام لیا جاتا تھا۔

جہاں بہت سے گھرانے اکٹھے خیمہ زن ہوں وہاں ایک آدھ گھر میں کارگاہ موجود ہوتا ہے اور اس کی کاریگر بھی ایک آدھ بوڑھی ہوتی ہے۔ یہ بوڑھیاں کارگاہ نصب کرتی ہیں، ڈپٹی ہاتھ میں لیتی ہیں اور ڈپ ڈپ کی آواز کے ساتھ اس چہار شاخہ ڈپٹی کو چلا چلا کر دری بانی کرتی رہتی ہیں۔ جو چیزیں یہ ماہر ہاتھ بنا ڈالتے ہیں ان میں ”شین“ ہے جس پر روٹی تھاپ کر تو (نافع) پر پکائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ”پچو، لوغ، دنی، ہرجین اور تیرغ“ بھی بنائے جاتے ہیں۔ اُن تمام چیزوں کا مشترکہ نام ”کتی“ ہے جو کارگاہ سے بنی جاتی ہیں۔ غلہ رکھنے والی بوری (گولغ)، پشم رکھنے کے لیے (جھول)، بھوسہ لادنے کی بڑی بوری (گنج) یہ سب چیزیں پشم اور بکری کے بالوں سے بنتی ہیں۔

مویشی کی کھال سے مشک، نیم مشک، کھلی، ہیمز، بڈگی، اپان اور زنک بنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کھال ویسے بھی مارکیٹ میں بکتی ہے۔ مویشی کی کھال کو بلوچوں کی اکثریت مختلف بیماریوں کے علاج کے طور پر بیض پر چڑھا دیتی ہے۔ جگر کی بیماریاں، کھانسی، نمونیا، ٹائیفائیڈ اور دیگر کئی سمجھ میں نہ آنے والی بیماریوں میں مختلف کھال چڑھائے جاتے ہیں۔ طبیب صاحب ہی اتھارٹی ہیں۔ چاہیں تو نیلے رنگ کی بکری کی کھال کا نسخہ تجویز کریں، چاہیں تو بھورے رنگ کی بھیڑ کی کھال چڑھا دیں۔ وہ چاہیں تو چار کھال بتا دیں یا بارہ کھالیں چڑھا دیں کا طویل Doze بتا دیں۔

بیل گائے

ایک ہی مالک کی بہت سی گائیں (گورم) رکھنے کا رواج بہت کم ہے۔ گاؤں یا دیہات میں البتہ ہر گھر کے دودھ والی گائے کو شامل کر کے گورم بنتا ہے جسے گوال چرانے لے جاتا ہے، کرائے پر۔ نصف حصے پر بھی لوگ اپنی گائے دوسروں کو چرانے کے لیے دے دیتے ہیں۔ بلوچ کی گائے بھی بس اللہ لوک ہوتی ہے۔ نہ دودھ کے لیے مشہور، اور نہ قد و قامت۔ نئی نسل، بڑے ہسپتال اور کوئی بڑے ڈیری فارم نہیں ہیں اس لیے کہ سرکار خود اپنے گناہوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسے کیا

فکر کہ عوام کو دودھ اور گوشت وافر مقدار میں ملے۔ اور وہ ایسا کرے بھی کیوں، اسے پتہ ہے کہ پیٹ بھر جائے تو دماغ زرخیز ہو جاتا ہے اور جس وقت دماغ جاگ اٹھے تو بہت سے آقاؤں کے بھاگ سو جائیں گے۔ اس لیے چرواہے کو سلا دو۔ سویا رہنے دو۔

بلوچستان کے اندر بیلوں میں بھاگ ناٹری نسل بہت مقبول ہے۔ اس نسل کو بڑھاوا دینے کے لیے جعفر آباد ضلع میں ملک کا ایک بہترین کیٹل فارم ہے۔ نیل بل چلانے ہی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اور کوئی بڑا کام نیل سے نہیں لیا جاتا۔ ایک آدھ بیل گاڑی ہے۔ سرسوں کا تیل نکالنے کہیں کہیں بیل کو لہو کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔

ٹریکٹر اور بلڈوزرز نے نیل کی آبادی کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ جس طرح موٹر سائیکل اور پک اپ نے گھڑسواری اڑادی، اسی طرح نیل کو بل چلانے، بار برداری کرانے، فصل تیار کرانے کے لیے استعمال کرنے کی بجائے انجن سے چلنے والے نیل یعنی ٹریکٹر کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ (ٹریکٹر انقلاب ہے!)۔

گھوڑے

گھوڑے بلوچستان بھر میں پالے اور رکھے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں جب جنگیں تلواروں سے لڑی جاتی تھیں، تو ہندوستان بھر میں قلات اور خضدار کے گھوڑے مشہور ہوا کرتے تھے۔ ہارس ٹریڈنگ شاید انگریزوں نے یہیں سے شروع کی تھی۔ بلوچ بہت اچھا گھڑسوار ہوتا تھا۔ سائڈ کے گھوڑے ڈومب اور مراٹی رکھتے ہیں۔ شادیوں، میلوں میں گھڑ دوڑ محبوب کھیل ہوا کرتا تھا۔ چاکر و گوئہرام کی تباہی سے لے کر ٹریکٹر و موٹر سائیکل کے آنے تک کا درمیانی عہد گھوڑے اور گھوڑو (جنگی دستہ) کا عہد تھا۔

مویشی بانی سے وابستہ مقامی صنعتیں

بلوچستان بھر میں، بالعموم اور مشرقی بلوچستان میں بالخصوص کال بنانے کا رواج عام تھا۔ کال جو دراصل سوڈا کاربونیٹ ہے جو کہ Salsola Griffithii نامی جھاڑی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس جھاڑی کو دسمبر اور جنوری میں کاٹتے ہیں، خشک کرتے ہیں پھر اسے زمین میں سوراخ کر

9- ٹیکس اور امداد باہمی

سر قبیلوی نظام ہر استحصالی معاشی نظام کی طرح اپنے اندر چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں پیدا کر کے اپنے لوٹ کو دوام بخشنے میں ایک مہارت والا نظام ہے۔ ٹیکس تو بڑی لوٹ کا محض ایک حصہ ہیں۔ اس لیے یہ کبھی شرح میں کم ہوتے رہے ہیں، کبھی زیادہ..... اور پوری انسانی تاریخ میں، متبادل پیدا کیے بنا کبھی بھی کوئی ٹیکس یکسر ختم نہیں کیا گیا۔

گھال

قبیلہ کی ساری مال چرائی کے حقوق سردار کے پاس تھے اور ہر قبائلی ٹیکس یعنی گھال دے کر اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس ٹیکس کی شرح یہ تھی؛ ہر چالیس مویشیوں پر مشتمل ریوڑ پر چار کلاہ (چاندی والے روپے) سال میں دینے پڑتے تھے جو کہ اندازاً دو دہے بنتے تھے۔ نہ دینے کی صورت میں جیل بھیج دیا جاتا تھا جہاں پر رسوائے زمانہ سزا یعنی ”کاٹ“ کی سزا دی جاتی تھی۔ دروغ گوئی کرنے والے یعنی مویشی کی تعداد کم ظاہر کرنے والوں کو مارا پیٹا جاتا تھا۔

گھال وصول کرنے والے کارندے سردار کے اپنے گھرانے کے افراد ہوا کرتے تھے۔ وہ اس ڈیوٹی کی تنخواہ وصول کرتے تھے۔ ان کا اثر و رسوخ بہت ہوتا تھا۔ وہ قبائلی معاملات میں سردار کے مفاد میں مداخلت کرتے تھے۔ اور اس طرح سردار کے ریاستی ڈھانچے میں اہم مقام رکھتے تھے۔ وہ اپنی ماتحتی میں اور لوگ بھی تنخواہ پر رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ رضا کاروں کا ایک گروپ بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ جو مقامی لوگوں پر مشتمل ہوتا تھا اور اس طرح کوئی شخص گھال دینے سے بچ نہیں پاتا تھا۔ یہ لوگ گروہ کی صورت میں جا کر گھال وصول کرتے تھے۔ ان سب کو بھی کھانا، ان کی گھوڑیوں کو غلہ کھانا بھی گھال دینے والے (ٹیکس گزار) کے ذمے ہوتا تھا۔

تنڈیں

یہ چنگی کا محصول ہوا کرتا تھا۔ ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں جائیں تو اس صورت میں تنڈیں دینا پڑتا تھا۔

کے جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ راکھ کو آٹھ دن تک زمین میں دبائے رکھتے ہیں جس کے بعد اسے ٹھوس صورت میں نکالتے ہیں۔ یہ مارکیٹ میں بکتا تھا۔ لانٹریں یعنی Suoeda Fruticose سے نکالا ہوا کال، گھٹیا کوالٹی کا ہوتا ہے۔ انگریز کے وقت ہزاروں من کال بنتا تھا اور ریل کے ذریعے دوسری جگہوں میں بکتا تھا۔ (7)

کشیدہ کاری کرنے والوں کی شہری مراکز تجارت تک چونکہ رسائی نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تیار کی ہوئی چیزوں کو دلال اکثر اونے پونے داموں خریدتے تھے۔ یا شہروں کے درزی اور پیرہن دوز انہیں حاصل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں دستکاریوں کا مرکز صنعت و زراعت اقتصادیات، خرید و فروخت کی تبدیلی اور نرخوں کی پستی بلندی کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔

کشیدہ کاری کے علاوہ بلوچوں میں سکہ دوزی کی آرائش بھی مروج ہے۔ اس کے ذریعے گھر کی آرائش کے لیے اور اونٹوں کے منتقل جھول بنائے جاتے ہیں۔ اور اس غرض کے لیے پہلے مناسب کپڑے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر اس پر زرکاری، صدف ٹانگنے اور مصنوعی موتی، منکے اور شیشے لیے جاتے ہیں۔ ایسے کپڑوں کے کناروں اور حاشیوں میں ان کے گچھے آویزاں کیے جاتے ہیں جس سے سکہ دوزی کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔

بلوچ خواتین اون کات کر اپنے گھروں میں بچھانے کے لیے فرش و گیم تیار کرتی ہیں۔ چٹائی نہ صرف بچھانے کے لیے بلکہ کھجور کی فصل کو محفوظ کرنے اور اس سلسلے کے دیگر کام بھی چٹائی سے لیے جاتے ہیں۔ سیدتان اور مکران والے بلوچستان میں، چٹائی بنانے کے لیے کھجور کے پتوں کو سکھا کر تیار کرتے ہیں۔ مگر بقیہ بلوچستان میں پیش (مزی) سے چٹائی بنی جاتی ہے۔ نازک ریشوں سے گلدان، کھجور رکھنے کی ٹوکریاں، روٹیاں رکھنے کی چنگیر اور دستی پتکے بناتے ہیں۔ یہ چھپر کے طور پر سایہ کے لیے، کچے مکانون کے چھت میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (8)

مٹی کے برتن بنانے کی صنعت کے ظہور کی قدیم تاریخ قبل مسیح کی ہے۔ مہرگڑھ تو گویا مٹی کے برتنوں کا بڑا کارخانہ تھا۔ ایرانی بلوچستان میں چھ ہزار سال قبل مسیح میں مٹی کے برتن پکانے کی بھٹیوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہی حال مہرگڑھ کا تھا۔

سنگ

”پیش“ ایسا پودا ہے جو چٹائی بنانے کے کام آتا ہے۔ ”میٹ“ (گاچی) صابن کے بطور استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں قبیلے کی ضروریات سے زائد پیدا ہوتی تھیں۔ جت انہیں اونٹوں کے ذریعے مارکیٹ تک لے جاتے تھے اور وہاں بیچتے تھے۔ ایک اونٹ کے لوڈ پر سردار کے چار آنے ہوتے تھے۔ بگٹی میں ایک اونٹ لوڈ اناج درآمد کرنے پر ایک کاسہ (13 سیر) (نوٹکی میں پانچ سیر)، نمک کے اونٹ پر ایک کاسہ، لٹم، چینی اور تیل وغیرہ پر ایک اونٹ پر ایک روپیہ۔ ایک بھیڑیا بکری کی درآمد پر، یا بگٹی علاقہ میں سے گزرنے پر ایک آنہ ٹیکس تھا۔ آٹھ آنے فی تیل پر اور ایک روپیہ فی اونٹ پر۔ قافلوں کی بحفاظت گزر پر ٹیکس اناج کے ایک اونٹ پر ایک چار آنہ اور لٹم کے اونٹ پر آٹھ آنے (اس میں بچیس فیصد سردار کا ہوتا تھا اور باقی ان قبائل کا تھا جو محافظ تھے۔ (9)

مری علاقے میں سب اور تل کے درمیان تجارت پر مری سردار ٹول ٹیکس لیتا تھا، گمبولی کے مقام پر ریٹ یہ تھے؛ اونٹ ایک روپیہ آٹھ آنے، گھوڑا ایک روپیہ، تیل بارہ آنے، گدھا چھ آنے۔

دھڑ

یہ ٹیکس وڈیرہ لیتا تھا دکانداروں سے۔ غلے کا چالیسواں حصہ۔ اونٹ کے بار پر ڈیڑھ روپیہ آنے، اور ڈیڑھ روپیہ جانے کا لیا جاتا تھا۔

مالیہ

1947 سے قبل بلوچستان میں زرعی زمین دو طرح کی ہوتی تھی؛ مالیہ وہ اور غیر مالیہ وہ۔ مالیہ وہ اراضیات وہ تھیں جو سرکاری قلات کی ملکیت ہوتی تھیں۔ حکومت قلات کاریزوں پر کلنگ وصول کرتی تھی۔

زر سر، زر شاہ اور زرِ تدرنی

یہ خوانین قلات کے ٹیکس تھے جو کمران میں مروج تھے۔ 1938 میں قلات نیشنل پارٹی کی تحریک پر یہ ٹیکس منسوخ کر دیے گئے۔

ڈھک

کسی کے کھیت میں اگر کسی کا مولیشی گھس جاتا تو اسے سردار کے مقرر کردہ ایک احاطے میں بند کر دیا جاتا تھا جسے ڈھک (کانچی ہاؤس) کہتے تھے۔ مالک پیسے دے کر اپنا مولیشی وہاں سے چھڑاتا تھا یہ پیسے سردار کے ہوتے تھے۔

نال پرورش

ایک اور ٹیکس ہوا کرتا تھا۔

پنچک

بہادر شخص کو جو کہ کمانڈر کے عہدے تک پہنچ جاتا اسے جنگی مال غنیمت کا پانچواں حصہ دیا جاتا تھا۔ مری میں بجا رانی کا وڈیرہ نوح اور دلیل سومرانی چٹک لیتے رہے۔

مرگ ٹیکس

محترم عزیز بگٹی نے لکھا کہ جب بیورغ بگٹی قبیلے کا سردار بنا تو اس نے ایک موت ٹیکس لگا دیا۔ یعنی کسی بھی مرنے والے شخص کو دفن کرنے سے پہلے ایک چونی بطور ٹیکس سردار کو دینا پڑتا تھا۔ کم از کم اس ٹیکس کی چوری ممکن نہ تھی اس لیے کہ کم آبادی والے قبیلے میں فوتیگی بڑی بات ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بے کس اور غریب عورت کا اکلوتا بیٹا مر گیا اور اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی تک نہ تھی، بیٹا کیسے دفن کی جاسکتی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نوحہ ان الفاظ میں کیا جو بیورغ کے دورِ سرداری کی دھائی بھی تھی؛

کس مہمرا بیورغہ بذیں باری آ

(خدا کرے بیورغ کے برے دور باری میں کسی کی موت واقع نہ ہو)

عزیز بگٹی لکھتا ہے کہ آج تک بیورغ ”بذیں بیورغ“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ داصل

بیورغ اول تھا۔ بیورغ دوم کو ”بیورغ زونگ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (10)

ریز

جنگ میں دشمن کے ہتھیار وغیرہ موثر کرنے کی کرامت والے شخص کو اس کی کرامت کے

6۔ باؤلرگزڈن ٹی۔ دی پیپل آف ایشیا۔ 1977ء، ولپیڈ اینڈنگلسن لندن، صفحہ 93

7۔ سبی گزٹیر، صفحہ نمبر 148

8۔ ناصر عسکری/غوث بخش صابر، سیستان و بلوچستان، 1996ء بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ نمبر 38

9۔ سبی گزٹیر۔ صفحہ 304

10۔ بگٹی، عزیز۔ بگٹی قبیلہ۔ 2005ء۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 101

11۔ میسن، چارلس۔ Narratives of various journeys in Afghanistan،

Balochistan، Kalat۔ جلد چہارم۔ 1977ء۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ 425

عوض آوار یعنی مال غنیمت سے ایک جانور (نیل، گائے، اونٹ) دیا جاتا تھا۔ قبائلی سماج کی بھی اپنی اور دلچسپ مانگھا لوجی ہوتی ہے۔ ہمارا یہ ریز بردار تیغ بند بزرگ انگریز کی بندوقیں اور توپ نہ روک سکے۔ بہانہ فوراً یہ بنایا کہ انگیز سورکھانے والے تھے، جن پر دم چھو کام نہیں کر سکتا۔ (11)

بجار، پوڑی

یہ ٹیکس نہیں ہیں بلکہ امداد باہمی کے ذرائع ہیں۔ ان میں فرق یہ ہے کہ پوڑی ایک غیر معمولی مصیبت، ناگہانی آفت اور واقعہ کے سلسلے میں مالی امداد ہوتی ہے۔ یہاں ضرورت مند کو امداد حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں جانا پڑتا ہے۔ جبکہ بجار والی امداد قبیلے کے لوگ خود لاتے ہیں۔ یہ عام روٹین اور معمول کی امداد ہوتی ہے، جو معاشرے میں عام رواج کے مطابق جاری و ساری رہتی ہے۔

گوکہ پوڑی بھی غیر رواجی بات نہیں ہوتی لیکن اسے اتنا اچھا فعل نہیں سمجھتا جاتا۔ بہت مجبوری میں ایک شریف انسان امداد کی اپیل کے ساتھ لوگوں کے گھروں کا رخ کرتا ہے۔

وس پنڈ

یہ بھی امداد باہمی کا زبردست ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ ایسی ناگمان حالت جو ایک فرد کی پہنچ سے باہر ہوتی تو لوگ اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس کی مدد کرتے۔ مثلاً شادی کا خرچہ، خون بہا ادا کرنا، تباہی یا جرمانہ وغیرہ۔

حوالہ جات

1۔ سٹڈیز ان براہوئی، صفحہ نمبر 71

2۔ لائیو سٹاک سینس رپورٹ 1985

3۔ چاغی ڈسٹرکٹ پروفائل، صفحہ نمبر 41

4۔ ڈسٹرکٹ پروفائل، پشین، صفحہ نمبر 37

5۔ پیہرن..... صفحہ 41

تیسرا باب

بلوچ زراعت

بار پھر بلوچ مدنیت کاری کوتا خست و تاراج کر دیا۔ اور ایک بار پھر بلوچوں کو خانہ بدوشی اور مالداری والا نظام اپنانا پڑا۔ بلوچوں کے ساتھ معاشی ارتقا کی پوری تاریخ میں یہ مذاق بار بار کیا گیا۔ ہماری پیداواری قوتوں کی ہر ترقی کو جنگوں اور فتوحات نے پسپا کر دیا۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم سر قبیلوی نظام کے حوالے ہو گئے۔

جیسے کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ابتدائی قبائلی دور میں سردار کا منصب قبیلے کی رضا مندی پہ منحصر ہوتا تھا۔ اور گو کہ سردار کسی خاص انتخابی عمل سے نہیں گزرتا تھا مگر سردار بننے میں قبیلہ کی ایک طرح کی منظوری ضرور شامل ہوا کرتی تھی۔ غیر موزوں شخص پر عدم اعتماد بھی ہوتا تھا مگر اس کی جگہ پھر کوشش ہوتی تھی کہ اسی کے خاندان میں سے کوئی دوسرا مناسب شخص مل جائے۔

چونکہ جدل و جنگ ہی سیاست و ثقافت ہوتی تھی اس لیے اس معاشی پیداوار کے ذریعے کو دوام بخشنے کا اہل فرد ہی سردار بن سکتا تھا۔ داخلہ و خارجہ پالیسیاں اسی فریم ورک میں بنتی بگڑتی تھیں۔ رسم و رواج، اچھائی برائی، سب کچھ اسی گز سے ناپی جاتی تھیں۔ سردار کے اختیارات، اس کی قوت کی کمی بیشی بھی جنگی صورتحال کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ ادب، شاعری، آرٹ، فلسفہ، نظریہ اور فکر سب کچھ فتوحات کو یقینی بنانے کی طرف متوجہ تھے۔ ہمارا سماجی اور انتظامی ڈھانچہ اسی لپکنے اور جھپٹنے کی مطابقت میں استوار تھا۔ ہماری یہی قبیلوی تشکیلات جو کہ جنگی اصول پر شروع ہوئی تھیں، بعد میں حاکم گروہ کی تقویت کا باعث بنیں۔ اس گروہ کا سیاسی اور اقتصادی اقتدار بڑھتا رہا اور وہ مرکزیت پاتا رہا۔ جس کی وجہ سے ان کے مویشیوں کے ریوڑ بڑھتے رہے اور غلاموں اور قبضہ میں آئے ہوئے لوگوں پر ان کا استحصال بڑھتا رہا۔ دولت مند ہوتے ہوئے سردار بہترین اور وسیع چراگا ہوں کو اپنے قبضے میں لیتے رہے۔ رفتہ رفتہ قبیلوں کی چھوٹی شاخوں کی زمینوں کا ایک حصہ عملاً فیوڈل کی ملکیت بن گیا۔

خانہ بدوش فرقوں کی چراگا ہوں کے ساتھ بھی یہی کارروائی ہوتی رہی۔ بہت اچھی اور پانی کے لحاظ سے فراواں چراگا ہوں خود بخود سردار کے حصے میں جاتیں اور ان چراگا ہوں پر بے چارے خانہ بدوش ان سرداروں کے چرواہے بن کر ان کی بھیڑ بکریاں چرانے لگتے تھے۔

زراعت انسانی تاریخ میں پہلا عظیم انقلاب تھا۔ اس کے نتیجے میں اولین زائد خوراک دستیاب ہوئی اور شہر اور تمدن وجود میں آئے۔ اناج کو زندگی کا خمیر بنا کر، انسان ورائٹی کی تعداد بڑھاتا رہا اور انہیں اپنے علاقے کی زمین اور ماحول کے مطابق ڈھالتا رہا۔ ہم زمین پر دوسری مخلوق کی طرح ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا سب سے بڑا روزانہ کا مسئلہ بھی اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ اور جب زمین کم سخی ہو اور پانی کم ہو، تو ہم زندہ رہنے کے لیے زمین سے زیادہ کچھ نچوڑ نکالنے کی حیرت انگیز کاوشوں کے اہل ہیں۔

آج ترقی یافتہ صنعتی دور میں بھی انسانوں کا نصف زمین پر کام کرتا ہے۔ اور ان کا تین چوتھائی اپنے ہاتھوں سے۔

گیارہ ہزار سال قبل کی مہر گڑھ زراعت کے بارے میں ہم پچھلے ابواب میں بات کر چکے ہیں۔ جو دنیا کی اولین کھیتی باڑی تھی۔ اب تو ہم چودھویں پندرھویں صدی کی بات کریں گے۔ بلوچستان میں سب سے لے کر گندواہ تک کے چاکرو گو تھرام کے فیوڈل نظام نے ایک

بجارا نڈیں:

1- پوادی اور کنگرا نڈیں..... ایک حصہ

2- شاہچہ اور کلو نڈیں..... ایک حصہ

3- کلندر نڈیں، سالار نڈیں، سومرا نڈیں، پیرداد نڈیں اور رامکا نڈیں..... تین حصے

پندرہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک بلوچ سماج ایک ایسی تبدیلی سے گزرا جس میں کہ زراعت قبائلی مشترک صورت کے بجائے شخصی ملکیت میں چلی گئی اور قبیلوں کے حاکم لوگ فیوڈل لارڈز میں ڈھل گئے۔ بلوچ قبیلوں کی آبادکاری کا عمل سولہویں صدی کے آخر تک مکمل ہوا اور زرعی معیشت متشکل ہونے لگی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خانہ بدوشی مشینی انداز میں مکمل طور پر ختم ہوئی۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ زمین پر آباد ہونے والوں میں بھی، اور مالداروں میں مشغول بلوچوں میں بھی، خانہ بدوشی جاری تھی۔

قلاں میں تیرہویں صدی کے وسط تک مغلوں کے نائب حکومت چلاتے رہے۔ 1666 میں میرواڑی قبیلے کے فیوڈل ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے گیر بن تباہ کر کے قلاں پر قابض ہو گئے۔ اس قبیلے کے بڑے فیوڈل (میر احمد) نے اقتدار سنبھال لیا اور یہاں احمدزیوں کی حکومت قائم کی۔

میر احمد ثانی (1629-1637) نے زراعت کو ترقی دینے میں خصوصی دلچسپی لی۔ اس نے قلاں میں کاریزات کو ترقی دی۔ خضدار کی ندی سے کئی اور نالے نکال کر پانی کو بنجر زمینوں تک پہنچایا۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں موضع کوہنگ قلاں میں کاریز ملاورد، کاریز یوسف اور کاریز عثمان کھدوائے۔

اسی خان کے دور حکومت میں خشکابہ اراضیات کے حق مالکانہ پر مالک اور کاشتکاروں کے درمیان ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ اراضی کی آمدن سے فیوڈل کو کتنا حصہ ملے اور کسان کو کتنا۔ سرداروں کے ساتھ مل کر بلوچوں کے اس بڑے خان نے خشکابہ بندات کی آبادکاری کے چھ حصے مقرر کر دیے۔ ایک حصہ آب، ایک حصہ دیکھ بحال، ایک حصہ بند، ایک حصہ تخم، ایک حصہ ہل، ایک گمرانی اور ایک حصہ حق

خانہ دوش سردار (فیوڈل) کے اقتدار کی مضبوطی کے سبب ایسے حالات پیدا ہوئے کہ چھوٹے ٹالنے مجبور ہوئے کہ اپنے دائمی جھگڑوں کے حالات میں بڑے قبیلوں کی پناہ میں جائیں۔ میزبان قبیلہ ایسے ٹالنے پر شرائط لگا کر اپنی حمایت عطا کرتا تھا، اور شرائط یہ ہوتی تھیں؛ مویشیوں پہ ٹیکس اور محصول ادا کرنا، بیگاری مختلف شکلوں میں حصہ لینا، سردار کی طرف سے منظم کردہ حملوں اور جنگوں میں شرکت کرنا۔

مشرقی بلوچستان میں لوگ جن زمینوں پر قبضہ کرتے وہ پہلے سے آباد ہوا کرتی تھیں۔ وہ سابقہ مالکان کو بھگا دیتے یا قتل کر دیتے اور یا پھر غلام بنا لیتے۔ قبضہ کردہ اس زمین کو وہ قبیلوں اور پھر قبیلوں کے فرقوں کے گھرانوں کے درمیان تقسیم کرتے تھے۔ ہم یہاں مری قبیلے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جس کی قبضہ کردہ زمینیں مندرجہ ذیل طریقے پر تقسیم ہوتی تھیں؛

چیف کا بچک (پانچواں حصہ) پہلے الگ کر دیا جاتا تھا۔ باقی کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یعنی گزینی، لوہارانی اور بجارانی میں۔ ہر ایک کو ’سیک‘ 1/3 حصہ کہا جاتا تھا۔ پھر ہر سیک کی اندرونی تقسیم یوں ہوتی تھی؛

گزینی:

1- ٹینگیا نڈیں، بڈا نڈیں..... ایک حصہ

2- مہند نڈیں، چلگری اور ڈنگ..... ایک حصہ

3- لانگھا نڈیں، عالیا نڈیں اور مزار نڈیں..... ایک حصہ

4- نوذ بند غا نڈیں، چوری، مہکا نڈیں اور لوڑی کش..... ایک حصہ

5- بھاولا نڈی، مرگیا نڈیں، عیسفا نڈیں اور جروار..... ایک حصہ

لوہارا نڈیں:

1- مہند نڈیں، جنگو نڈیں..... ایک حصہ

2- شمبو نڈیں..... ایک حصہ

3- سارنگا نڈیں، جندوا نڈیں، درکا نڈیں اور میلوہڑ..... دو حصے

بنیاد پر اناج کی تقسیم (بائی) ہوتی تھی۔ جہاں بڑے بڑے حصے تو حاکم لوگوں مالکوں اور کاشتکار کے ہوتے تھے مگر آبپاشی کے خرچ کا حصہ ریونیو حکام کا حصہ اور گاؤں کے سپیشلسٹوں کا حصہ بھی الگ کیا جاتا تھا۔ حاکم لوگ فصل میں سے اپنا حصہ پہلے لیتے تھے۔ اس طرح انتظامیہ اور آبپاشی کا خرچہ گاؤں والوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

کچھی ہی نے خانی کو قبائلی کی بہ نسبت ایک فیوڈل سلطنت کی طرف دھکیلنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

دراصل 17 صدی کے آخری نصف سے جب بلوچوں کے میر قمر کی اولاد سے میر احمد خان نے کنفیڈریسی کی بنیاد رکھی تھی تو بلوچ سماج میں ایک سیاسی تشخص وجود میں آ گیا تھا۔ اس طرح قبیلوی ارسٹوکریسی کے عنصر نے بڑھنا شروع کر دیا۔ قبیلوی نام نہاد ڈیموکریسی کمزور ہوتی گئی اور اس کی جگہ پر سرداری نظام مستحکم ہوتا گیا۔ بلوچ سماج میں فیوڈل نظام کی عظیم الشان بلوغت نے سارے بلوچ عوام کو ناترستی کے ساتھ دولت پیدا کرنے پر لگا دیا۔ میر احمد خان کے نواسے میر نصیر خان کو سرمایہ کے اسی ارتکاز نے زبردست حاکم بنوایا۔ اسی دولت اور سرمایہ پر ایسی ہی فیوڈل ریاست ابھرنی تھی۔ اس نے احمد شاہ کے ساتھ مل کر ہندوستان فتح کر لیا اور بلوچستان کو خوب ترقی دی۔

خانی کے عہد میں (1666-1840) قلات ایک شورش زدہ خطے اور ہند پے در پے فتوحات کے ذریعے مہاجر کردہ لوگوں کے لیے جائے پناہ کی حیثیت والے ملک سے ترقی کر کے ایک موثر آزاد خانی سلطنت میں ڈھل گیا۔ اس عبور میں ایک ایسی مقامی ارسٹوکریسی شامل تھی جس کی معاشی بنیاد بڑھتی ہوئی زراعت تھی مگر جس کے نمایاں ہونے کے ذرائع قبائلی طور پر منظم کردہ خانہ بدوش مویشی بانی پر مبنی تھے۔ اس دور میں خانوں اور سرداروں کے درمیان رشتہ بہت ہی ڈھیلا ڈھالا اور کمزور تھا۔

نصیر خان کی حکمرانی دراصل ایک فیوڈل انقلاب کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ عہد بہت شاندار تو تھا مگر ایک پڑھے لکھے جہان دیدہ اور عوام کے نبض شناس خان کی طرف سے مکمل فیوڈل طریقے سے شاندار تھا۔ نصیر خان نوری کی حکمرانی بلوچ معاشرے کی قبائلی تنظیم کی چوٹی پر کھڑی تھی

مالکانہ۔ چونکہ بندات کی کاشت میں پانی دینا، بندوں کی دیکھ بھال، تخم ریزی، ہل چلانا اور فصل کی نگرانی یہ سارے پانچوں کام کسان کے تھے، اس لیے پانچ حصے اس کے تھے اور مالک مفت میں ایک حصہ لیتا تھا جسے انہوں نے حق مالکانہ قرار دیا تھا۔ اسی کو بدنام زمانہ ”ششک“ کہتے ہیں۔

اٹھارویں صدی تک بلوچ قبیلوی شکل کی چوکھاٹ میں ایک طبقاتی فیوڈل معاشرے میں ڈھل گیا جہاں اپنے چیف کی عظمت و شان کی خاطر ہزاروں لوگ دیہی مزدور بن گئے تاکہ زائد پیداوار کر سکیں۔ ایک قبائلی فرقہ پورے قبیلے کیلئے ہمیشہ سردار مہیا کرتے رہنے کا گھرانہ بن گیا۔ اس فرقے کا ایک شخص تو سردار ہوتا ہی تھا مگر اس کے عزیز واقارب اور فرقے کے دیگر ممبر بھی حکمران ہوتے تھے۔ وہ سردار کے لیے ٹیکس، عطیات اور ریونیو اکٹھا کرتے تھے۔ اس طرح انتظامی بالائی ڈھانچے کی اجارہ داری بن گئی۔ اسی انتظامی بالائی ڈھانچے نے قبائلی طرز پیداوار سے فیوڈل نظام پیداوار کی طرف عبور کی نگرانی کی۔ گوکہ عبور کی یہ رفتار بہت سست تھی۔

اٹھارویں صدی کے پہلے حصے میں نادر شاہ اور پھر احمد شاہ نے بلوچستان پر (اور یا بلوچستان میں سے ہو کر) کئی مہمات سر کیں، جن کے نتیجے میں دور دور تک ان کی سلطنت قائم ہوئی۔ 1740 میں کچھی اور سیوی کا پانچ ہزار میل کا علاقہ قلات کا ہو گیا۔ یہ گویا ایک انقلاب تھا۔ زرعی اجناس کی صورت میں قلات کو زبردست آمدن حاصل ہوتی رہی اور خانی بہت مضبوط ہوتی گئی۔ کچھی میں دریاؤں پر بند باندھ لیے جاتے تھے جبکہ خود قلات میں سیلابی نالوں کے علاوہ کاریز آبپاشی کے بڑے ذرائع تھے۔

کچھی میں کئی فصلیں کاشت ہوتی تھیں۔ کپاس، دالیں اور تیل کا بیج سیلابی زمینوں پر کاشت ہوتے تھے۔ جبکہ کپاس، نیل، گندم، جوار اور میوہ و سبزیاں محدود مستقل پانی والے علاقوں میں ہوتی تھیں۔ تقسیم کار اور تقسیم پیداوار بہت پیچیدہ اور مختلف ہوا کرتی تھی۔ عموماً کسان بیج بھی دیتا تھا ایک بیل کا جوڑا بھی اور جانوروں کی غذا بھی۔ فصل کی پیداوار تین حصوں میں یعنی فرمانروا، زمین کے مالک اور کسان میں تقسیم ہوتی تھی۔

اس محنت طلب نظام آبپاشی نے ہر گاؤں کو ایک اجتماعی پیداواری یونٹ بنا دیا تھا۔ اس کی

جس میں زرعی غلامی (سرف) اور منقولہ جائیداد کی طرح منقولہ غلامی پہلے ہی سے مروج تھیں۔ نصیر خان کی فتوحات نے بلوچستان میں غلامی کی دوسری شکلیں بھی متعارف کرا دیں۔

غلامی پورے بلوچستان میں عام تھی اور کوئی بھی ایسا قابل ذکر خاندان نہ تھا جس کے پاس غلام مرد یا عورت نہ ہو۔ یہ غلام عام طور پر شیدی یا نیکرو ہوتے تھے جنہیں ساحلی شہر کراچی سے خریدا جاتا تھا۔

میر نصیر خان اجناس کی پیداوار کو وسعت دینے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ کپاس، نیل اور گھی کی پیداوار خوب بڑھی۔ وہ خود بھی قندہار اور ہندوستان سے مختلف فصلوں اور درختوں کے بیج اور نہال جمع کر کے لاتا رہتا تھا۔ اس کے پچاس سالہ دور حکومت میں تجارت کو زبردست فروغ ملا۔ بحر ہند کی کئی بندرگاہیں اور تجارتی راہیں قلات اور وہاں سے قندہار تک کھلیں۔ گویا ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان قلات کی حیثیت ایک تجارتی مرکز کی ہو گئی تھی۔ سومنیانی کی بندرگاہ ایک تجارتی و صنعتی مرکز بن گئی۔ خصوصاً کپڑے اور قالین کی پیداوار میں۔ گھوڑے بمبئی کو برآمد کیے جاتے تھے۔ رنگ کا سامان اور چمڑے کا سامان مسقط پر آتے تھے۔ ہندو تاجر کاروانوں کی شکل میں تجارت کرتے تھے۔ چیزوں سے قیمت فروخت کا 0.5 فیصد کے حساب سے چنگی لیا جاتا تھا۔ شاہراہیں استعمال کرنے پر کاروانوں سے پانچ روپیہ فی اونٹ کے حساب سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔

بلوچوں نے ایک ترقی یافتہ زرعی کلچر قائم کر رکھا تھا۔ نیز پڑوسی سندھ و پنجاب کے علاقوں میں بھی زراعت اچھی خاصی ترقی یافتہ تھی۔ یہ ترقی یافتہ زرعی کلچر بلوچستان کے بلوچوں کی اجتماعی معیشت کی تیز رفتار ترقی اور ان میں فیوڈلزم کے فروغ کے پرائسز میں تیز رفتاری کا باعث بنا۔ میدانوں علاقوں میں آباد بلوچ قبائل رفتہ رفتہ اپنی قبائلی خصوصیات کھو بیٹھے۔ یہاں طاقتور سرداروں نے اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کو عملاً کسان غلام بنا کر رکھ دیا۔ وہ یوں کہ:

1- سردار کا گھریا و طاق کمانڈر انچیف کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

2- وہ قبائلی جھگڑوں کی منصفی بھی کرتا تھا۔ اقوام متحدہ کا کام۔

3- وہ چیف جسٹس بھی تھا۔ جج بن کر وہ تنازعات کے فیصلے کرتا تھا۔

ان تین عہدوں نے اور بھی بے شمار عہدے اُس کے ہاتھ میں مرکوز کر دیے:

4- قبیلے کے اجتماعات کا بندوبست وہی کرتا تھا۔ ان کی بورڈنگ اور لاجنگ، ان کے

خور و نوش کے بندوبست کا انچارج سردار ہی تھا۔

5- قبیلے کے مہمان خانہ کے اخراجات کے نام پر قبیلہ کے افراد اُسے ٹیکس یا مالداد دیتے تھے۔

6- قبیلے کی وزارت خزانہ کا قلمدان بھی اسی کے پاس تھا۔ مال مویشی، آٹا، غلہ، بار

برداری کے جانور، بہترین گھوڑے اور لہذا بہترین اسلحہ اسے ملنے لگا۔

چونکہ ”جنگی ادارہ“ اور مختلف النوع فرائض ادا کرنے والا ”سردار کا ادارہ“ ایک مستقل

حیثیت کا حامل بن چکا تھا، اس لیے رفتہ رفتہ رضا کارانہ چندہ ٹیکس کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ یہ

ٹیکس باقاعدہ بنتا گیا۔ البتہ ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہنگامی چندے کی گنجائش برقرار

رکھی گئی۔ چونکہ یہ سارا عمل جبری نہ تھا اور قبائل کی مشترکہ ضرورت کا نتیجہ تھا اس لیے یہ سارا چندہ

رضا کارانہ بنیادوں پر عوام نے خود تجویز اور قبول کیا۔ سردار کے مذکورہ بالا اخراجات خصوصاً آناج کی

ضرورت پوری کرنے کے لیے علاقے میں زرخیز ترین زمین کا ایک ٹکڑا سردار کے عہدے کے ساتھ

مستقل طور پر مخصوص کیا گیا۔ سردار بہ لحاظ عہدہ اس کا مالک ہوا کرتا تھا۔ یہ زمین اس کے بھائیوں

اور بیٹوں میں تقسیم ہونے کے لیے نہ تھی بلکہ آٹو مینک طور پر سرداری کے عہدے کے ساتھ منتقل ہوا

کرتی تھی۔ یہ تاج کی زمین (پاغ کی زمین) سرداری دستار کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی۔ یہ

رضا کاری پہلے پہل نیم رضا میں تبدیل ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ سردار کا عہدہ موروثی بنا اور لہذا ”پاغ

کی زمین“ بھی موروثی بنی۔ چندہ (بجاری، پوڑی، گھال، سنگ، تھڑی وغیرہ وغیرہ) مکمل طور پر ٹیکس

میں بدل گئے۔ سردار کے اختیارات بڑھتے گئے۔ وہ قبیلے سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل

کرنے لگا۔ عمدہ گھوڑے، قیمتی قالین اور بہترین ہتھیار اور لباس خرید لیے۔ اپنی حویلی بنوائی۔ مویشی

اور اراضی کی صورت میں مختلف مراعات حاصل کر کے اس طبقے نے اپنی اقتصادی قوت خوب

بڑھائی۔..... اور سردار مکمل طور پر ایک فیوڈل میں بدلتا چلا گیا۔

عمومی طور پر بلوچ آبپاشی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1-(لُآف) بارانی علاقہ

2-(سیاہ آف) پانی والا علاقہ

1-لُآف

بانٹ دی۔ ہمیشہ کے لیے تقسیم کرنے کو ”بوٹا ترؤ“ کہتے ہیں۔ سرکار کا خیال تھا کہ اس طرح سردار کا اثر و رسوخ گھٹ جائے گا۔ معتبروں کو یہ فائدہ ہوا کہ عام میلے کچیلے مری کی زمینیں پیسے، زور اور دغا سے اپنی بنالیں گے، اس لیے کہ اکڑ خانی انہیں کسی اور طور نصیب نہیں ہوتی تھی۔ لیکن عوام کو Bi Product کے طور پر فائدہ ہوا کہ پاک اور مقدس نجی ملکیت پہلی بار اچھی طرح طلوع ہو گئی۔ ”بوٹا ترؤ“ سے قبل کی تقسیم اس عہد کو ظاہر کرتی ہے جب لوگ خانہ بدوش اور پادندہ گیری کی زندگی سے ہٹ کر ”نیم آباد“ زندگی کو منتخب کرتے ہیں۔

قدیم اشتراکی نظام ایک زبردست عہد تھا لیکن زمین کی مکمل اور ابدی تقسیم زراعت کی طرف زیادہ پراگریسو، زیادہ تیز رفتار اور زیادہ حسین زمانہ ہے۔ یہ دونوں عہد دنیا کے تقریباً ہر سماج پر آئے ہیں اور پھر ہر سماج جھپٹ کر ترقی کے راستے پر روانہ ہوا۔ یہ زمانہ نئی اچھائی اور نیکیوں کا مانگنے والا تھا۔ اس زمانے میں ماضی کے عہد کی کچھ پرانی اچھائیاں، برائیاں بن گئیں۔ بہادری، غیرت اور قتل کی جگہ محنتی ہونا زیادہ باعث شرف سمجھا جانے لگا۔ لڑائی، جھگڑے کے بجائے ترتیب اور چستی زیادہ فائدہ مند بن گئی۔ امن و امان کا پلہ بھاری ہو گیا۔ تقسیم سے ان علاقوں میں پٹواریوں کے ذریعے زمین ناپی گئی اور لکھا پڑھی کی گئی۔ اس نظام میں ہر شخص آزاد ہے کہ چاہے تو اپنی زمین فروخت کرے، چاہے تو رہن رکھے اور چاہے تو کاشت کرے۔

بلوچستان کے کچھ علاقوں میں ”لٹ بند“ والی زمینیں ہیں۔ لٹ بند والی زراعت کچھی اور وسطی بلوچستان کے بلوچوں میں موجود ہے۔ یہ ایسی زمین ہے کہ یہ ہے تو کسی کی ذاتی ملکیت مگر کوئی اور شخص مالک کی رضا سے اسے آباد کر لیتا ہے۔ تب وہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ پرانا مالک اور نیالٹ بند دونوں ہی زمین کے مالک تصور کیے جاتے ہیں۔ ساری محنت لٹ بند کرتا ہے اور پیداوار پر عموماً چوتھائی یا پھر چھٹا حصہ پرانے مالک کو دیا جاتا ہے۔

بلوچوں میں ابھی تک اراضی کے بہت بڑے ٹکڑے ایسے ہیں جو مستقل (بڑی) طور پر تقسیم نہیں ہوئے۔ یہ زمینیں ابھی بھی مقرر کردہ سالوں کی بنیاد پر تقسیم کی جاتی ہیں۔ اور ہر مالک اپنے ٹکڑے کو کاشت کرتا ہے، فصل اگاتا ہے مگر وہ نہ تو اس زمین کو بیچ سکتا ہے، نہ تبادلہ کر سکتا ہے۔

بارانی علاقے میں سبی، نصیر آباد ڈویژن، کچھی چاغی، ژوب، لورالائی، پشین، قلات، خضدار، مکران اور خاران کے زیادہ تر حصے شامل ہیں۔ ان علاقوں میں سیلابی پانی سے کاشتکاری ہوتی ہے۔ اگر بارش نہیں ہوتی تو یہ سارا علاقہ خشک پڑا رہتا ہے۔ بارانی علاقوں کی اکثریت میں جس طرح کی کاشتکاری ہو سکتی ہے اور جس طرز کے پیداواری تعلقات ہیں، ہم ان کا جائزہ ذرا تفصیل سے لیں گے۔

بلوچستان میں کاشتکاری کے طور طریقے، اس میں استعمال ہونے والے اوزار اور زراعت سے متعلق اصطلاحات سنسکرت زبان کے۔ پنجاب، سندھ اور دیگر پڑوسی زبانوں میں بھی یہی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

یہاں ابھی حال ہی تک زمینیں مشترکہ ملکیت میں تھیں۔ یہ زمینیں دس دس، یا، بیس بیس سالوں تک کے لیے تقسیم ہوتی تھیں اور جب یہ عرصہ پورا ہوتا تھا تو ایک بار پھر یہ سارے قبیلے کی مشترکہ زمینیں تصور ہوتی تھیں۔ زمین کی اگلی تقسیم کا وقت متعین ہوتا تھا۔ تقسیم کے دن تک جتنے زریعہ بچے پیدا ہوتے، انہیں حصہ ملتا تھا۔ اور مر جانے والے لوگوں کے نام کاٹ دیے جاتے تھے۔ ذیلی قبیلوں اور ان کی شاخوں اور حتیٰ کہ خاندان تک بالترتیب زمین تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی تھی اور مردم شماری کے بجائے ”مرد شماری“ بنیاد ہوتی تھی۔ ہر ایک حصہ ”وٹ“، ”تیر“ یا ”کمان“ کہلاتا تھا۔ قبیلے کے جتنے وٹ ہوتے اتنے قرعے ڈالے جاتے۔ اس دوران نہ تو زمین فروخت کی جاسکتی تھی اور نہ اسے رہن رکھا جاسکتا تھا۔

بلوچوں میں زمین کی شاید آخری حتمی تقسیم مری قبیلے میں مکمل ہو گئی۔ 1964 میں وہ میٹھی صبح آ گئی جب مری کے معتبرین اکٹھے ہوئے اور قبیلے نے اپنی مشترکہ زمین ہمیشہ کے لیے

سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بھیڑ کے گلے میں گھٹی وہیں بجی ہے جہاں پانی کا قطرہ دستیاب ہوا۔ جہاں نمی ہوئی مرغ نے وہیں آذان دے دی، گدھا وہیں ڈھینچوں کر گیا، بانسری وہیں بجی۔

جب بارش کافی سال نہیں ہوتی اور ڈکال (قط) پڑ جاتا ہے تو اپنے مرشد کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دھوپ میں ڈالتے ہیں اور اس کے گرگڑانے پر کہیں بارش کی دیوی کو ترس آتا ہے۔ ڈینس برے نے ”سنس آف انڈیا“ کے صفحہ نمبر 65 میں لکھا کہ وسطی بلوچستان کے لوگوں نے بارش برسانے کا کام خان کو سونپا ہے: ”خان اپنے سفید کپڑے اتارتا ہے اور کسانوں والا پشینہ پوتین پہنتا ہے، کسی کھیت میں ہل چلاتا ہے تو بارش ہو جاتی ہے۔ مگر کئی بار وہ صبح سے رات تک ہل چلاتا رہتا ہے مگر بارش نہیں ہوتی۔“ (بے پیر بارش! بے خان بارش!)

بارش کا پانی ایک منٹ کا جوا ہوتا ہے۔ یا ادھر یا ادھر۔ بادلوں کے لیے سارا سال آنکھیں آسمان پر کئی رہتی ہیں۔ مگر بارش ترساتی رہتی ہے اور ناگہاں ایک روز (یا ایک رات) بادل برستا ہے تو یکدم پانی قے کرتا جاتا ہے۔ اگر اس پانی سے اچھی طرح سے آبپاشی کرائی جائے تو سارے بندات بھر جاتے ہیں بصورت دیگر یہ سمجھیں کہ بھرے ہوئے خورجین میں سوراخ ہو گیا ہو۔ ساری محنت رائیگاں، حاجت مند کا دامن خالی رہ جاتا ہے۔ اچھے کاشتکار پہلے سے تیاری کرتے ہیں۔ بارشوں کے موسم میں درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر گٹھے بناتے ہیں اور بندات کے لٹھ پر رکھ دیتے ہیں۔ اپنے کبھی اور نیلے تیار رکھتے ہیں۔ لالین کا ”وٹ“ اور ”گھاسلیٹ“ برابر رکھتے ہیں تاکہ جس وقت بارش نامی ”دشمن“ کا سامنا ہو تو نعرہ لگا کر اس کا استقبال آسان ہو۔ جنگ کی طرح ہانپتے ہوئے، سردی سے کانپتے ہوئے، دھوتی پہنے، گوجی (چٹائی سے بنی ہوئی بارش سے بچنے والی بوری) پہنے ہوئے جھپٹ کر اپنے بندات پر جانا ہوتا ہے۔ بارش کے بعد پانی کی تقسیم والی جگہ پر منصف آتے ہیں اور دوبارہ پانی کو منصفانہ انداز میں بانٹتے ہیں۔ جھگڑا، لڑائی اور فساد ہر بارش کے ساتھی ہوتے ہیں۔

ایک سیرگندم کی کاشت کے لیے ایک ہزار پونڈ ”نصف ٹن“ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک انچ بارش سے ایک ایکڑ پر ایک سو دس ٹن پانی ملتا ہے؟ اگر یہ حساب ہمارے کاشتکار کے پاس

اور نہ رہن رکھ سکتا ہے۔ جب یہ معینہ عرصہ پورا ہو جاتا ہے تو پھر نرینہ افراد کی تعداد پر یہ زمین تقسیم ہوتی ہے۔ بلوچوں میں مری علاقہ میں اس کی مثالیں منڈا ہی، نیساؤ اور ڈھل ہیں۔

”ہمساخ“ مختلف وجوہات کی بنا پر اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے قبیلے کے نفع نقصان کو اپنا گردانے والے کو کہتے تھے۔ اس اصطلاح کے مفہوم کے تعین کے لیے فورٹ منرو میں ایک بڑے جرگے میں ایک خاص لائحہ عمل مقرر ہوا تھا۔ اس کے تحت فیصلہ ہوا کہ ہمساخ وہ شخص ہے جو:

- 1- کوئی جرم کرنے کے سبب اپنا قبیلہ چھوڑ دے اور کسی دوسرے قبیلے میں پناہ اور دفاع مانگے۔
- 2- عورت کے ساتھ زنا کاری کی بنا پر بھاگ گیا ہو اور کسی دوسرے قبیلے میں پناہ اور دفاع مانگے۔

3- مہم پسندی کے بطور شخصی احساسات کی بنا پر اپنا طائفہ چھوڑ گیا ہو اور کسی دوسرے قبیلے میں دائمی زندگی گزارنے کا انتخاب کر چکا ہو۔

جن علاقوں میں زمین کے معین برسوں تک عارضی تقسیم ہوتی رہتی تھی، ہمساخ کو زمینیں دی جاتی تھیں۔

قابل کاشت زمینیں بڑے میدانی علاقوں میں بھی ہیں۔ اور پہاڑوں پر چھوٹے چھوٹے ”تل“ کی صورت میں بھی۔ دائمی پانی والی زمینیں بھی ہیں اور سیلابی آبپاشی والی بھی۔ بلوچ اپنی اراضی سے بہت محبت کرتا ہے، وہ اس کو فروخت کرنے کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

بلوچستان مجموعی طور پر بارشوں سے آباد ہے۔ ہٹ دھرم بارشوں کا اصل موسم مون سون ہے۔ جولائی اگست بارشوں کے خزانے ہیں۔ سال میں تقریباً 200 سے لے کر 400 ملی لیٹر بارش برستی ہے۔ سردیوں میں لگا تار بارش (لسی) بھی بارانی علاقوں کو آباد کرتی ہے۔ سردیوں کی بارشیں نومبر سے لے کر مارچ تک برستی ہیں۔ بارانی زمینوں (لڑ آف) میں نالی (رنج) اور سھیل (خریف) دونوں فصلیں ہوتی ہیں۔ بلوچستان کی زمین زبردست ہے۔ اسے پانی میسر ہو تو اس کی زرخیزی کا ثانی اور کہیں نہیں ہوتی۔ پانی جو زندگانی کے لیے ناگزیر ہے۔ پانی زندگی کا میڈیم ہے، کہ یہ سورج کی روشنی سے بھی اہم ہے۔ انسان نے آج تک کے اپنے علم، تجربہ اور چھان بھٹک

لقمہ کو ”زنب“ کہتے ہیں، چبانے کا یونٹ ”ہاشی“ ہے اور ایک پیاس بجھانے کے لیے پانی کی مقدار کو ”کاناف“ کہتے ہیں۔

کاشنکار اور خانہ بدوش دونوں آسمان کے کچھ ستاروں پہ بہت انحصار کرتے ہیں۔ ان میں پور (Pleiades)، تیر بند (Orion)، عقرب (Scorpio) اور تھت (Usra) Major شامل ہیں۔

نوروز: بلوچستان کا فیسٹول ہے جو رتشیوں کا فیسٹول رہا ہے۔ اور یہ بلوچستان سمیت پورے وسطی ایشیا میں رائج ہے۔

بارش کے وقت کی نمی (رتج) کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ تاکہ بوآئی اور فصل اگنے کے بعد جب بارشیں ہو جائیں اس وقت نمی ضائع نہ ہو جائے، کھیت میں دو تین بار ہل چلایا جاتا ہے سول پھر لیٹ پھر بوائی کاہل۔ اللہ اگر مہربان رہے، بخت اگر برابر رہے تو بارشیں برسیں گی اور بالآخر فصل جا کر تیار ہو جاتی ہے۔ ہل مرد چلاتا ہے مگر اس کے ساتھ جتنا کام عورت کرتی ہے اس کا نہ تو اندازہ کیا جاتا ہے اور نہ اس کام کو کوئی تسلیم کرتا ہے۔ عورت بیج تیار کرتی ہے، گھر میں اناج پیسنے، کھانا پکانے کے علاوہ خاوند کا کھانا کھیت تک لے جاتی ہے، حید کاٹنا، فصل کی رکھوالی کرنا، کٹائی کرنا، خرمن کو تیار کرنے کا کام کرنا، غلہ اور بھوسے کو سنبھالنا..... یہ سارے کام یہ گونگی بہری مخلوق کرتی ہے۔

لڑ آف کی فصلات

بارانی علاقہ ہم اُسے کہہ رہے ہیں جہاں نہری آب پاشی نہ ہو بلکہ بارش پر انحصار ہو۔ یہاں کی بڑی آبی فصل ابھی تک گندم ہے۔ گندم کی ہماری وہی پرانی تخم ہے جسے ہم ”ملکی“ کہتے ہیں۔ ہمارے لیے میکسی، پون، ٹوڑھی اور کونج کی کاشت گویا ممنوع ہے۔ ہمارا ملکی تخم ایک تو ہمارے ماحول کی گرمی سردی کو برداشت کرتا ہے۔ عدم بارش اور پیاس اس کے ہونٹوں کو بہت زیادہ خشک نہیں کرتی، اس کا دانہ خوبصورت ہے، آٹا بہت لیس دار ہے، اس کی روٹی کا ذائقہ بہت اچھا ہے۔ اس کا بھوسہ بہت نکلتا ہے جو کہ جانوروں کے لیے زبردست خوراک ہے۔ یہ زیادہ تر ”نر“ کے ذریعے بچی جاتی ہے تاکہ بیج اچھی طرح مناسب گہرائی اور مناسب فاصلے پر گر سکے۔

ہو اور بارشوں کا اندازہ لگایا جاسکے تو بلوچستان بھر میں برسنے والی بارش کے سارے پانی کو ایک منصوبہ اور ترتیب کے ساتھ استعمال میں لایا جائے تو پتہ نہیں کتنے لاکھ ٹن گندم پیدا ہو۔ مگر منصوبہ بندی کہاں اور امریکہ والے سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ نہ تھی ہونا کہاں! ایڈ ہاک ازم زندہ باد۔ گرجتے بادلوں کے برسنے کے باوجود ہمارے کھیت پانی کے لیے ترستے ہیں۔ ہمارے مال مویشی اور انسانوں کی آنکھیں میٹھے پانی کے جوڑ کو ترستی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ساری شاعری، قصہ اور ادب، ضرب الامثال اور مجلس بارش کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے آدمیوں کے نام نوذو ہیں، ہوران، بشام اور سادو ہیں۔ نوخاف، نوذ بندغ، امریز اور نوذ بان ہیں۔ ہمارے علاقوں کے نام ساژٹاف، سورآف، گندغیں آف اور شیرین آف ہیں۔ آف، آف کر کے مرجانا ہے۔ بارانی فصل کے دو موسم ہیں۔ یعنی نالی (ربیع یعنی گندم) اور سھیل (خریف یعنی۔ جوار، باجرہ، تارا میرا، منگ، ماش، موٹھ)۔

فاصلے

بلوچوں میں فاصلے اس طرح بھی ناپے جاتے ہیں؛
گوانک پندھ ___ وہ فاصلہ جہاں تک آواز پہنچتی ہے۔

پہر پندھ ___ تین گھنٹہ کے سفر کا فاصلہ۔

نیمروش پندھ ___ چھ گھنٹہ پیدل سفر کا فاصلہ۔

روش پندھ ___ بارہ گھنٹہ پیدل سفر کا فاصلہ۔

اوزان و پیمائش

اناج وغیرہ کی پیمائش کے مندرجہ ذیل یونٹ ہیں؛

ایک پزڑکی - (3/4) سیر، 4 پزڑکی - ایک ٹوپہ یا 3 سیر، 4 ٹوپہ - (ایک کاسخ یا بارہ سیر)، 60 کاسخ، (ایک خروار)۔

کپڑا وغیرہ ناپنے کے لیے مندرجہ ذیل اصلاحات مروج ہیں؛

ھررش، کہنی سے لے کر درمیان والی انگلی کے سرے تک۔

ہماری کاشتکاری کے خطرات بھی بہت ہیں۔ ہل چلانے والا بیل جب لنگڑا ہو گیا یا خیرات اور شادی میں ذبح ہوا یا پھر بڑی چٹان سے پھسل کر مر گیا تو بس ساری اکا نومی دھڑام سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔ خاص کر اگر یہ آفت ہل اور ہوائی کے وقت آجائے تو کاشتکار اور کسان کا گلہ سوکھ جاتا ہے۔ بھاگ کر اس یا اس گھر جاتا ہے، وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے قرض کے لیے تاکہ اپنے لیے بیل خرید سکے۔ بقال (جو خوشحالی اور امن کی علامت ہوتا ہے) ہمارے علاقے سے غائب ہی ہو گئے ہیں۔ بس کسی مقامی سرمایہ دار (بھاگیا) کے پاس جانا ہوتا ہے یا کسی کنجوس پیسہ سٹور کرنے والے کے در پہ سوالی بننا ہوتا ہے۔ اپنی زمین کا ایک حصہ رہن رکھنا ہوگا اور ایک مقرر وقت تک اپنی زمین کی پیداوار سے محروم رہنا ہوگا۔

بیل کے ساتھ دوستی دیکھنی ہو تو بلوچ کے علاقے میں جائیں۔ ہمارا کسان اپنے بیل کا سنگھار کرتا ہے۔ بچنے والی گھنٹی (شب) اسے پہناتا ہے۔ اس کی بلائیں لیتا ہے۔ ہماری فوک شاعری میں ایک کسان ”جھرا“ نامی ایک داستان (نظم) میں جھرانامی اپنے بیل کی تعریف میں سو سے زائد مصرعے کہہ گیا ہے۔ اس داستان کو ”چیرول“ بھی کہتے ہیں۔

اسے بلوچی زبان و ادب میں شامل کیا جانا چاہیے:

جھرا شب و کنڈی آن نہ بنداں ذاتے بیکارا
نہ زئے گوخہ، نیئے روئے، نہ خنت جھرا تڑیں کارا
پنجاہ کاسفہ ریشان، جھرا روشہ ننگارا
جھرا کوتلی جزی، ہیلایس سرہ مہارا
جھرا ڈھگوے جوائیں، تئی تعریف دہ قندھارا
لٹاں ہلمہاں کاری، چڑی جھرا گوں یہ تاڑا
ہزارا لوٹھے، جھرا، جمالی لوپہ سردارا
ہزار تہ چترے چینیں، نہ داثہ ماخو بہوتارا
ترجمہ:

جوار باجرے کی کاشت زیادہ تر بارانی زمینوں پر کی جاتی ہے۔ آبی زمینوں کو کوئی بھی ان تھرڈ کلاس فصلوں کے لیے ضائع نہیں کرتا۔ چونکہ ہماری کاشت کاری وسیع پیمانے کی مارکیٹ کے لیے نہیں ہوتی اور ہم خود اپنے گزارے کے لیے محنت کرتے ہیں اس لیے ہم آبی زمین کو صرف گندم کے لیے وقف کرتے ہیں۔ البتہ جانوروں کی خوراک کے لیے ایک آدھ ٹکڑے پر جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ بارانی، زمینوں پر بھی باجرے کی بہ نسبت جوار زیادہ کاشت کی جاتی ہے۔

باجرہ بے چارہ ہماری خوراک نہیں ہے۔ ہماری روزی تو جوار شریف ہے۔ باجرے کو بلوچ لوگ سردیوں میں مزہ لینے (ویبھر) کے لیے کھاتے ہیں۔ جوار باجرہ دونوں کو گوندھ کر، ایک گولہ بنا کر پتھر کے توبے (تافغ) پر رکھا جاتا ہے۔ پھر اس گولے پر ہاتھ تھاپ تھاپ کر اسے توبے پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ باجرے کی روٹی مکھن کے ساتھ ملا کر کھائیں تو یہ زبردست ڈش ہو جاتی ہے۔ گندم تو ”بے سات کے بھی سائی ہے“۔ (بلوچی ضرب المثل کہ حسین عورت بغیر زیور کے بھی سمجھو زیور پہننے ہوتی ہے)۔ ماش، موٹھ اور لوبیا بھی کاشت ہوتے ہیں مگر بہت چھوٹے پیمانے پر۔ ہم خود کھاتے ہیں، وہ بھی کھانے کے ساتھ نہیں بلکہ ویسے ہی ابال کر مزے لینے کے لیے۔ کچی سالن ویسے بھی تو نیا نیا ”فیشن“ ہے۔

ہمارا کسان بہت دکھی مخلوق ہے۔ بہت زیادہ لوگ بہت کم زمین پر گزارہ کرتے ہیں۔ پھر سہارا بارشوں پر ہے، اچھے دنوں کی امید، برسات و بارش کی امید، فصل و پیداوار کی امید، روٹی کے نوالے کی امید، کپڑے کے ٹکڑے کی امید، گرم گود کی امید، چاند سے بیٹے کی امید، سلامتی صحت کی امید..... آنکھیں چندھیا گئیں، دل تاریک ہو گیا، امید..... امید اللہ پر، امید اس درختاں ساعت کی جب ہماری پیشانی پہ لکھی تحریر بدل جائے۔ مگر کہاں ہے ہمارے ٹھنڈے پانی کی جھیل، وہ میٹھی شفاف، پیاس بھانے والی جھیل کہاں ہے۔ نہیں، نہیں۔ بادل ہم سے ناراض ہیں، بجلی کی چمک پر ہمارے علاقے میں پابندی ہے، گرج اپنے عدت کے ایام میں ہے۔ بھوک کی آنکھوں کے مولے آنسو گندم نہیں اگا سکتے۔ بھوک کی فریاد اور آہ پیٹ کا دوزخ بھر نہیں سکتے۔ دکھوں کی ہچکیاں سکھوں کی لیڈی نہیں بن سکتیں۔

یہ جو گھنٹہ والی بات ہے وہ تو انگریز ساتھ لایا۔ اس نے ہمارے پورے برصغیر کے لیے ایک ہی سٹینڈرڈ ٹائم مقرر کر دیا۔ اُسے گرین وچ مین ٹائم سے پانچ گھنٹے آگے کر دیا۔ پھر جب ہندوستان، پاکستان اور بلوچستان کی آزادی کا اگست 1947 کو اعلان ہوا تو ہمارا اور ہندوستان کا وقت آدھ گھنٹے کے فرق والا بنا۔ اُن کا آدھ گھنٹہ پہلے اور ہمارا بعد میں۔

سیاہ آف وہ مبارک نعمت ہے جس سے جاندار مخلوق اور شہروں کی زندگانی وابستہ ہے۔ مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ میسو پوٹیمیا کے دو دریاؤں دجلہ و فرات کے درمیان اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ بے شمار کچر پھلے پھولے ہیں۔ بلوچستان میں آبادی، کچر اور سولائزیشن دریائے بولان اور ہندو پاکستان میں دریائے سندھ، برہم پتر اور گنگا کے احسانات ہیں۔ آسٹریا کی ترقی و خوشحالی دریائے ڈینیوب کے سبب ہے۔ جرمنی کی تجارت اور صنعت ایلے اور رہائین دریائوں کے وسیلے سے ہوئی ہے اور فرانس کے کچر اور ترقی کو لائز، رھون اور سین دریائوں نے بالغ کر دیا ہے۔ روس میں دریائے والگا اور ڈان کئی کچروں کا منبع ہے۔ (1) بلوچستان کے اپنے قصبے اور شہر بھی پانی کی مستقل ندیوں نالوں کے دم سے آباد ہیں۔ مگر پورے بلوچستان میں، سوائے ایک آدھ کے مذکورہ بالا دریائوں جیسے بڑے دریا نہیں ہیں۔ ہمارے علاقے کے دریائوں میں دائمی پانی بہت کم ہے۔ زیادہ تر سیاہ آف کھارے پانی والے ہیں۔ دریا میں کچھ دیر تک دیکھیں تو بہت پانی موجود ہے، پھر یہ پانی دوبارہ زمین کے نیچے گم ہو جاتا ہے، ایک دو میل کے بعد پھر پانی کی دھاری نمودار ہوتی ہے۔ پانی کی یہ آنکھ چولی پورے رو تک چلتی ہے۔ پہاڑوں کے موڑوں کو نوں میں جہاں پانی نمودار ہوتا ہے وہاں اس کی گہرائی دوانچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بارش جب برستی ہے تو ان دریائوں میں مردم بُرد سیلاب آتا ہے۔ اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ پانی اتر جاتا ہے۔ پانی کا یہ سیلاب بڑی بڑی جھیلیں (کمب) بناتا ہے۔

ان دریائوں سے لوگ چھوٹی نالیوں کے ذریعے آس پاس کی زمین سیراب کرتے ہیں جنہیں ”کچ“ کہتے ہیں۔ کاریز کا دکا ابھی تک چالو ہیں۔

کاریز کا نظام بہت دلچسپ ہے۔ معلوم نہیں ہے کہ کاریز کا نظام سب سے پہلے کہاں

جہرا کی گھنٹیاں اور گھنگھر و میں کسی اور بے کار تیل یہ نہیں باندھوں گا نہ کوئی گائے ایسا بچے بنے گی نہ ہی کوئی اور کچھڑا جہرا جتنا کام کر پائے گا میں ایک ہی دن میں جہرا کے ذریعے پچاس کا سہ بیج بوتا ہوں جہرا ناز و نخرے کے ساتھ، مہار ڈالے چلنے کا عادی ہے جہرا زبردست تیل ہے جس کی تعریفیں قندھار تک ہوتی ہیں بند کے لٹ پر (چڑھائی) پر تو گویا حملہ آور ہوتی ہے اور اس کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے ایک ہزار روپیہ یہ مانگا تھا جمالی کے سردار نے ایک ہزار کچھ کم رقم تو نہیں ہوتی مگر میں نے اور میرے جاگیر دار نے نہ بیجا وہ تیل سب سے اچھا تصور ہوتا ہے جو اندر اور باہر دونوں طرف ہل چلائے، بار بردار ہو، کام میں سست نہ ہو اور خوبصورت بھی ہو۔

2- سیاہ آف

(مستقل پانی سے سیراب ہونے والی زمینیں)

مویٹی بانی اور بارانی زرعی معیشت ہی کی طرح سیاہ آف والی زرعی معیشت سے بھی بلوچ کا سماجی نظام متشکل ہو چکا ہے۔ مثلاً یہاں بلوچ کے ہاں بام رنگ، گول، نیمروش، پیشین، دیغر، روش ٹب، نما شام، چتن، زہریں وہا، پڈی شف کے علاوہ بھی 24 گھنٹوں کو تقسیم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

”پاس“ ہمارا سٹینڈرڈ ٹائم بنا۔ کاریز ہو یا کچ، مشترکہ ٹیوب ویل ہو یا نہری نظام، پاس گویا پانی کی تقسیم کی علامت بن گیا۔ لفظ ”پاس“ سیاہ آف کا اپنا لفظ نہیں ہے۔ یہ تو پندرہویں سولہویں صدی میں بیورخ کی شاعری میں بھی استعمال ہوا تھا۔ مگر یہاں یہ باقاعدہ وقت کا یونٹ بن کر سامنے آیا۔ چوبیس گھنٹے میں چار پاس تھے۔ ایک پاس، دو پاس، سہ پاس، چار پاس۔ ہمارے بڑے پیر ”یک پاسی“ اور دو پاسی مشہور ہیں۔

ڈیزل والے ٹیوب ویل پہلے اکھاڑ دیے گئے تھے اور ان کی جگہ بجلی والے ٹیوب ویل لگائے گئے تھے۔ بجلی چونکہ ہے نہیں اس لیے نہ تو تین کے رہے نہ تیرہ کے زراعت میں۔

ٹریکٹروں کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگ بارانی و آبی دونوں زمینوں کو ہموار اور آباد کر رہے ہیں۔ بنجر اور پتھر لیے علاقے اب قابل کاشت ہوتے جا رہے ہیں۔ ٹریکٹر ہمارے لیے بہت مفید چیز ہے۔ اسے بار برداری کے لیے استعمال کریں یا سواری کریں، چاہے تو اس سے ہل چلائیں، چاہے زمین ہموار کریں، خواہ نالے، کیاریاں اور لٹ باندھیں یا اس سے ٹیوب ویل چلائیں، یہ ہمارے گدھے کا زبردست نعم البدل ہے۔ ہرن مولا ہے اور لوگ روز بروز اس کی کرامتوں سے واقف ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی گرویدگی بڑھتی جا رہی ہے۔

مگر عمومی طور پر ہمارے ہاں کاشت کاری کی تکنیک بہت ابتدائی اور فرسودہ ہے۔ ہل لکڑی کا ہوتا ہے اور ہل چلانے کے لیے کبھی کبھی اونٹ، گائے اور گدھا استعمال ہوتے ہیں۔ مالہ درخت کا تنا ہوتا ہے۔ اور ”کھر پڈ“ نامی کسی جیسے آلے سے ہم مٹی کے ڈھیلے توڑتے ہیں۔ کٹائی ہر جگہ درانتی سے ہوتی ہے۔ ریپر ابھی تک مقبول نہیں ہوا۔ تھریشر اور ٹریکٹر بھی گاہنے کے لیے استعمال ہونے لگے ہیں۔ مگر بیلوں سے فصل گاہنے کا رواج بھی متروک نہیں ہوا۔

آبی زمینوں پر ابھی تک بڑے پیمانے پر کرم کش ادویات استعمال نہیں ہو رہی ہیں۔ نہ ہی سائنس کی تیار کردہ کھاد سے مستفید ہوا جا رہا ہے حالانکہ آج بہت بڑا رقبہ آبی بنا دیا گیا ہے۔ کھاد اور کرم کش ادویات کو استعمال نہ کرنے کی وجہ خدا نخواستہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں ماحول کی آلودگی کا بڑا شعور، ادراک یا غم ہے، نہ ہی ہمیں کسی نے یہ بتایا کہ یورپ و امریکہ کے ایڈوانس لوگ کرم کش زہر کے استعمال سے ہاتھ کانوں میں لگا کر توبہ کر رہے ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ خدا کے بندوں ہمارے پانی میں بھی زہر ہے، اپنی فصل اور خوراک ہر چیز میں ہم نے خود زہر ڈال دیا ہے۔ ہم نے اپنی سانسوں میں بھی زہر بھر دیا ہے کہ ساری ہوا زہر آلود ہو گئی ہے۔ خدا کو مانو تو زہر کا دھندا چھوڑ دو مگر سرمایہ داری نظام وہاں کے کاشتکار کی بات بھی سننے نہیں دیتا۔ دواساز کمپنیاں پیسہ دے دے کر، اشتہارات نشر اور چھاپ چھاپ کر انسانی فلاح کی ہر آواز کو کامیابی سے دبالتی ہیں، انہی کمپنیوں کی

اور کس نے شروع کیا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کاریز کس زبان کا لفظ ہے اور بلوچ نے کس قوم سے یہ نظام سیکھا؟۔ کاریز نظام آبپاشی سارے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں اور نیز چین اور جاپان میں پایا جاتا ہے۔ مگر یہ بات پکی ہے کہ بلوچستان میں کاریز بہت زمانے سے مروج ہیں۔ کاریز موتیوں کا پرویا ہوا ہار ہوتا ہے۔ پانی، دھاگے کی طرح کنوؤں کے منکوں کو باہم پروتا ہوا، اپنے سرچشمے سے لے کر فصل تک چھپے ہوئے یا دشمن دار جوانوں کی طرح خفیہ خفیہ، چپ چاپ، پاؤں کے بل چلتا ہوا مہر و محبت، آبادی اور خوشحالی کا پیغام جا کر پہنچاتا ہے۔ کھڈوں کی دوستی کی یہ نشان، انسانی فکر کے جادو کا یہ کرشمہ اور حیات نو کا یہ پیمبر زیادہ تحقیق، زیادہ ریسرچ اور چھان بین اور زیادہ صفائی و خدمت کا متقاضی ہے اس لیے کہ یہ ہماری کم آبی کا درمان ہے، اس کی مٹھاس کھارے جو ہڑوں کو شرمندہ کرنے والی ہے اور اناج و طعام کے خرمون کا سبب ہے۔

دھٹ یا آرٹ ایک زمانے تک دولت مند کاشتکار یہ طریقہ آبپاشی بھی استعمال کرتے رہے۔ مگر اونٹوں پر لا کر اس کے پرزہ جات دور دراز تک نہ لیے جاسکتے تھے۔ نیز خرابی کی صورت میں مستری علاقے سے بہت دور شہری مراکز میں ہوتے تھے۔ اس لیے یہ طریقہ نہ مقبول ہوا اور نہ دیر پا۔

ٹیوب ویلوں کا رواج ابھی پڑتا جا رہا ہے اور آباد اور مستقل رہائش پذیر لوگوں کی توجہ ابھی حال ہی میں سائنسی زراعت کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ چنگو اور مکران کے دیگر حصوں میں پانی کا حقوق رکھنے والے لوگ، کاریز کے قریب ایک ٹیوب ویل لگانے نہیں دیتے۔ مستنگ ضلع کے حصوں میں ایسے علاقے بھی مخصوص کر دیے گئے ہیں جہاں کنوئیں یا ٹیوب ویل نہیں کھودے جاسکتے۔

ڈیزل کا خرچہ اتنا زیادہ ہے کہ زمیندار کی کمرٹوٹ جاتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گوشت سے چھچھڑے مہنگے پڑتے ہیں۔ اب تو شکر ہے کہ گرڈ والی بجلی کشادہ پیشانی والے علاقے کی قسمت والے عوام تک پہنچ گئی ہے۔ زمینداری میں اس کی برکتیں یہ ہوتی ہیں کہ پہلے سے لگے ہوئے ٹیوب ویلوں کا خرچ کم ہو جاتا ہے۔ مگر بجلی کے شدید بحران نے ساری زراعت برباد کر ڈالی۔ اس لیے کہ

بلوچستان میں ان زمینوں اور ان پر موجود زرعی نظام نے پیداوار دے کر بہت سے بیرونی حملہ آوروں کو ہم پر یلغار کرنے کی ترغیب دی۔

ناڑی، جس کا کہ ہم نیچی دریا کے بطور پہلے ذکر کر چکے ہیں، سبی کے لیے روزی رساں ہے۔ ضلع کی 90 فیصد نہری کاشتکاری اسی دریا سے ہوتی ہے۔ دریائے نیچی (ناڑی) کے آبی حقوق سبی میں یوں تقسیم ہیں؛

نچک.....	16.5 پاؤ
دھپال.....	7.0 پاؤ
صافی.....	8.0 پاؤ
مرغزانی.....	7.0 پاؤ
کڑک.....	7.0 پاؤ
سبی ٹاؤن.....	6.0 پاؤ
خدا نیداد مرغزانی.....	1.0 پاؤ
موسیانی.....	1.0 پاؤ
لونی.....	3.0 پاؤ
بکھڑا.....	2.0 پاؤ
کوٹ باردوزئی.....	2.0 پاؤ
محکمہ فارسٹ.....	1.5 پاؤ
مندوانی.....	1.0 پاؤ
نودھانی.....	1.0 پاؤ

کل.....64.0 پاؤ یعنی 115.2 کیوسک (2)

ناڑی کا سیلابی پانی کچھی میں بھاگ کے مقام پر آن کر بہت سی شاخوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہ مگسی علاقے تک پہنچتا ہے اور سندھ تک چلا جاتا ہے۔ ناڑی پر بڑے بڑے بند ہوا کرتے

بدولت تو حکومتیں چلتی ہیں، یہ چاہیں تو بادشاہ بنادیں چاہے تو ممالک میں آئندے شہید بنادیں۔

پانی کے سماجی انتظام میں یہ بات شامل ہے کہ پانی کی تقسیم بہتر اور موثر ہو۔ پانی کی چوری کی روک تھام ہو اور پانی کے نالوں کو صاف کرنے اور مرمت کرنے میں تعاون ہو۔ جہاں پانی کے حصے چھوٹے ہوں، وہاں پانی کی تقسیم پیچیدہ ہوتی ہے۔ دیکھ بھال بہت ہی نازک ہوتی ہے، آبپاشی کے خصوصی منیجر مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان افسروں کو رئیس، ارباب، سرشتہ، یا کہدا کہتے ہیں۔ ان کا تقرر موروثی ہو سکتا ہے مگر اس کا انحصار کارکردگی پر ہوتا ہے اور ان کا معاوضہ پانی میں حصہ کی صورت میں دیا جاتا ہے، یا پھر نقدی کی صورت میں، یا آبپاشی کے نظام کو صفائی کیلئے کام کرنے سے مستثنیٰ کر کے۔

نہری علاقہ

پاکستان کے زیر تصرف بلوچستان 134051 مربع میل یا 34.94 ملین ہیکٹر کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں صرف 12 ملین ہیکٹر ز پر کاشت کاری ہوتی ہے۔ صوبے میں 5.22 ملین ہیکٹر قابل کاشت زمین ہے جب کہ باقی زمین پانی اور انفراسٹرکچر نہ ہونے کی وجہ سے غیر آباد پڑی ہوئی ہے۔ پانی صرف 0.34 ملین ہیکٹر کو نصیب ہے۔ تقریباً 0.18 ملین ہیکٹر کو مستقل طور پر نہروں، ٹیوب ویلوں اور کاریزوں سے پانی ملتا ہے۔ بقیہ 0.16 ملین ہیکٹر بارشوں کے رحم و کرم پر ہے۔ بلوچستان کو صرف 4200 کیوسک پانی سکھر اور گڈو بیراج سے ملتا ہے۔ یہی اس کا حصہ ہے۔ نہری پانی سے زیادہ تر نصیر آباد کا علاقہ سیراب ہوتا ہے۔

نہریں آنے سے پہلے بلوچستان کے میدانی (صحرائی) علاقے کو ”پٹ“ کہا جاتا تھا۔ یہاں بارشیں نہیں ہوتی تھیں اور سیلابی پانی سے یہ علاقہ بہت دور واقع تھا۔ اس لیے اسے ”دشت اموات“ کہتے تھے۔ یہاں اہم سیلابی دریا ناڑی، بولان، سکلیجی، مولا، لہڑی اور چھتر ہیں۔ کچھی میں داخل ہو کر ان دریاؤں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے نالے بن جاتے تھے۔ ان سیلابی دریاؤں پر آب پاشی کے لیے بڑے بڑے بند یا ڈیم بنائے جاتے تھے۔ جنہیں ”گنڈھو“ کہا جاتا تھا۔

کچھی و نصیر آباد میں نہروں سے قبل ان سیلابی دریاؤں کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ

نے زراعت کو مزید ترقی بخشی۔

کپاس کی خوب کاشت ہوتی تھی۔ پچھلی صدی کی تیسری دہائی میں شائع شدہ مشہور عالم پمفلٹ ”شمس گردی“ میں کچھی کے اندر کپاس کی کاشت اور اس پر ظالمانہ سرکاری ٹیکس کا ذکر موجود ہے۔ انگریزوں نے 1932 میں کیرتھر نہر بنائی تھی۔ یہ سکھر بیراج سسٹم کی شمال مغربی نہر کی شاخ ہے۔

پاکستان نے کشمور کے مقام سے دریائے سندھ سے ایک نہر نکالی جسے پٹ فیڈر کہتے ہیں۔ پٹ فیڈر بلوچستان میں نہری آبپاشی کا سب سے بڑا نظام ہے۔ جس کی لمبائی 112 میل ہے۔ اس طرح یہ نہر، نہر سوزیہ سے لمبی ہے جو سرخ سمندر کو میڈیٹیرین سے ملاتی ہے۔ کیرتھر اور پٹ فیڈر دونوں ہی دریائے سندھ سے پانی حاصل کرتے ہیں۔ پٹ فیڈر نے شروع شروع میں 6700 کیوسک پانی لینا تھا مگر جب 1962 میں اس کی تعمیر شروع ہوئی تو اس کا ڈیزائن تبدیل کر دیا گیا اور اسے صرف تین ہزار کیوسک رہنے دیا گیا۔ یہ نہر سندھ اور بلوچستان دونوں صوبوں سے گزرتی ہے۔ سندھ میں یہ 35 میل کا سفر طے کرنے کے بعد بلوچستان میں داخل ہوتی ہے اور کچھی کے میدانوں کے علاوہ بگٹی قبیلہ کی کچھ زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ پٹ فیڈر نصف ملین ایکڑ کو سیراب کر سکتی ہے۔ نہر میں ضروری حفاظتی کام نہ ہونے کی وجہ سے تین سے چار سو کیوسک پانی رس کرینچے کے علاقے بالخصوص مشرقی نصیر آباد کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ سارا علاقہ ایک عظیم جھیل بن چکا ہے جس نے زرخیز ترین زمین کا ایک لاکھ ایکڑ سے زائد علاقہ سیم اور تھور کے حوالے کر دیا۔ اور یہ ہر سال تقریباً دس ہزار ایکڑ مزید زرخیز زمین کو ناکارہ بنا رہا ہے۔

نصیر آباد ڈویژن کے علاقے میں بہت ساری زراعت نہری زمین پہ کی جاتی ہے۔ یہ نہری زمین تقریباً چار ہزارے فیوڈل خاندانوں کی ملکیت ہے؛ کھوسہ، جمالی، بگٹی اور عمرانی۔ یہ جاگیریں زیادہ تر ان قبائلی سرداروں کی ملکیت ہیں جو انگریز کے وفادار تھے۔ اس علاقے میں گندم، چاول، دالیں، کاٹن اور تل جیسی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں بھی رعیتی کسان ہیں۔ اور کسان پابند ہوتا ہے کہ بیوی بچوں سمیت فیوڈل کا کام کرے۔ تقسیم پیداوار بارانی علاقوں کی طرح ہوتی ہے۔

تھے جو یہ تھے: مٹھری پر، ایری، گاڈی، حاجی، ناگری، گلاب اور گاموں پر۔ گاڈی گنڈھو کچھی کا سب سے اہم بند ہوا کرتا تھی جس پر پورا بھاگ اور نصیر آباد انحصار کرتے تھے۔ نیچے بھاگ کے علاقے میں 26 گنڈھو تھے۔ سب سے آخری صاحب ڈینا گنڈھو تھا۔ بھاگ کے قریب ناڑی سے ایک شاخ نکالی گئی جسے بشک واہ کہتے تھے۔ اور اس پر نو بند تھے۔

بولان دریا کو پور کے قریب شروع ہوتا ہے جس میں ”سر بولان“ پر پانی نظر آتا ہے اور ”آبِ گم“ میں غائب ہو جاتا ہے۔ ڈھاڈر پہنچ کر اس پر آبپاشی کے لیے ایک بند باندھا گیا۔ اس دریا پر اہم بندوں (گنڈھوؤں) نام کے ہیں؛ مھیسر، خان پور، ٹھل والا، باگائی، رستم اور ہانہی۔ اس کا پانی کبھی کبھی بھاگ اور گند واہ تک پہنچ جاتا ہے۔

سکلینجی، ساروان میں ہر بوئی کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ہوتے ہوئے کچھی کے میدانوں کو سیراب کرتا ہے۔ شوران کے جنوب سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ یہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے؛ ایک گاجان کو جاتا ہے اور دوسرا شوران کو۔

مولا، ہر بوئی پہاڑوں سے شروع ہوتا ہے اور جھالاوان میں 180 میل تک جاتا ہے۔ کچھی میں داخل ہوتا ہے۔ ایک گاجان کو جاتا ہے اور دوسرا سندھ کو جاتا ہے۔

لہڑی دریا مری علاقے سے ہوتا ہوا لہڑی شہر سے آٹھ میل شمال مشرق میں داخل ہوتا ہے۔ خان واہ کے ذریعے یہ ڈومبکی فیوڈل چیف کی زمینوں کو سیراب کرتا ہوا بالا ناڑی جاتا ہے۔ بالا خرد یا ٹمیل ڈیرہ کی طرف جاتا ہے اور کبھی کبھی نصیر آباد کو سیلابی پانی پہنچاتا ہے۔

چھتر، بگٹی پہاڑوں سے نکلتا ہے اور کھیری علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ چھتر اور شاہ پور کے درمیان بہت بڑی زمین اس سے سیراب ہوتی ہے۔ (3)

نصیر آباد کے علاقے کی نہریں بیگاری اور شاہی واہ ہیں۔ یہ دونوں نہریں دریائے سندھ سے نکلتی ہیں۔ اول الذکر کی دو شاخیں ہوتی ہیں؛ نور واہ اور سیر واہ۔ بیگاری شاید نور محمد کاہوڑا کے زمانے سے شروع ہوئی تھی۔ بیگاری نام اس لیے پڑا کہ مزدور بیگار پر لیے گئے تھے۔ (4) اس سے زرعی پیداوار خوب بڑھی۔ لوگ خانہ بدوشی کی بجائے آباد ہو کر زراعت کرنے لگے۔ ریل اور سڑک

نہری زمین کے علاوہ بلوچستان میں آبی زمین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں آبیاری، قدرتی چشمے، رہٹ، ٹیوب ویل یا کاریزیں کرتی ہیں۔ ان زمینوں پر دروایتی فصلوں کے علاوہ نقد آور فصلیں (یعنی بنزیاں اور پھل) بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں رعیتی کسانوں کے علاوہ یومیہ اجرت والے کھیت مزدور بھی کام کرتے ہیں۔ چونکہ یہ فیوڈل اپنی زرعی پیداوار کے حوالے سے منڈی سے وابستہ ہیں۔ اس لیے ٹرانسپورٹ کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ کھیت مزدور گوکہ رعیتی کسانوں کی طرح پوری زندگی فیوڈل کے غلام نہیں رہتے مگر انہیں بھی کوئی آئینی و قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے۔

مندرجہ بالا زمینوں کے علاوہ کاشتکاری کی تیسری قسم مکران اور اس کے پڑوسی علاقوں میں بڑے پیمانے کی کھجور کی کاشت ہے۔ یہاں کسان عموماً یومیہ اجرت کے حساب سے یا پھر پیداوار کے حساب سے اپنا حصہ لے لیتا ہے۔ چونکہ کھجور کو ڈبوں میں بند کرنے یا سرد خانوں میں رکھنے کے انتظامات موجود نہیں ہیں اور نہ ہی کھجور سے وابستہ کوئی صنعت موجود ہے۔ اس لیے کسان اور مالک دونوں ہی ناگفتہ بہ زندگی گزارتے ہیں

کسانوں کی یہ حالت بہتر بنانے، کاشت کاری کو فروغ دینے اور پیداوار بڑھانے کے لیے کچھ ضروری کام یہ ہو سکتے ہیں؛

1- کاشت کاری کے لیے آبادی و آباد کاری بہت ضروری ہے۔ خانہ بدوش اور ”کاشروڈی“ لوگ کبھی بھی زراعت نہیں کر سکتے۔ اس لیے لوگوں کی مستقل آباد کاری، ان کے کڑی خیموں کو کمروں میں تبدیل کرنے اور الگ تھلگ رہنے والوں کو شہر اور قصبوں کی صورت میں اکٹھا اور مستقل آباد کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ (جو کہ خود ایک مشکل کام ہے۔ اس میں بہت سی سماجی، معاشی اور سیاسی مشکلات اور رکاوٹیں ہیں)۔

2- انفراسٹرکچر مہیا کرنا۔

3- منڈی قائم کرنے اور انہیں سڑکوں کے ساتھ پرو دینے کے بغیر زراعت کبھی ترقی

مگر یہاں مخصوص بات یہ ہے کہ فیوڈل کے مراٹھی، ترکھان، لوہار، ملا اور نائب (رئیس) کا متعین معاوضہ کسان اور مالک کی مشترکہ پیداوار سے دیا جاتا ہے۔

بلوچستان میں نہری نظام کے ذریعے تقریباً نو لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے جس میں سے پٹ فیڈر نہر سے 4 لاکھ ساٹھ ہزار ایکڑ، کیرتھر سے 2 لاکھ 55 ہزار ایکڑ، اوچ کینال سے 85 ہزار، مانجھوٹی سے 28 ہزار ایکڑ، خان واہ سے 25 ہزار ایکڑ۔

نہر آنے سے پہلے نصیر آباد ”بٹائی“ کے نام سے خان کوٹیکس دیتا تھا۔ اس کی شرح مکمل پیداوار کے چھٹے حصے سے لے کر چوتھائی تک ہوا کرتی تھی۔ ریاست کچھ دیگر ٹیکسوں کے علاوہ تجارت پر بھی ٹیکس لیتی تھی۔ جب نہر آئی تو جان جیکب اور نصیر خان دوئم میں یہ معاہدہ طے پایا کہ ٹیکس دونوں آدھو آدھ کر لیں گے۔ یہ معاہدہ 1843 میں ہوا تھا۔

میرانی ڈیم: بلوچستان کے مقام تربت سے 30 میل مغرب میں میرانی کے مقام پر میرانی ڈیم تعمیر ہو چکا ہے۔ یہ دو بڑے سیلابی دریاؤں، کچج اور نہنگ کے سنگم پر ہے۔ یہاں سے آگے بہاؤ سمندر تک جاتا ہے جسے دشت کور کہتے ہیں۔

منصوبے کے مطابق میرانی ڈیم پہ 200 کلو واٹ کے تین جزیئر لگا کر چھ سو کلو واٹ بجلی پیدا کی جائے گی۔ میرانی ڈیم سے دائیں اور بائیں جانب نہریں نکالی گئیں۔ اس منصوبہ کے تحت اس ڈیم سے 32 ہزار ایکڑ زرخیز ترین زمین کو سیراب کیا جاسکے گا۔ اس ڈیم سے سالانہ ٹوٹل ڈسپارج 125000 ایکڑ فیٹ پانی ہے اور اس میں چار سال تک کا پانی سٹور کیا جاسکے گا۔

دریائے پورالی ضلع لس بیلہ کی زراعت میں منفرد بات یہ ہے کہ یہاں ہماری روایتی فصلوں کے بجائے نقد آور سبزیاں اور پھل کاشت کیے جاتے ہیں۔ چیکو، کیلا، ناریل، پیتا، املی، کپاس..... یہ کاشت کاری مقامی لوگ بھی کرتے ہیں اور قبضہ کنندگان بھی۔ واضح رہے کہ بہت بااثر اور قبائلی سرداروں نے بقیہ بلوچستان سے یہاں آ کر زمین کسی نہ کسی صورت اپنی کر لی اور یہاں کی زمینداری میں لگ گئے۔

15- کسان اور چھوٹے زمینداروں کی بہبود کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیوں کا قیام، مشینی کاشت کی ترقی کے لیے تحقیقی مراکز کھولنا، موجود زرعی فارموں کی کارکردگی بہتر بنانا، اور کسانوں کو نئی ٹیکنالوجی سے واقف کرنے کے لیے پروگرام بنانا۔

16- بڑی بڑی جاگیریں، قومی ملکیت میں لے کر بے زمین کسانوں میں بانٹنا۔
بلوچستان میں ایک لاکھ ٹن فروٹ پیدا ہوتا ہے۔ 86-1985 میں 38,524 ہیکٹر پر پھلوں کی کاشت ہوتی تھی۔ (5) اس کی مارکیٹنگ بہت فرسودہ ہوتی ہے۔ اس کی پیکنگ بھی تھوڑا کلاس گھاس پھوس اور کریٹوں میں ہوتی ہے۔ گریڈنگ اچھی طرح کرنی ہوگی۔ عموماً پھلوں کے درخت کراچی، بالائی سندھ اور پنجاب کے تاجروں کو پیشگی فروخت کیے جاتے ہیں۔ اگر یہ پھل والا درخت ایڈوانس میں بیچنے کی بجائے وہ پھل ہی فروخت کریں تو انہیں کافی فائدہ ہوگا۔ اس کے لیے فروٹ کی ہول سیل مارکیٹ قائم کرنا ہوگی۔ جن میں ضروری کوئلڈ سٹوریج اور مرہ، اچار کی سہولتیں موجود ہوں۔ ڈبہ بندی کی صنعت کو صوبے میں ترقی دینا ہوگا۔

پھلوں میں سیب کی پیداوار سب سے زیادہ ہے۔ 76-1975 میں سیب کی پیداوار 35500 ٹن تھی۔ 85-1984 میں سیب کی پیداوار بڑھ کر 79400 ٹن تھی۔ پاکستان کے سیب کی کل پیداوار کا 56 فیصدی بلوچستان پیدا کرتا ہے۔ (6) سیب کو Dehydrate کر کے بھی بہت پیسہ کمایا جاسکتا ہے۔ سیب کے علاوہ ہم دوسرے میووں اور سبزیوں کو بھی Dehydrate کر سکتے ہیں، جن کی پیداوار بلوچستان میں بہت ہوتی ہے، مثلاً؛

زرد آلو	(39000 ٹن)
آڑو	(26000 ٹن)
Plums	(12500 ٹن)
دھنیا	(1100 ٹن)
مرچیں	(2700 ٹن)
لہسن	(800 ٹن)

(7)

نہیں کر سکتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ منڈی کے اندر کاشتکار کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ قلعہ نما پہاڑ تو ہمارے باپ دادا کی میراث ہیں۔ مگر منڈی تو دوسروں کے قبضے میں ہے۔ وہاں تو ”مال لگاؤ، مال ملے گا“ کا قصہ ہے۔ مال کی اچھائی اور کمتری کی بات ہے۔ ارزانی اور گرانی دیکھنی ہوتی ہے۔ موسم اور بے موسمی تقریقات ہیں اور مانگ اور رسد کا کالاقانون ہے۔ ہمارا سامان تو کبھی فروخت نہیں ہو سکتا جب تک کہ ”یار دستامہ گیرٹ داں تنگوں کلامہ باڑت“ (جب تک کہ محبوب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خیمہ عروسی تک نہ لے جائے)۔ اس لیے منڈی کا تحفظ بہت ضروری ہے۔

4- کاشتکاروں کو بنیادی معلومات مہیا کرنے ضروری ہیں کہ وہ کونسی فصل کس وقت کس طرح کاشت کریں۔ کس کس وقت پانی لگائیں، کونسی کھاد اور اسے کب استعمال کریں۔ کونسی فصل کی قیمت زیادہ ہے اور کہاں قیمت زیادہ ہے۔

5- اچھا بیج، کھاد، کرم کش ادویات کی سپلائی کے ایسے مراکز بنانے کی ضرورت ہے جو نزدیک بھی ہوں، سستے بھی اور بے رشوت و سفارش و خجال بھی۔

6- پانی کا بندوبست کرنا، کاریز، کنواں، ٹیوب ویل، چشمہ اور ندیوں کو ڈویلپ کرنا، آبی زراعت کو فروغ دینا۔

7- ٹریکٹر، تھریشر، بلڈوزر یعنی مشینی کاشت کاری کو رواج دینا۔

8- غیر حاضر زمینداروں کی زمین ضبط کرنا اور کسانوں کے درمیان مفت تقسیم کرنا۔

9- سختی سے معاشی اصولوں پر چلتے ہوئے زرعتی کوآپریٹو قائم کرنا۔

10- دریاؤں اور ندیوں پر بند باندھنا، ٹیوب ویل کے علاقوں میں ڈیلے ایکشن ڈیم بنانا۔

11- کسان کمیٹیاں بنانا۔

12- زرعی اجناس کی قیمت بڑھانا۔

13- زرعی ٹیکنالوجی، جس میں فرٹلائزر اور زرعی ادویات شامل ہیں کی قیمت میں 50

فیصد کمی کرنا۔

14- دیہاتی علاقوں میں زراعت کے ساتھ بندھی صنعتوں کا قیام اور لوگوں کو روزگار دینا۔

بھی کافی اچھے امکانات ہیں۔

اب کے میرانی ڈیم نے غربت کو گڑھے میں پھینکنے کے بوجھ کو شینز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دشت کو سیلابی دریا ”دشت کور“ سیراب کرتا ہے۔ یہ دریا تربت کے قریب ناصر آباد کے مقام پر بنتا ہے جہاں دوسرے دریا، نہنگ اور کچھ کورل کراس کی تشکیل کرتے ہیں۔ دریائے نہنگ، مند اور تمپ کو سیراب کرتا ہے اور کچھ کور بلیدہ، سامی اور کچھ کو پانی پلاتا ہے۔ مشترکہ کور پھر جنوب کی طرف دشت وادی میں بہتا ہوا سمندر میں اتر جاتا ہے۔ سمندر تک اس کی کل لمبائی 408 کلومیٹر ہے۔

ہنگول کور مکران کے میدانوں میں بہتا ہے اور بحیرہ بلوچ میں شامل ہوتا ہے۔ جب بارش زیادہ ہوتی ہے تو اس دریا میں زبردست سیلاب آتا ہے۔ بند ہو گیا، زراعت ہو گئی۔ مکران کی تعمیر سے بے گھر شدہ لوگ ابھی تک در بہ در پھر رہے ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں۔

مکران کی روایتی زراعت میں کہن (کاریز) کا اہم رول رہا ہے۔ یہ بلوچستان میں آبپاشی کا ایک قدیم ذریعہ ہے۔ کاریزوں کے انتظام اور بندوبست اور دیگر معاملات حل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک عہدے دار مقرر ہوتا ہے۔ اُسے یہاں مکران میں کہدا (کنوہدا) کہا جاتا ہے۔ جسے ان فرائض کے عوض ایک ہنگام پانی دیا جاتا ہے۔ کاریز کا پانی ہنگام، نیم ہنگام، تنسو، نیم تنسو کی بنیاد پر شریک لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کاریز تربت میں بہت ہیں۔

مگر دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ضلع تربت کے برعکس ضلع گوادر میں ایک بھی کاریز نہیں ہے۔ تربت کے علاقے نلیٹ کے آم بہت مشہور ہیں تمپ میں بھی اچھا آم ہوتا ہے۔

روایتی فصلوں کے ساتھ ساتھ کھجور کی پیداوار بڑی مقدار میں ہوتی ہے۔ کوئی پیکنگ نہیں، کوئی مرلج اچار کی فیکٹریاں نہیں، کوئی dehydration پلانٹس نہیں۔ اس لیے یہ بڑی پیداوار سمجھو منڈی کے لیے ہے ہی نہیں۔ ضیاع..... وسائل کا بے دریغ ضیاع۔

ہائین جون کے ماہ میں کھجور کے ہائین سے ذرا جلدی آ جاتا ہے اور اگست کے ماہ تک چلتا ہے۔ ہر کھجور کی لذت اور ذائقہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ تربت کے کھجوروں کے نام یوں ہیں؛ آ بے دندان، بیگم جنگی، موزاتی، شکری، زرد، ہیلینی، دشتاری، کروچ، پیش نا، روگنی،

ہم کھجور، چیری، سیب اور انگور کے لیے پراسسنگ اور پیکنگ یونٹس قائم کر کے جام، جیلی، مربہ، اچار، چٹنی اور لیمن سکواش بنا سکتے ہیں۔

پشین جو باغات کا علاقہ ہے، وہاں 43 فیصد رقبہ پر گندم کاشت کی جاتی ہے۔ میوے 31 فیصد پر اور بقیہ رقبہ پر خربوزے، تربوز، سبزیاں اور تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ خاران میں بھی گندم ہی بڑی فصل ہے۔ میوؤں میں سیب، انگور اور انار ہوتے ہیں۔

مکران میں 30 ہزار ٹن پیدا ہونے والی کھجور بہترین تصور کی جاتی ہے۔ جن علاقوں میں کھجور پیدا ہوتی ہے وہاں یہ صدیوں سے بنیادی خوراک رہی ہے۔ مکران تقریباً 40 قسم کی کھجوریں پیدا کرتا ہے جن میں سے بیگم جنگی، آ بے دندان، خزن باد، شکر، کلونٹ، پچ، کلوت، محمد حسنی، کھروا، زرد، چپ شاک، چینی، شگلشکان، پیشاگ، شکری، پیشنا، سبز، ننگن، سنڈ گورگ، روغنی، کروچ، شکاش، مکھی، موزاوتی، الینی، ربائی، جواں سہر اور ڈنڈالی شامل ہیں۔ (8) مکران کی کھجور میں شکری مقدار کافی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے خوراک کے علاوہ صنعتی پراسسنگ کے کام بھی آتی ہے۔ اس میں تقریباً انسانی ضروریات کے سارے اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ جتنی توانائی ایک درمیانے سائز کا سیب دیتا ہے، پانچ، چھ دانے کھجور اس سے گنی توانائی دیتے ہیں۔ کھجور کی فارمنگ برآمدات کے لیے ڈویلپ کی جاسکتی ہے۔ ذریعہ اسماعیل خان کی طرح غیر معمولی لمبی کھجور بلوچستان میں بھی کاشت کی جاسکتی ہے۔ جس کی بالخصوص بہت برآمدی قیمت مل سکتی ہے اور جس کی عرب ممالک میں بہت مانگ ہے۔ کھجور سے جام، مٹھائیاں، جوس وغیرہ بنتے ہیں۔ ہمارا کھجور کراچی میں پراسیس ہو کر وہاں سے برآمد ہوتا ہے۔

بلوچستان میں آلو کی پیداوار 1975-76 میں 18 ہزار ٹن تھی۔ جبکہ 1984-85 میں یہ بڑھ کر 79.4 ٹن ہو گئی۔ آلو کو پراسیس کر کے Potato Rice اور Dehydrated Potato Granules , Potato Flour بنا سکتے ہیں۔

زیرہ قلات جیسے علاقوں میں بڑے پیمانے پر کاشت کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زعفران بھی۔ زعفران کی پیداوار کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ مقامی مارکیٹ کے علاوہ اس کی برآمد کے

والے آدمی کو اپنے اندر نہ چھوڑا جائے۔ قبائلی بندشیں اس قدر سخت کی ہوئی ہیں کہ آدمی جا کر دوسروں کے گھر بیٹھتا ہے، بھیگ مانگتا ہے، قرض لیتا ہے اور اس زمین پر شفعہ کر کے اسے اپنے لیے خرید لیتا ہے۔ قبائلی نظام کو برقرار رکھنے والوں نے سارے انتظامات کر رکھے ہیں جہاں کوئی سوراخ، کوئی دراڑ رہ نہ جائے، لیکن لوح محفوظ کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ جاگیر داری اور سرمایہ داری کے آلات کنکریٹ کی ہر سخت و مضبوط دیوار میں اپنی کرامت سے اچانک بڑے بڑے سرنگ بنا ڈالتے ہیں اور اپنے رواج مروج کر دیتے ہیں۔ سرمایہ برگزیدہ چیز ہے جو ذات، قبیلہ، رنگ، نسل اور مذہب سے بہت بلند ہوتا ہے۔ یہ کوئی سرحد، کوئی باؤنڈری نہیں مانتا، کسی کی بڑائی اور عظمت کو تسلیم نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلیت کی ساری مضبوطی کی موجودگی میں ایک چالاک شخص نے سارے علاقے کی زرخیز زمینیں اس طرح جھپٹ کر اپنی بنالیں کہ بلوچ بے چارے کو پتہ بھی نہ چلا۔ وہ ابھی تک اپنی دنیا میں اس طرح منہمک ہے کہ اس کے لیے گویا دنیا اسی پرانی ڈگر پر چلی رہی ہو۔

3۔ لُٹ آف کے پیداواری رشتے

کسان اور فیوڈل

کسان بننے کے معاہدہ کی شرائط کسان کے لیے بالکل ناروا اور غیر انسانی ہوتی ہیں۔ معاہدہ کے وقت فیوڈل اسے کچھ رقم (آٹھ یا دس ہزار روپیہ) بطور قرض دیتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ فصل اٹھاتے وقت کسان کے حصے سے فیوڈل کا قرض چکانا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کسان کے لیے کھانے کے لیے غلہ نہیں بچتا اس لیے وہ فیوڈل کی منت سماجت کرتا ہے اور اپنے حصے کا کچھ غلہ اپنے گھر لاتا ہے اس لیے کہ اس کا خاندان بھوکا ہوتا ہے۔ تین چار ماہ بعد یہ غلہ ختم ہو جاتا ہے، اس لیے وہ پھر مالک کے پاس جا کر قرض لیتا ہے۔ اس کی ادائیگی پھر فصل کے وقت ہونی ہوتی ہے۔ وہاں بھی پورا قرض نہیں چکتا۔ لہذا اس کا کسان ہونا دوام پاتا ہے۔ بزرگری اور مقروضی، دین و دنیا کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ اس دوران بیماری، شادی بیاہ، غم، جرمانہ یا خیرات وغیرہ کرنا ہو تو پھر جا کر قرض لیتا ہے، پھر فصل اٹھانے کے وقت منت سماجت!۔ یہ شیطانی سلسلہ ساری زندگی بھر چلتا

گوزلی، چرپان، مالکی، جدگالی، پیشپاگ، مشوری، پٹولی، گوک ناہ، ربئی، کلوت، سبز و۔ (3)

مکران میں زمین کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جن کے پاس پانی نہیں ہوتا وہ لوگ پانی والوں سے پانی حاصل کرتے ہیں۔ درزادہ کے پاس کبھی کبھی زمین کا پلاٹ ہوتا ہے۔ اور پانی ہوتا ہے مگر یہ شاذ و نادر ہوتا ہے۔ روایتی لوہار ہوتے ہیں جو زرعی اوزار بناتے رہتے ہیں۔ کھجور سے وابستہ پوری معیشت قابل مطالعہ ہے۔

شفع (شبہ)

شفع بلوچستان میں بہت زیادہ ہے۔ سرکاری شفیع اور ہے اور شرعی شفیع اور ہے۔ مگر بلوچ کا شفیع جدا بھی ہے، پیچیدہ بھی اور لڑائی جھگڑا اور کش بہ گیری کی ایک بہت بڑی وجہ بھی۔ بس دعا کریں کہ کوئی اراضی نہ خریدے، اراضی کا سودا نہ ہو اور اراضی لب چٹی (جرمانے) کے عوض لی دی نہ جائے۔ شفیع لگ جائے یا نہیں مگر لوکل عدالت اور کھینچا تانی ضروری ہوتی ہے۔ زمین کی خرید و فروخت کے 9 ماہ کے اندر اندر اگر شفیع کی بات کی تو ٹھیک، ورنہ اگر لیٹ ہو گئے تو کوئی آپ کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ ہاں اگر شفیع کرنے والا علاقے میں موجود نہ ہو تو 11 ماہ کے اندر اندر اسے نوٹس دینے کی رعایت ہے۔

چرک

زمین جب پانی سے بھر جائے تو زائد پانی نچلے یا اگلے بند یا کھیت کو دیا جاتا ہے۔ اس پانی کو چرک کہتے ہیں۔ بنو (بند) کا چرک آتا ہے نمبر 1 پر، پھر نمبر 1 کا چرک نمبر 2 پر اور کھیت نمبر 2 کا چرک نمبر 3 پر..... یہ نمبر اسی ترتیب سے شفیع کا پہلا حق رکھتے ہیں۔ یعنی لوڑ اور چرک (کھانے) والے آدمی شفیع کا پہلے حق رکھتے ہیں۔ اگر وہ شفیع نہ کریں تب اوپر کے ملحقہ کھیت کے مالک یعنی ”A“ والے کا حق ہے کہ شفیع کرے اور زمین کی قیمت دے کر زمین اپنی کر لے۔ اگر وہ بھی شفیع نہ کرے تو اوپر کے بازو یعنی ”B“ کا مالک خود کو شفیع کے لیے تیار رکھتا ہے۔ اگر وہ بھی نہ کرے تو بائیں بازو کے پڑوسی یعنی ”C“ والے ہمت کریں گے۔ یہ شفیع اس وقت جائز نہ ہوگا اگر درمیان میں ندی پڑ جائے، یا آدمی کے قد سے بلند پہاڑی ہو۔ مختصر یہ کہ یہ مردانگی اور غیرت کا کام ہے کہ باہر

رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس دوران بزرگ اگر اس کی زمین چھوڑنا چاہے تو وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ دوسرا کوئی فیوڈل تلاش کرے جو اپنی جیب سے اس کا قرض ادا کرے اور دو تین ہزار مزید کسان کو دے تاکہ اس کا گزارہ ہو سکے۔ اس طرح کسان کو اب اس نئے فیوڈل کی محنت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ کسان اپنے مالک کی شکل و صورت تو بدل سکتا ہے مگر بغیر مالک بالکل نہیں رہ پاتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہم عوام یعنی ووٹر اپنے لیڈر بدل سکتے ہیں مگر خود ووٹر والی اپنی حیثیت بدل نہیں سکتے۔ (9)

فیوڈل اور کسان کے درمیان پیداواران باتوں پر تقسیم ہوتی ہے کہ زمین کس کی ہے، بیل کس کے ہیں، محنت کون کتنی کرتا ہے، زمین اچھی ہے یا ویسے ہی ہے۔ زکوٰۃ خیرات، پیر کا حصہ مشترکہ خرمن سے نکلتا ہے۔ پیداواری رشتے فیوڈل اور کسان کے ہیں مگر شرائط الگ الگ ہیں؛

ششک

سردار زمین کا چھٹا حصہ الگ لے جاتا تھا۔ اور اس کے بعد قبائلیوں کی بقیہ زمین کی پیداوار سے بھی چھٹا حصہ سردار لے جاتا تھا۔

زمین کا مالک زمین کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں دیتا..... نہ بیل، نہ ٹیل، نہ خرچ..... اور پیداوار کا چھٹا حصہ لے جاتا ہے۔ اس کا فائدہ کسان کو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی فصل کاشت کرتا ہے اور اس سلسلہ میں فیوڈل کی مداخلت سے آزاد ہوتا ہے۔ زیادہ تر اس کسان کو نکالا بھی نہیں جاتا اور تبدیل بھی نہیں کیا جاسکتا۔

چیارک

کسان کو سال کی دونوں فصلیں کاشت کرنی ہوتی ہیں اور غلہ اور بھوسہ و دیگر فائدوں کا چوتھا حصہ کسان کا ہے۔ کسان تخم نہیں دیتا۔ ہشتر، گوٹ اور گیلی مٹی پر اخراجات کا چوتھائی اسے دینا پڑتا ہے۔ وہ بازو کا کام کرتا ہے۔ (خرمن کا غلہ صاف کرتا ہے، کٹائی کرتا ہے، ہل چلاتا ہے)۔ بیل فیوڈل کے ہوتے ہیں۔

سیک

بیل یہاں بھی فیوڈل کے ہیں لیکن کسانوں کو یہ بیل اپنے گھر رکھنے پڑتے ہیں اور انہیں کھلانا پڑتا ہے۔ بیج بھی فیوڈل دیتا ہے۔ ہر پیداوار کا تیسرا حصہ کسان کا ہوتا ہے۔

نصف

یہاں بیلوں کا جوڑا کسان کا ہوتا ہے۔ تخم فیوڈل اور کسان کو برابر برابر دینا ہوتا ہے۔ محنت کسان کی ہوتی ہے۔ آمدن اور خرچ آدھو آدھ ہوتی ہے۔ فیوڈلزم کی یہ شکل غیر حاضر فیوڈل کی زمینوں پر ہوتی ہے۔

مالك كا تهائي حصہ

یہاں زمین مالک کی ہوتی ہے۔ باقی سارا جبال کسان کو کرنا پڑتا ہے۔ تخم اور دیگر خرچ سارا کسان کا اور اسی طرح سارے دیگر فائدے بھی کسان کے ذمے ہوتے ہیں۔

بوھروئی

زمین فیوڈل کی ہے۔ وہ اسے کسان کو دیتا ہے۔ شرط یہ رکھتا ہے کہ کسان سال کا ایک معین مقدار غلہ اسے دے گا۔

پتی

یہاں کسان بقیہ زمین پر تو معاہدے کی شرائط کے مطابق بزرگ کرتا ہے مگر کسی ایک کھیت، یا کسی ایک بند کی ساری فصل کسان اپنے فیوڈل کو تحفہ میں دیتا ہے۔

کندھوئی

بیل لاتا ہے، سال تک اسے استعمال کرتا ہے۔ اس کا معاوضہ وہ ایک خاص متعین مقدار میں غلہ کی صورت میں دیتا ہے۔ یہ غلہ پیداوار کی مقدار سے بندھا ہوا نہیں ہوتا۔

روزانہ اجرت

بلوچستان بھر میں نقد اور فصلوں کی کاشت کا رواج بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ان فصلوں میں پیاز، سبزیاں، تمباکو، چارہ، میوے اور کپاس شامل ہیں۔ نقد اور زراعت میں روزانہ

یہ کام سرانجام دیتے، کھانا کھاتے اور واپس اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ قدیم انسانی سماج کے بارے میں آج کی علمی تحقیق اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ان کا طبعی ماحول انہیں اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ اکٹھے ہو کر کام کریں اور محنت کے ثمر کو مل کر کھائیں۔

تاریخ میں زوراک دوم توران کا اعلیٰ امیر گزرا ہے جس نے اپنی امارت کے وقت ہشتر کو رواج دیا تھا۔ اہم اور بہت بڑے کام اس رواج کی وجہ سے بہت جلد تکمیل کو پہنچے۔ اس کے نتیجے میں سر زمین توران کے ایک سرے سے دوسرے سے تک دشمنوں میں لا تعداد بند آہ تعمیر ہوئے۔ ایسا کام جو لوگوں کی بڑی تعداد سرانجام دے اسے ہشتر کہا جاتا ہے۔ (13) ہشتر کا لفظ وہیں استعمال ہوتا ہے جہاں پہ یہ کام مرد کرتے ہوں۔ عورتوں کے مل کر کام کرنے کو ہشتر نہیں کہتے حالانکہ وہ بھی ایک دوسرے کی مدد کے لیے اکٹھی ہو جاتی ہیں، چائے اور کھانا مل کر بناتی ہیں، اپنا کام مکمل کرتی ہیں اور روانہ ہوتی ہیں اپنے آقا (خاوند) کے گھر۔ وہ شادی کی چٹائی کے لیے مل کر پیش لاتی ہیں، پیش کو مل کر بناتی ہیں، بنتی ہیں مگر اس کو ہشتر کہنے کی اصطلاح نہیں بننے دی گئی۔ (کم اصل کا واہر کیا، کم اصل کا ہشتر کیا؟)۔ اسی طرح وہ شادی کی تیج مل کر سیتی ہیں، شادی بیاہ کی دعوت کا کھانا مل کر پکاتی ہیں، فصل کی کٹائی مل کر کرتی ہیں مگر حرام ہے اگر ”ہشتر“ کا لفظ ان کے لیے استعمال ہو۔

بلوچ ہر اس کام کو ہشتر کہتے ہیں جسے گاؤں کے بہت سے افراد مل کر کرتے ہیں۔ کاشتکاری، گھر اور مکان کی تعمیر، راستہ اور سڑک کی مرمت، مختصر یہ کہ جس وقت بہت سے مرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اپنے کسی مشترکہ کام کے لیے یا ایک شخص کے کام کے لیے، وہ ہشتر ہے۔

مالک صرف انہیں اور ان کے جانوروں کو اس ٹائم کا کھانا اور چارہ دیتا ہے (14)۔ دکھ، تکلیف، جرمانہ، ناگمان، بیماری تو ہر کسی پر آ سکتے ہیں۔ آج اس کی باری ہے تو کل اُس کی۔ آج تم پہ آئی ہے کل مجھ پر آ سکتی ہے۔ اس لیے ہر کوئی جا کر اپنا کندھا دیتا ہے تاکہ آج اس کا کام آسان ہو جائے تو کل خود اس کا اپنا بار ہلکا ہو جائے گا۔ واہر اور ہشتر اس لیے لازم ہیں۔

ہشتر سندھ میں بھی ہوتا ہے اور پنجاب میں بھی۔ سندھ میں اسے ”ونگار“ کہتے ہیں۔ یہ لفظ بلوچستان کے نصیر آباد ڈویژن میں بھی ”ہشتر“ کی جگہ استعمال ہوتا ہے، اور استعمال بھی اپنے

اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح زراعت میں مشینوں کے استعمال سے بھی ان مشینوں سے وابستہ مزدوروں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

وسطی بلوچستان میں البتہ موروثی کسان گیری اس زمین پر ہوتی ہے جس کے لیے لوگوں کے پاس انفرادی ایک مخصوص وقت تک کے حقوق ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ بالخصوص بارانی علاقوں (مستنگ، قلات، خضدار اور خاران اضلاع) میں عام ہے۔ موروثی کسان گیری حقوق کو عموماً بیچا اور کسی اور کو کرایہ پر دیا کیا جاسکتا ہے۔ اگر بیچا جائے تو لازم ہے کہ کسان گیری کے حقوق پہلے زمین کے مالک کو پیش کیے جائیں۔ اسی طرح اگر زمین کا مالک زمین کو فروخت کرے تو پہلی پیشکش کسان کو دی جائے۔ اپنی مرضی سے کسان بننے والی صورت مکران اور کچھی کے کچھ حصوں میں عام ہے جہاں ایسا سمجھوتہ ہر سال نیا ہو جاتا ہے۔

ہشتر، مشر، واہر

ہشتر میں نے جان بوجھ کر ”ح“ سے نہیں لکھا اس لیے کہ لوگوں کو خواہ مخواہ کا شوق ہے کہ ہر چیز کو لے جا کر عربوں سے ملا دیں۔ ہشتر کے بارے میں بھی میں نے دو تین جگہ پر دیکھا کہ یاروں نے ”ہشتر“ کے لفظ کے ناک میں نیل ڈال کر اس کی مہار کھینچ کھینچ کر اسے سعودی عرب جا پہنچایا۔ مثلاً فیروز سنز (10) کے منبع سے حفیظ بزدار (11) یہ دور کی کوڑی لائے کہ ہشتر عربی کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے ”شامل کرنا“ یا ”شامل ہونا“۔ اللہ ہماری ہدایت کرے۔ لفظ ”ہشتر“ قدیم آریائی لفظ ہے۔ (12) یہ صرف ہمارے علاقے میں استعمال ہوتا ہے۔ صرف بلوچ، پشتون و دیگر پڑوسی اقوام اس لفظ کے معانی اور اس کی وسعت سے واقف ہیں۔

بلوچوں کے اندر دوسرے لفظوں کی طرح اس لفظ کی بھی بے شمار صورتیں، شکلیں ہیں۔ یہ لفظ اصل میں زمین کے تقسیم ہونے اور نجی ملکیت میں جانے کے بعد کا لفظ ہے جبکہ بڑے کام ایک شخص یا دو تین افراد سے نہیں ہو سکتے تھے۔ مزدوری کا رواج بھی نہ تھا اور نہ مزدور کو اجرت دینے کے لیے کرنسی مروج تھی۔ صرف ایک صورت تھی، اور وہ یہ کہ کام کرنے والے افراد جمع ہو جاتے اور مل کر

پیٹ حد سے زیادہ بھرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ اگلا شکار جلد نل پائے اور بھوک سے مرنا پڑے۔“
(16) بات خواہ آباؤ اجداد کی مشکل زندگانی اور خوراک کی نایابی کی ہو یا آج کے استحصالی سماج میں خوراک کی غیر مساوی تقسیم کی ہو، یا پھر کسان کی طرف سے گوشت کو لڑی میں پرو کر سرعام نمائش کرنے کی شوبازی ہو، مگر سچی بات یہ ہے کہ جب بھی سیخ پر پروئے ہوئے گوشت کے ساتھ کوئی کسان گزرے تو دل کہتا ہے کہ اگر بس چلتا تو جھپٹ کر گوشت کی دو تین بوٹیاں سیخ سے توڑ کر نگل جاؤں۔ بعد میں دیکھا جائے گا کہ کسان لاٹھی مارتا ہے یا پتھر۔

گوشت کو سیخ میں لگا کر گھر کی طرف لے جانے کا رواج بلوچوں میں الگ الگ ہے۔ مثلاً مری میں بھاری گوشت گھر لے جاتا ہے۔ لوہارانی اور گزینی گوشت گھر نہیں لے جاتے۔ بلکہ وہاں ہشتر کا مالک گوشت لاتا ہے اور پاتار (چٹائی کے اوپر سجا کر رکھ دیتا ہے۔ اور سارے ہشتری، معاہدے کے مطابق پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ انہیں پیٹ بھر کر کھانا لازمی ہوتا ہے۔ جب ڈکار مار کر ہشتری روانہ ہو جاتے ہیں تو باقی بچا ہوا گوشت مالک کا ہوتا ہے۔ کسان (ہشتری) روٹی اور سالن کو منہ بھی نہیں لگاتے۔ مگر بھاریانی میں کسان زور دیتا ہے تریٹ کی تھالی پر۔ اور اپنا گوشت کا حصہ عموماً کھیت پر نہیں کھاتا بلکہ گھر لے جاتا ہے۔ ہشتر کا تریٹ اس لیے زبردست ہوتا ہے کہ اس میں سالن سے بھرے تھال میں روٹی ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھانے سے قبل ڈال دی جاتی ہے اور اس کے اوپر چینی یا گڑ چھڑکا جاتا ہے۔

گوشت کے حصہ داروں میں دو افراد کا اضافہ کر کے اسے برابر بانٹ دیا جاتا ہے۔ ایک فرد تو کھیت کا مالک ہوتا ہے، دوسری مالکن۔ باقی ہشتریوں کا۔ ذبح کیے ہوئے مویشیوں کی کھال بھوتار (مالک) کی ہوتی ہے۔ باقی پائے سے لے کر اوجھری تک سب وہیں تقسیم ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں چھوڑنا ہوتا۔ ایک سے زیادہ مویشی ذبح کرنے کی صورت میں ہر مویشی پر ایک اضافی حصہ (بھوتار) کا ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ گوشت ہشتری کے علاوہ کوئی اور نہیں کھاتا، نہ ہی کسی اور کو دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی کو کھانا چاہیں بھی تو اسے رواجاً انکار کرنا ہوتا ہے۔ (جو کام کرے وہی کھائے!)۔ کسان جب اپنا حصہ (سیخ پر لٹکائے ہوئے) گھر لاتا ہے تو آدھا حصہ خود رکھتا ہے اور

وسیع معنوں میں ہوتا ہے۔ کچھ پشتون اسے پکاڑا کہتے ہیں۔ (15) مگر صوبہ سرحد میں اسے ہشتر ہی کہتے ہیں۔ ازبکستان میں بھی اس مشترکہ محنت کا نام ہشتر رہا ہے۔ روسیوں نے اُسے ”سپیونک“ کا نام دے رکھا ہے۔

آج کل بلوچ عموماً ہشتر کو صرف زراعت تک محدود کرتے ہیں۔ وہ ہل یا کین چلانے کے رضا کارانہ، بلا معاوضہ، اجتماعی کام کو ہشتر کہتے ہیں۔ بیلوں کا جوڑا بھیجا جاتا ہے ہل چلانے والے کے ساتھ۔ ہل چلانے والا مالک خود بھی ہو سکتا ہے اور اس کا بزرگ (راہب) بھی۔ ہشتر میں کام کرنے والوں کو ”ہشتری“ کہتے ہیں۔ جس آدمی نے اپنے کھیت میں ہشتر سے کام کرنا ہوتا ہے، وہ ایک دو روز قبل ہشتر کے دن کی درخواست نما اطلاع ہشتریوں کو دیتا ہے اور ان سے شراکت کا اصرار کرتا ہے۔ وہ کام کی نوعیت اور حد بتاتا ہے اور بیلوں کے جوڑے سمیت ہشتری کو ”مانگتا“ ہے۔ اگر کین کا کام ہو تو کین اور ہل دونوں لے جانے پڑتے ہیں۔ اگر صرف ہل کا کام ہے تو صرف ہل لے جانا ہوتا ہے۔ اس کام میں کوئی منت اور احسان نہیں ہے۔ یہ امداد باہمی کا کام ہے۔ ہر ایک روایتاً مانگتا ہے اور ہر ایک روایتاً تیار ہو جاتا ہے۔

ہشتر کی بات جب بھی ہوتی ہے تو بلوچ کے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے آدھے گز کی سیخ نما وہ چھڑی آ جاتی ہے جس پر آخر تک ابلا ہوا گوشت پرویا ہوتا ہے۔ گوشت کے ابلے ہوئے خوبصورت اور موئے موئے ٹکڑے، کبجی کے ٹکڑے، چربی کی چکیاں..... ہر کسان اس پروئے ہوئے گوشت کی لڑی کو ہاتھ میں تھامے نمائش کے طور پر نمایاں کرتا ہوا چلا جاتا ہے اپنے گھر کی طرف۔ اگر ہشتری کم از کم سات افراد ہیں تو مالک ایک دنبہ (کم از کم) ان کے لیے ذبح کرتا ہے۔ اگر سات افراد سے زیادہ ہوں تو دو، تین یا افراد کے تناسب سے اس سے بھی زیادہ دنبے لازماً ذبح کرنے پڑتے ہیں۔

ول ڈورانٹ نے لکھا کہ، ”ہمارے اندر لالچ، حرص اور لڑاکا پن، اس خاطر ہے کہ ہمارے ذہن میں ان ہزاروں لاکھوں سالوں کی یادداشت موجود ہے جب ہمارے آباؤ اجداد کو زندہ رہنے کے لیے دوڑ، بھاگ، لڑائی، مار دھاڑ لازماً کرنا پڑتی تھی۔ وہ اس خوف کے سبب اپنا

مالک کو مانگنے پڑتے ہیں۔

واہر بھی ایک رضا کارانہ امداد باہمی ہوتی ہے۔ یہاں لوگ بیلوں کی جوڑی خود لے جاتے ہیں۔ مانگنا نہیں پڑتا۔ یہ نسبتاً بے ساختہ و خود کار امداد ہوتی ہے جو عزیز، رشتہ دار، پڑوسی یا دوست دوسرے کسان کو کام میں دیتے ہیں۔

در اصل یہ سارے مظاہر آپس میں مدد و تعاون کے معاہدے ہیں۔ یہ معاہدے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ آٹو میٹک طور پر ایک دوسرے کے کام آنے کے رواج ہیں۔ یہ تو انہیں نہ کسی ملا مولوی نے بنائے اور نہ کسی سرکار سردار نے اور نہ ہی کسی کمیٹی یا کمیونسٹ پارٹی نے۔ یہ تو شکستہ و ریختہ قدیم سماج کی اپنی پس ماندہ اچھائی ہے۔ اور یہ قانون صرف ایک علاقے میں نہیں ہے بلکہ سارے بلوچ میں، پشتون اور سندھ و ہندوستان پوری دنیا میں چھوٹے بڑے فرق کے ساتھ موجود رہا ہے۔ یہ سماج کی سلامتی اور صحت مندی کی ایک علامت، ایک نشانی ہے۔ ایک دوسرے سے ہمدردی اور ہمدردی کی علامت۔ بھائی چارے اور کار میڈ شپ بڑھتی ہے، دکھ سکھ کا احساس ہوتا ہے، اور بغواور گانے ہوتے ہیں، کسان کی چیخ و پکار، سیٹی نعرے، کوڈورڈ کا تبادلہ، حال احوال، الغرض سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ کسان کے کلچر کی بھرپور نمائندہ چیز ہوتی ہے۔ ہشر، ہشر اور واہر زندگی کے ہر پہلو کو امیر بناتے ہیں۔ یہاں زندگی کے مسائل پر بات ہوتی ہے۔ اور اجتماعی چیخ و پکار سے حل ہوتے ہیں۔

ہشر، ہشر اور واہر اتنے پیارے رواج ہیں کہ غریب، امیر، بے بس، طاقتور سب کو فائدہ دیتے ہیں۔ علاقہ خواہ ساتیں والی کا ہو یا سانبیر یا کا، لیڈر خواہ کاسٹرو ہو یا کوئی کہور خان زئی (مری کا ایک قبیلہ ہے) ہو، نظام خواہ قدیم کمیونزم ہو یا ترقی یافتہ سوشلزم کا، میلے کچیلے اور بے شعور بلوچ کے ہشر، ہشر اور واہر کا دستور ہر کسی کو اپنانا ہوتا ہے۔ انسان اور حیوان کے اندر فرق ان میں ہشر کی موجودگی یا غیر موجودگی میں ہوتا ہے۔

آدھا بیلوں کے مالک یعنی اپنے مالک کو (جس کا وہ بزرگ ہوتا ہے) بھیج دیتا ہے۔ (بیلوں کا یہ بد بخت حصہ ہشر کے گوشت سے لے کر فصل کی پیداوار تک بزرگ کو اپنے مالک کو دینا ہوتا ہے۔ وہ بیچارہ اپنی محنت کا پھل مکمل طور پر اس لیے نہیں رکھ سکتا کہ نہ ذرائع پیداوار (زمین) اس کی اپنی ہوتی ہے اور نہ آلات پیداوار یعنی بیل بل وغیرہ اس کے اپنے ہوتے ہیں)۔

یہ تو تھا اس کھانے کا حصہ جو کام کے ختم کرنے پر دیا جاتا ہے۔ رات کا کھانا کوئی نہیں دیتا۔ صبح کھانے کے لیے (سالن وغیرہ) مہیا کرنا پڑتا ہے ہشر کے مالک کو۔ جب کہ روٹی وہ ہشر میں حصہ لینے والے کسانوں کے گھروں سے اکٹھی کر کے لاتا ہے۔ دوپہر کی روٹی اور سالن مالک کو مہیا کرنا ہوتا ہے۔ کسانوں کو تھوڑی دیر تک آرام دلانے کے لیے آئے ہوئے متبادل افراد کو بھی دوپہر کا کھانا مالک ہی دیتا ہے۔ بیلوں کا چارہ موسم کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اگر ہشر ایک ایسے موسم میں ہو رہا ہو کہ سبز چارہ کھیت پر میسر ہے تو کھانے کے وقفے کے دوران بیلوں کو بھی چارہ دیتا ہے مالک۔ ناشتہ ظاہر ہے کہ جانور نہیں کھاتے صرف ہشری یہ عیاشی کر سکتے ہیں ہشر کے بھوتار کے خرچ پر۔

آلات یعنی بیل، کین، بچ وغیرہ کھیت تک اٹھالے جانے کی ذمہ داری ہشر کے مالک کی ہوتی ہے جبکہ انہیں واپس ہر ہشری خود لاتا ہے۔

جان محمد (۱۶) نے ہشر کے ہم معنی ایک لفظ کی تفصیل دی ہے جس کا نام ”ہواچک“ ہے۔ میں نے یہاں وہاں سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ ”جنگور میں ہشر کو ”ہواچک“ کہتے ہیں۔ تربت کے علاقے میں ہشر اور ہواچک دونوں مستعمل ہیں۔ مگر مشرقی قبائل کے ہشر سے اس کا فرق یہ ہے کہ وہاں صرف بیل اور کین کے اجتماعی کام کو ہشر کہا جاتا ہے جبکہ ”جنگور میں لوگ ہر اجتماعی کام کو ہواچک کہتے ہیں۔

مشر بھی ہوتا تو ہشر کی طرح ہے۔ مگر اس میں بیل کے جوڑے پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ دنبہ عموماً ذبح کیا جاتا ہے مگر لازم نہیں ہے۔ بس صبح شام کا کھانا دینا پڑتا ہے۔ یہ کھانا دوسرا مہمان یا مسافر بھی کھا سکتا ہے۔ گوشت گھر کوئی نہیں لے جاتا۔ بیل کا جوڑا اور کسان یہاں بھی

حوالہ جات

- 1- ول ڈورانت / ظفر الحسن ”تاریخ کیا سکھاتی ہے؟“۔ 1990، روہتاس بکس، ٹمپل روڈ لاہور۔ صفحہ نمبر 17۔
- 2- ڈسٹرکٹ پروفائل سی۔ صفحہ نمبر 29۔
- 3- گزٹئیر آف بلوچستان۔ کچھی۔ دوسرا ایڈیشن، 1986۔ گوشہ ادب کوئٹہ، صفحہ نمبر 93۔
- 4- سی گزٹئیر، صفحہ نمبر 111۔
- 5- محبوب رضا، صفحہ نمبر 34۔
- 6- سید، مجیب رضا، Investment Opportunities in Balochistan۔ الوہاب پرنٹرز کراچی، صفحہ نمبر 34۔
- 7- سید، مجیب رضا، Investment Opportunities in Balochistan۔ الوہاب پرنٹرز کراچی، صفحہ نمبر 118۔
- 8- کیچ پروفائل، صفحہ نمبر 37۔
- 9- نودھانی، عوامی جمہوریت لاہور۔
- 10- فیروز سنز انسائیکلو پیڈیا 1984، تیسرا ایڈیشن۔ فیروز سنز لاہور، صفحہ نمبر 430۔
- 11- بزدار، عبدالحمید۔ ”ہشتر“۔ کوآپریٹو سیلف ہیپ ان بلوچستان، پمفلٹ۔
- 12- عطائی، ابراہیم، ”خیل اوولش“۔ 1981۔ افغانستان اکیڈمی آف سائنسز کابل، صفحہ نمبر 32۔
- 13- اخوند صالح محمد / عبداللہ جان، نادر قمرانی۔ ”گوردگل ناک“۔ 1994، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ نمبر 26۔
- 14- گزٹئیر آف بلوچستان، جہالاوان۔ 1986، گوشہ ادب کوئٹہ۔ صفحہ نمبر 112۔
- 15- عطائی، خیل اوولش۔ صفحہ نمبر 43۔
- 16- ول ڈورانت / ظفر الحسن، ”تاریخ کیا سکھاتی ہے؟“۔ 1990، صفحہ نمبر 20۔
- 17- جان محمد، ”دی بلوچ کلچرل ہییری ٹیج“، 1982۔ رائل بک کمپنی کراچی۔ صفحہ نمبر 64۔

چوتھا باب

سمندری پیداواری رشتے

بلوچ ساحل پر مچھلی کی 350 سے زائد اقسام کی موجودگی ثابت ہو چکی ہے۔ سمندری ممالیہ حیات میں ڈولفن، Propoises، دودھ پلانے والی مچھلیاں اور وہیل پائے جاتے ہیں۔ سمندری کچھوے تو دنیا جانتی ہے کہ بچے جننے کے لیے مکران کے ساحلوں کا دورہ کرتے ہیں۔ Taq، جزیرہ استولا، حیوانی، اور گنز سمندری کچھوے کیلئے اہم آشیانے ہیں۔ سبز کھوا اور زیتون، Riddle کچھوے دونوں بلوچ ساحل پر پائے جاتے ہیں۔ آئیے ہم صرف بلوچ سمندر کی مچھلیوں کی قسموں پر ایک نظر دوڑائیں۔

پاگاس (شارک)

ہم خشکی کے رہنے والوں کیلئے جب بھی شارک اور وہیل مچھلی کا نام آتا ہے تو ہم ٹی وی پہ دیکھے اور کتابوں میں پڑھے ہوئے دیوہیکل اور آدم خور سمندری بلاؤں کا سوچتے ہیں۔ مگر بلوچ سمندر میں اس بڑے مہلک شارک کا سال ساز پایا جاتا ہے جو محض دس بیس سیر کا ہوتا ہے اسے ہمارے محنت کے ولی پکڑتے ہیں، صاف کرتے ہیں اور تازہ یا پھر خشک کر کے سری لنکا برآمد کرتے ہیں۔ یہاں کے چھوٹے شارکوں کے نام ہیں:۔ بمپل، سورا زپی، گوئی، سیاہ گوش، کالی زید، جروٹی، بارکالی، گورک، کانٹو، جومبو، گسو، جتی وغیرہ وغیرہ۔

کھانے کی مچھلیاں

کھانے کی بڑی مچھلی کی قسمیں یہ ہیں:

گور، گنران، سنگلور، کرڑ، سولی، سارم، سونام، گیدر، کرڑہ، تولگ، گور، اہور، گورچک، کلگن، گزی گواز، الس، کشگی، کندو۔ وغیرہ۔

کھانے کی درمیانی مچھلیوں کے نام یہ ہیں:

سہرو، گدیر، سفیت، تنگم، سیاہیں تنگم، گوانز، مشکو، سولی چک، سیاہو، نامبو، چیلانکر، بڈی، پنڈاسی، پشت، تاکاں، بولا، جاراڑ، پتر، ککاون، سہرپ، سہرپیگ، چیل، دولٹ، کلا نچو، چانچو، کنلو، چاہ، ٹنیل، الولو، آدھے کلاہ، کلونٹو، ماہ پری، ٹانٹار، ٹونٹ، لونڈ، چنار۔ وغیرہ۔

کھانے کی چھوٹی مچھلی کی قسمیں:

1۔ ماہی گیری

بلوچ ساحل پہ مچھلی کی تقریباً 350 سے زائد اقسام موجود ہیں۔ پران و شرمپ جیسی مہنگی برآمدی مچھلی بھی۔ ٹنوں کے حساب سے برآمدی مچھلی۔ کوئی پراسینگ سہولیات نہیں۔ سیٹھوں دلالوں (غیر بلوچ ہوتے ہیں) کی کمائی کا ایک بلوچ ذریعہ۔ تباہ حال ماہی گیر، تباہ حال بلوچ۔ گوادریپ سی پورٹ۔

جیٹی، دو بڑی دنیاؤں کو ملانے والا پلیٹ فارم ہوتا ہے، دو مختلف بری ماحالیاتی ثقافتی اور معاشی دنیاؤں کو ملانے والا پلیٹ فارم۔ ہفتوں تک سمندر میں در بدر رہنے کے بعد دو تین دن کے لیے جیٹی، ماہی گیر اور اس کی کشتی کو خشکی پر انسانی حیات کے کاروان میں شمولیت دلانے والی دلاویز جگہ ہوتی ہے۔ مگر دوسری طرف یہی وہ منحوس جگہ ہے جہاں انسانی معاشرہ کی سب سے بڑی برائی بھی شروع ہوتی ہے کہ یہیں پہ اس کا نائرس استحصال شروع ہوتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے ڈریکولا اس کی پیداوار کو سستے داموں ہتھیا کر اپنی چیزیں اس پر مہنگی فروخت کر دیتے ہیں۔

مقدار 119,000 ٹن ہے۔ جبکہ مزید 60,000 ٹن پکڑی تو جاتی ہے بلوچستان میں، مگر اتاری جاتی ہے کراچی میں۔ دونوں کو ملا کر تقریباً 2 ارب روپے سالانہ کی مچھلی بلوچ سمندر میں پکڑی جاتی ہے (ہم پھر بھی غریب صوبہ کہلائے جاتے ہیں اور مرکز خداترسی میں ہمارے صوبائی بجٹ کا خسارہ عطا کرتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وسیع صوبائی خود مختاری مالی حقوق کی دستیابی کے علاوہ ہماری عزت نفس، ہماری خودداری کے لیے بھی اشد ضروری ہے)۔

سچی بات یہ ہے کہ سمندری ماحولیات کو بگاڑے بغیر ہم تین لاکھ ٹن ماہی پکڑ سکتے ہیں۔ ابھی ہم 180,000 ٹن ماہی پکڑ سکنے کے قابل ہیں۔ یعنی ہم ابھی تک سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار ٹن مزید ماہی پکڑ سکتے ہیں۔ جس کے لیے ہمیں مزید بارہ سو کشتیوں کی ضرورت ہوگی۔ بلوچ کی ماہی گیری اور اس کا پورا عمل ابھی بہت فرسودہ اور ابتدائی ہے۔ پکڑی ہوئی مچھلی کا ایک بڑا حصہ سمندر میں ضائع ہے۔ 35 فشنگ گاؤں میں سے صرف دو (گودار، پسینی) میں فش ہاربر ہیں۔ باقیوں میں اندھیر ہی اندھیر ہے۔ فزیکل انفراسٹرکچر اور ساحل پر سہولیات کی غیر موجودگی میں مچھلی ابھی تک بے حجاب اورنگی زمین پہ پینڈل کی جاتی ہے۔ جہاں ہر قسم کی گندگی پڑی ہوتی ہے اور اتر ہائی جین جلد ہی مچھلی کی کوالٹی خراب کر دیتی ہے۔ اس فوری سڑاند کے نتیجے میں ماہی کا 70 فیصد ضائع ہو جاتا ہے۔ بڑی سائز کا شرمپ اور لائسنسڈ دایسی اجناس ہیں جنہیں پکڑ کے فوراً بعد برف میں رکھا جاتا ہے۔ چھوٹی سائز کے شرمپ (کڈی) کو بھی بید کی ٹوکریوں میں برف میں رکھا جاتا ہے۔ کچھ ماہی گیری کی کشتیوں میں Insulated (پولی سٹرین) کے ڈبے ہوتے ہیں جن میں ”جیرا“ گریڈ کے شرمپ کو رکھا جاتا ہے۔

فش ہاربر پہنچ کر پکڑی ہوئی مچھلی اتاری جاتی ہے اور ”جیرا“ کے علاوہ ساری مچھلی کو نیلامی کے ہال میں فرش پر پٹخ دیا جاتا ہے۔ ڈھیر لگ جاتے ہیں اتارنے اور نکالام کرنے کے دوران۔ طویل دورانیہ (10 سے 30 دن) کے ٹرپ میں پکڑی مچھلی کو جہاز کے تختے پر ہی صاف کیا جاتا ہے۔ یہ طریقے بہت ہی ضیاع والے ہیں۔ قیمتی ماہی کے لیے برف کے سٹوریج کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ جبکہ بقیہ ماہی مثلاً پاگاس، ڈول فش، کیٹ فش، سپینش سیل فش، کوئین فش، میکزلرز، مارلنز، اور

لوزر (sardines)، مربہ، پلو، مینگ، تاگاں، گواریز، مرو، سواسک، کلٹر، بوقی، بڈنی، اشور، پالیڈی، دنگولی وغیرہ۔ مچھلی کی کچھ اور قسمیں یہ ہیں:

سکیت، رے، ٹونا، سائمن، ٹراؤٹ، باس، کراکر، پریچ، ہیرنگ، سارڈین، کارنج، گولاٹ، راکو اور پٹن وغیرہ۔ (پٹن کی اپنی مزید قسمیں ہیں مثلاً دولٹ، ہتھوڑا، ابرہ، بہرن، لیڈ وغیرہ۔

مدگ:

جب بھی آپ دنیا میں کہیں بھی کسی بڑے ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہوں تو جب مینو پر Prawns لکھا پائیں تو سمجھ لیں کہ یہ آپ کے لیے کسی بلوچ محنت کش نے پکڑے تھے۔ ایرانی بلوچستان سے لے کر پاکستانی بلوچستان میں اسے ”مدگ“ کہتے ہیں۔

یہ ہماری عام جانی پہچانی مچھلیوں سے جدا ہیں۔ ان کے جسم اور ٹانگوں پر خاص قسم کی جلد ہوتی ہے۔ ان میں نہ ہڈی ہوتی ہے نہ کانٹے۔ سارا جسم گوشت ہی گوشت ہے اور یہ گوشت پروٹین میں بہت امیر ہوتا ہے۔ اسی لیے بیرونی ممالک خصوصاً جاپان اور امریکہ میں اس کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ ”مدگ“ پسینی، گودار اور کلمت میں بہت ہوتی ہے۔

مدگ کی کئی اقسام ہیں:

جیارو، پٹاٹی، کڈی مات، ٹانیکر، شرمپ، لسو، کلری اور کڈی۔ شرمپ پاکستان میں اہمیت کے لحاظ سے سرفہرست ہے۔ یہ عموماً کم گہرے پانیوں (20-30 میٹر) میں ہوتی ہے۔ ہمارا سمندر تو سمجھیں شرمپ سے بھرا ہوا ہے۔

کلری اور جیارو بھی بیرون ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔ انہیں برف میں جما کر ہوائی جہاز کے ذریعے باہر بھیجا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نعمت بلوچستان کو حاصل نہیں ہے۔ یہ چیزیں دور کراچی میں بیٹھے سرمایہ داروں کے کنٹرول میں ہیں۔

بلوچستان کے ساحلی پانیوں میں مچھلی پکڑ کر بلوچ ساحل پر اتارنے والی مچھلی کی

نیلام والا دلال فروخت پر 4 سے 5 فیصد کمیشن لیتا ہے۔ تازہ ماہی کے خریدار یا تو مقامی مڈل مین ہوتے ہیں یا پھر کراچی والے۔ نیلامی کے دوران بھی برف استعمال نہیں ہوتی۔ کپڑی ہوئی مچھلی ساحل پر رکھی جاتی ہے جہاں سورج کی شعاعیں اور گردوغبار اس کا حشر کر دیتے ہیں۔ نیلام کے بعد ماہی کو یا تو نمک لگا کر خشک کر دیا جاتا ہے یا فروخت کے خشکی والے علاقوں کی طرف اونٹوں، گدھوں یا پک اپ پر روانہ کیا جاتا ہے۔ (کراچی، کبچہ، منجگور اور آواران) ہر جگہ کوئٹہ گارڈ والے تنگ کرتے ہیں، رشت لیتے ہیں اور مچھلی چھینتے ہیں۔

بلوچستان کی مچھلی کا دس فیصد مقامی طور پر بیچا جاتا ہے جہاں سے مقامی آبادی کا وہ حصہ اپنی ضرورت کی مچھلی خریدتا ہے جو خود ماہی گیری میں شامل نہیں ہے۔ ساحلی بلوچ ماہی خور ہے، تازہ مچھلی کھاتا ہے وہ۔ سال بارہ مہینے وہ مچھلی ہی کھاتا رہا ہے، عاشق ہے اس پر۔ کبھی کبھار جب مچھلی نہیں ملتی تو دال سبزی کھاتا ہے منہ بسور کر، بڑی کوفت سے۔

یہاں کی مچھلی پورے مکران ڈویژن کو جاتی ہے۔ بقیہ مکران ایک زمانے میں مال کے بدلے مال کے تحت مچھلی لیتا تھا، کھجور لو، مچھلی دو۔ مگر اب تو کرنسی کا، روکر کا راج ہے۔ کپڑی ہوئی مچھلی کا 25 سے 35 فیصد پاکستان کے دیگر علاقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ مچھلی تازہ بھی ہوتی ہے اور خشک قسم کی بھی۔

کراچی یا بیرونی ممالک سے کچھ برنس مین کھلے سمندر میں مچھلی خریدتے ہیں۔ اس طرح وہ پارٹ اخراجات سے بچ جاتے ہیں۔

خواہ تازہ مچھلی ہو یا خشک (یعنی سوریں) شکل میں، لازم ہے کہ یہ کراچی جائے اور وہاں سے دوسرے ممالک مثلاً سری لنکا، چین، کوریا، جاپان، سنگاپور، برطانیہ اور امریکہ کو۔ سری لنکا ہماری مچھلی خریدنے والا سب سے بڑا ملک ہے، مگر وہ قیمت بہت کم دیتا ہے۔

ماہی گیروں کے ہاں سیٹھوں اور دلالوں کے استحصال سے نجات کے لیے کبھی کبھار تنظیمیں بنتی رہتی ہیں مگر یہ کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ لیڈر شپ قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ نیز سیٹھوں اور دلالوں کے ایجنٹوں کی طرف سے بھی سازشیں ہوتی رہتی ہیں کہ ایسی تنظیم کاری نہ ہو پائے۔

ٹریولرز کی آنتیں نکالی جاتی ہیں، انہیں چیر پھاڑ کر ان کو نمک لگایا جاتا ہے۔ (ماہی کو خشک کرنا ہمارے ساحل کیا ایک بڑی سرگرمی اور ذریعہ معاش ہے) اور تختہ جہاز پر ان کا انبار لگایا جاتا ہے، ماہی کی Curing (نمکی لگا کر خشک کر کے محفوظ بنانا) بہت گندی حالت میں کی جاتی ہے۔ یہ طریقے بہت فرسودہ ہیں جن کا ترک کرنا بہت ضروری ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ فریز کرنے اور پراسیسنگ کی صنعتیں لگائی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اور قیمتی پیداوار حاصل ہو اور اس سیکٹر میں ترقی ہو۔ مچھلی کی ترقی یافتہ پراسیسنگ یعنی ڈبوں میں بند کرنا وغیرہ بلوچستان میں کہیں نہیں ہوتی۔

فارمی مرغی کے لیے پولٹری فارم کے مالکان جو خوراک خریدتے ہیں، ان میں بہت قیمتی مچھلی بھی شامل ہوتی ہے۔

بلوچ ساحل پر جون سے ستمبر کے اوائل تک ماہی گیری نہیں ہوتی کہ مون سون کا موسم ہوتا ہے اور سمندر مکمل وجد میں آ جاتا ہے۔ پھر پانی کے جوش میں بے چارہ انسان اور اس کا ساز اور سامان سمندر کے لالچا ہی پیٹ میں نکل لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ چھٹی۔

ماہی گیری ایک بڑی صنعت کے طور پر ابھر رہی ہے اور مزید پھیل رہی ہے مگر اس کا اصل فائدہ ماہی گیر عوام کو نہیں ملتا۔ مڈل مین فائدے لوٹتا ہے۔ یہ مڈل مین بہت ذلیل حالات پیدا کرتا ہے۔ اس نے ساحلی معیشت کو مکمل طور پر کنٹرول کر رکھا ہے۔ یہاں اس نے Serfdom (زرعی غلامی) کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ ماہی گیر اور حتیٰ کہ کشتیوں کے مالک بھی غریب سے غریب تر ہوتے جاتے ہیں اور مڈل مین یا سیٹھوں سے قرض لیتے ہیں۔ یہ لوگ مزید محنت کرتے ہیں محض قرض اتارنے کی خاطر۔ مگر قرض ہے کہ بڑھتا رہتا ہے، ضروریات ہیں کہ مہنگی ہوتی جاتی ہیں۔ یہ سود والا قرض ہوتا ہے اور جب تک قرض ادا نہیں ہوتا مقرض پابند ہوتا ہے کہ اپنی مچھلی اسی قرض خواہ کو مارکیٹ ریٹ سے بہت کم قیمت پر فروخت کرے۔ اگر ماہی گیر کا دماغ زیادہ ”خراب“ ہو تو وہ کسی اور سیٹھ یا دلال سے قرض لے کر پچھلے قرض خواہ کا قرض چکا دیتا ہے۔ تب وہ نئے قرض خواہ کو اپنی مچھلی بیچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ چاہے تو مالک بدل سکتا ہے مگر آزاد نہیں ہو سکتا، اپنی تقدیر بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ جیٹی میں یہ دلال معمولی قیمت پر ماہی گیری کی مچھلی تھہی لیتا ہے۔

ہے۔ بے روزگاری، بے سکولی، بے ہسپتالی، اور بے بسی نے جس پیمانے پر نشہ اور دیگر اخلاقی بے راہ رویوں کا پھیلا دیا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ مچھلی کی ہینڈلنگ، ڈسٹری بیوٹن اور مارکیٹنگ کے نظام میں بنیادی تبدیلیوں سے لے کر ماہی گیروں کی تعلیم، صحت اور تفریحی مشاغل کی فراہمی تک کے پورے سلسلہ کو تبدیل کیا جائے۔

2۔ بوجیگ

بوجیگ تاریخی وسیلہ رہا ہے سمندری تجارت کا۔ یہ بلوچ ساحلوں سے انڈیا، عرب ممالک اور افریقی ساحلوں کے درمیان درآمد و برآمد کا بہت ہی اہم ذریعہ رہا ہے۔ یہ سو فٹ لمبا، 50 فٹ چوڑا اور 12 فٹ گہرا ہوتا تھا۔ یہ 100 ٹن تک وزن لے جانے کے قابل تھا یعنی 100 کلو گرام والے 1500 سے 2000 بوری گندم کے۔ خالص لکڑی کی بنی ہوئی اس پہلوان کشتی میں انجن نہیں ہوتا تھا۔

یہ بوجیگ بہت طویل سفر طے کیا کرتے تھے جو تین سے چھ ماہ تک کے عرصے کے ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو اپنے گھر لوٹے بغیر ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک مال لانے لے جانے میں پورا سال لگا لیتے تھے۔

ساحل بلوچ تاریخی طور پر تجارت کا شاہراہ رہا ہے۔ ماضی بعید میں بھی یہاں سے درآمد برآمد بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ خشکی کی طرف بھی اور سمندر میں بھی۔ ساحل سے بلوچستان کے اندرونی علاقوں (نیز دیگر پڑوسی علاقوں) میں بارٹر والی تجارت ہوا کرتی تھی، یعنی مال کے بدلے مال کی تجارت۔ جس میں ساحل انہیں مچھلی (خصوصاً مرہ اور کول گیر) مہیا کرتا تھا۔ اور خشکی کے بلوچ علاقوں سے خشک کھجور (لد، اُش کچج اور ہارگ) اور تازہ کھجور (موزاتی، سورج اور آمبی) آتا تھا۔ کھجور آٹے سے بنی ہوئی مٹھائی (پنڈی) آتی تھی۔ گندم اور اعلیٰ گھی آتا تھا۔

بوجیگ ہندوستان کے مالابار، بھیم، کوچن، کالی کٹ، پور بندر، صورت اور جام نگر تک نمک لگی مچھلی (خصوصاً پلا، سولی، کیر، گور) پہنچاتا تھا اور وہاں سے درآمد کے بطور کھوپرا، بیڑی کے

سیاسی پارٹیاں تو ”اور“ کاموں سے فارغ نہیں ہیں، وہ ٹریڈ یونین کیا بنائیں گی؟ پاکستان کی ٹریڈ یونین تحریک بھی ”لیڈر زدہ“ حالت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اور اس طرح بلوچستان کی دو اہم صنعتیں (معدنیات اور ماہی گیری) بغیر ٹریڈ یونین کے ہیں۔ قیامت کے دن ہم سب کو لائن پر کھڑا ہونا ہوگا جوابدہی کے لیے ہے۔ جوابدہی بھی نہیں سزا پانے کے لیے۔ ہماری زبانوں سے بڑے بڑے بچھو لٹکے ہوں گے۔

ماہی گیری کے لیے انفراسٹرکچر اور ساحل پر سہولتوں کی کمی نے ہماری ماہی گیری کی صنعت کو اپنا بچ بھار کھا ہے۔ تربیت گاہوں کی کمی نے اسے مزید نقصان پہنچایا ہے۔ میرین انجن اور ماہی گیری کے آلات کی کمی نے ایک طرف تو پیداوار کو بری طرح متاثر کیا ہے تو دوسری طرف ماہی گیری کو قدامت پرستی، رجعت پسندی، اوہام پرستی، اور پیری فقری، تعصبات کا شکار اور پیر پرست بنا ڈالتا ہے۔

بلوچ ماہی گیری کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ مارکیٹ کا نہ ہونا ہے۔ ساحلی شہروں کے اپنے درمیان پکی سڑکیں بنائی جائیں اور کراچی کی مارکیٹ کو منسوخ کر کے گوادار اور پسپنی سے ڈائریکٹ مچھلی برآمد کرنے دی جائے۔ گوادار سے خلیجی علاقے محض تین گھنٹے دور ہیں جو ماہی کی برآمد کے لیے زبردست مارکیٹ ہیں۔

اور ماڑہ، گڈانی، سور، پیشوکان، چاندی، حیوانی اور ہنگول میں جیٹی کی سہولیات سخت ضروری ہیں۔ بلوچ ساحل پر ایک فشریز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا قیام بہت ضروری ہے۔ انتہائی فرسودہ اور بہت پسماندہ بینکنگ کے نام پر نیشنل بینک، حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک، الائیڈ اور مسلم کمرشل بینک کی موجودہ شاخوں کی از سر نو تنظیم کرنی پڑے گی۔ ADBP ماہی گیروں کے ساتھ جو کھیل تماشے کرتی آئی ہے، سے الٹ دینا ہوگا۔ سال بزنس کارپوریشن کی تمام تر اخلاقی اور انتظامی دیوالیہ پن کا علاج کرنا ہوگا۔ چونکہ صنعتی ترقی نہیں ہے، اس لیے آپاشی کے ذرائع کو ترقی نہیں دی گئی۔ صرف ماہی گیری کو ہی ساحلی علاقوں کے باشندوں کا ذریعہ معاش رہنے دیا گیا۔ یہاں سال انڈسٹریل سٹینڈرڈ بنائی جائیں۔ ماہی گیروں کی سماجی معاشی حالات میں عمومی بہتری لانا انتہائی اہم

میں بڑی انجنیں لگائی جاتی ہیں۔

بُچ

پلاسٹک پیکنگ والے ڈبوں کو جوڑ کر کشتی نما چیز بنا لیتے ہیں۔ جس پر سوار ہو کر ماہی گیر اپنی کشتی سے خشکی تک آ جاسکتے ہیں جو کہ ساحل سے پندرہ بیس گز اندر سمندر میں لنگر انداز ہوتی ہے۔

ترشت، یا، کائیک

یہ تیز رفتار موٹر انڈ کشتی ہوتی ہے جو کہ فائبر گلاس سے بنتی ہے۔ یہ ماہی گیری میں کام نہیں آتی۔ سپورٹس کار کی طرح شوقیہ اور مستی میں امیر لوگ یا ادارے استعمال کرتے ہیں۔ سمندری سپورٹس کار۔

3۔ کشتی سازی

یہاں کے دستکار اپنے کام میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ انہیں مقامی لوگوں کے علاوہ ایران سے بھی کشتی بنانے کے آرڈر ملتے ہیں۔ یہ لوگ ہر طرح کی چھوٹی بڑی کشتی اور لانچ بنا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ 35 میٹر تک کی لمبائی والی دیوہیکل کشتی تک بھی۔ چونکہ یہاں بجلی نہیں تھی، اس لیے سارا کام ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جس میں محنت اور وقت دونوں بہت زیادہ لگتے تھے۔

پندرہ میٹر لمبائی کی لانچ تقریباً آٹھ ماہ میں بنتی ہے۔ بڑا استاد روزانہ چار سو روپے لیتا ہے۔ باقی دستکار ڈھائی تین سو روپے لیتے ہیں۔ لانچ پر کل لاگت تقریباً 25 سے 35 لاکھ روپے آتی ہے۔ صرف لکڑی پر دس لاکھ روپے لگتے ہیں۔ پانچ سلنڈر کا انجن آٹھ لاکھ کا پڑتا ہے۔ ایسی بڑی کشتی بنانے کے لیے باوقار اور قیمتی لکڑی سا گوان ہوتی ہے، جسے بلوچی میں (ساگ) کہتے ہیں۔ اسی طرح Biau نامی لکڑی بھی درآمد ہوتی ہے۔ یہ قیمتی لکڑی کالی کٹ، برما اور انڈونیشیا سے منگوائی جاتی ہے۔ سا گوان کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بہت پائیدار ہوتی ہے اور ایک بار تیار ہو جائے تو بہت عرصہ تک نہ یہ ٹیڑھی ہوتی ہے، نہ اس میں دراڑیں پڑتی ہیں اور نہ یہ گل سڑ جاتا ہے۔ بہت نرم لکڑی ہے

پتے، ریڈی میڈ گارمنٹس، کھوپرے کا تیل، گندم، گھی، چاول، اور مٹی کا بنا ہوا تو (داگی) لائے جاتے تھے۔

زنجیوار (تزانہ) تک بوجیگ بلوچستان کی چٹائی، رسے رسیاں، کھجوریں، اور دیگر اشیاء لے جاتے تھے۔ جبکہ وہاں سے ہر قسم کا بانس اور کشتیاں بنانے والی عمارتی لکڑی ڈھوکرا لاتے تھے۔ عراق میں بصرہ کو بلوچستان سے چٹائیاں، رسے رسیاں اور خوردنی اشیاء درآمد ہوتی تھیں اور بوجیگ کے ذریعے وہاں سے زاہدی اور کوسار نامی تازہ کھجوریں درآمد ہوتی تھیں۔

سب سے بڑی تجارت سری لنکا (سیلون) سے ہوتی تھی۔ بوجیگ کے ذریعے یہاں سے تو اچھی اور خیر والی چیزیں (نمک لگی مچھلی) جاتی تھیں۔ مگر ادھر سے فضول چیزیں آتی تھیں جو ہمارا قومی دشمن بن چکی ہیں۔

یکدار

پانچ سے لے کر گیارہ میٹر طویل ہوتا ہے۔ یہ کشتی جہاز کے پینڈے کی بیچ کی ایک لمبی لکڑی سے بنتی ہے۔ یکدار اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہولیک (چپو) والے یکدار تو بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ دوسرے یکدار پر بھی اب موٹر (انجن) فٹ کئے جا رہے ہیں۔ یہاں زیادہ تر یا ماہی موٹریں کشتیوں پر لگائی جاتی ہیں۔

رنچن

یہ لمبائی میں یکدار جتنی ہوتی ہے۔ فرق صرف لکڑی کا ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی لمبائی والی لکڑی کے تختوں سے بنتی ہے جنہیں لوہے کی میٹوں سے جوڑا جاتا ہے۔

Gill-knetter

میڈیم سائز کی کشتی ہوتی ہے جس کے پینڈے کی لکڑی کی لمبائی نو سے چودہ میٹر تک ہوتی ہے۔

لانچ

اس کے پینڈے کی لکڑی چودہ سے بیس میٹر لمبی ہوتی ہے۔ Gill-Knetter اور لانچ

سائز پر نہیں بلکہ وزن کے حساب سے مقرر ہوتی ہے۔ یہ 200 روپے سے لے کر 650 روپے فی کلو گرام تک ہوتی ہے۔ Floats، تیس سے 45 روپے فی دانہ ہوتا ہے اور نائیلون رسی 125 روپے فی کلو گرام ہوتا ہے (جال، نائیلون کی رسیاں، Floats اور Winch سب کو فشنگ گیر کہتے ہیں)۔

نائیلون کے جال چھوٹی کشتیوں میں استعمال ہوتے ہیں جبکہ بڑی لالچوں میں دھاگے کے جال استعمال ہوتے ہیں جو کہ زیادہ مضبوط اور دیر پا ہوتے ہیں۔ جال میں سورخ کا سائز، مچھلی کی قسم پر منحصر ہوتا ہے۔ مقامی طور پر سائز ہاتھ کی انگلیوں سے ناپا جاتا ہے اور یہ دو سے پانچ انگلیوں تک ہوتا ہے۔ دھاگے والے جال (بلوچی میں ماہور) جھینگا کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جھینگا کو بلوچی میں ”مدگ“ اور انگریزی میں Prawn کہتے ہیں جو کہ بلوچستان کے ساحل میں بہت اچھا ملتا ہے۔ یہاں دو دو گراٹ (باشٹ) لمبا مدگ (جھینگا) ہوتا ہے۔ ایک ماہوار تیس سے لے کر ”چالیس کندو“ کا ہوتا ہے اور ایک کندو 160 ”گام“ کا ہوتا ہے۔

اب ایک نیا جال آیا ہے، پلاسٹک کا۔ اس میں سورخ بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ بہت ظالم جال ہوتا ہے، جس سے ماہی کی پوری نسل تباہ ہوتی ہے۔ جوں جوں جال پرانا ہوتا جاتا ہے اتنا زیادہ مرمت مانگتا ہے۔ مرمت والا مزدور 150 روپے روزانہ معاوضہ پر ملتا ہے۔ مرمت میں اوسطاً چھ دن لگتے ہیں۔ عورتیں گھروں میں مرمت کا کام کرتی ہیں۔ (اور بہت زیادہ کرتی ہیں جس کا حساب بہر حال لگانا چاہیے)۔

لالچ ماہی گیری کی بڑی کشتی ہوتی ہے جو بہت مہنگی بنتی ہے۔ اور اس کا مالک بڑا سرمایہ دار ہوتا ہے۔ یہاں ایسے سرمایہ دار بھی ہیں جن کی پندرہ پندرہ، بیس بیس لالچیں ہیں۔ مچھلی کے شکار کی اجتماعی شکل ”سنگار“ کہلاتی ہے۔ لالچ پہ کام کرنے والے افراد کی تقسیم اس طرح ہے:

1- ناھدا (کپتان):

یہ تجربہ کار شخص ماہی گیری کے سارے آپریشن کا انچارج ہوتا ہے۔ یہ بڑا دریا نور دشخص،

اس لیے اسے تراشنے میں بہت مشقت نہیں کرنی پڑتی۔ بہت چکدار اور طاقتور لکڑی ہوتی ہے۔ (آرا مشین لگنے کے بعد اب کشتی سازی میں یہاں کی لکڑی بھی استعمال ہوتی ہے)۔

ایسی بڑی کشتی بنانے کے لیے ایک بڑے استاد (دستکار) کی ضرورت پڑتی ہے۔ آٹھ سے دس دوسرے ستکار اور پانچ سے سات شاگردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پورا لشکر چاہیے ہوتا ہے ایک کشتی بنانے کے لیے۔ اور یہاں اس اوپن ایئر فیکٹری میں تو بہ یک وقت دس پندرہ لالچوں پر کام ہو رہا ہوتا ہے۔ میلہ لگا رہتا ہے۔ صرف پسینی میں 70 سے 80 ”استاد“ کشتی سازی میں مصروف ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پسینی میں ہر سال 50 فٹ لمبائی کی بارہ لالچیں اور 20-30 فٹ لمبائی کی 80 لالچیں بنتی ہیں۔

لکڑی کے کام کے بعد اس کی بیرونی سطح پر Cod Liver آئل (کا ڈمچلی کا تیل) لگائی جاتی ہے تاکہ یہ واٹر پروف بن جائے۔ پہلے یہ لوگ شارک مچھلی کے جگر سے نکالے گئے تیل کو کشتی پر لگاتے تھے۔

ان کی اندرونی آرائش بلوچ ذوق کی مکمل نمائندہ ہوتی ہے۔ یہاں مغربی بلوچستان کے آخری سرے پر اگر کشتیوں کی رنگین گلکاری اور آرائش قابل دید ہوتی ہے تو بلوچستان کا مشرقی سرا یعنی ڈیرہ غازی خان ٹرکوں کی آرائش کا مشہور اڈہ ہے..... بلوچ، ایک آرٹسٹ قوم ہے۔ ایک تعمیر شدہ کشتی کی اوسط عمر بیس برس ہوتی ہے۔

4- ماہی گیری کا جال

اس فیکٹری کے ساتھ ہی جال بننے والے ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں۔ یہاں زیادہ تر سترہ میٹر لمبے اور تین میٹر چوڑے جال استعمال ہوتے ہیں۔ جن کا وزن 40 کلو گرام ہوتا ہے۔ لیکن جالوں کی لمبائی 600 میٹر تک بھی ہو سکتی ہے۔ Floats (لکڑی یا دوسرے ہلکے مواد کا ٹکڑا جو جال کو تیرتے رہنے میں مدد دیتے ہیں) ہر دو میٹر پر لگائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر جال اور Floats کوریا، جاپان اور تائیوان سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ کچھ کراچی میں بھی بننے ہیں۔ جال کی قیمت

جال کی مرمت کرتے ہیں اور شام چار بجے پھر جال سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ روز کا یہی معمول رہتا ہے۔ ع:

ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

ماہی گیر کے لیے بلوچی زبان میں عمومی لفظ ”مید“ (Sea man) استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مچھلی پکڑنے والا۔ اسی لفظ سے گوادر میں ایک محلہ آباد ہے جسے ”میدانی پاڑہ“ کہتے ہیں یعنی ماہی گیروں کی بستی۔ یہاں کے مقامی باشندوں کے دیگر محلوں کے نام ہیں: کمان وارڈ، کوگرہ وارڈ، ملا بند وارڈ، شادو بند وارڈ، کوبن وارڈ، بلوچ وارڈ، ملا کریم بخش وارڈ، شیخ عمر وارڈ، اور گزروان وارڈ، وغیرہ۔

ہمارے ان بلوچ محنت کشوں کے پاس ماہی گیری کی کوئی جدید سہولت نہیں ہے۔ ہمارے یہ گوئڈل عملاً بے تیغ ہیں۔ یہ لوگ سمندر کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ محض ستاروں کی مدد سے اپنا پیداواری عمل بجالاتے ہیں حتیٰ کہ یہ افریقہ کے ساحلوں تک آتے جاتے ہیں..... یہی ہیں ہمارے ماہر فلکیات، ہمارے علمائے نجوم..... انہیں اپنے سمندروں سے اس قدر واقفیت ہے کہ محض تجربے کی بنا پر ان کو معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کا کونسا علاقہ گہرا ہے، زیر زمین کہاں چٹانیں چھپی ہوئی ہیں جہاں ان کی کشتی ٹکرا کر ٹوٹ سکتی ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھڑ اور دلدل والا علاقہ کون سا ہے۔ اور وہ زیر آب مچھلیوں کی قسم اور متوقع شکار کی تعداد کا ٹھیک اندازہ کر کے جال ڈال دیتے ہیں۔ (کتنا اچھا ہو، اگر انہی ماہی گیروں میں سے ایک پاکستان کا وزیر ماہی گیری ہو، ایک وزیر تجارت، ایک بحریہ کا سربراہ، اور ایک بلوچستان کا وزیر اعلیٰ)۔ آپ کی بھی خواہش یہی ہے تو ہاتھ کھڑا کیجئے۔

جو (ماہی گیر) دوپہر کے بعد سے عصر کے وقت تک سمندر جاتے ہیں اس وقت کا نام ”شب ریچ“ ہے۔ کانٹے ڈور کی مدد سے مچھلی پکڑنے کے کام کا نام ”چیران“ ہے۔ دسی جالوں کی مدد سے چھوٹی مچھلیوں کے شکار کا نام ”گند“ ہے۔ اسی طرح ”چیر آپ“، ”بندیک“، ”جل“، ”برام“، ”کیگٹا“۔ شکار کے مختلف طریقوں کے نام ہیں۔ مگ پکڑنے کا موسم سرما ہے، تاہم

ماہی گیری کے مشن کی منصوبہ بندی کرتا ہے، اسکی نگرانی کرتا ہے اور کشتی، اوزار اور عملے کا حتمی ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ موسم کے بارے میں اندازہ کر سکتا ہے اور طوفان وغیرہ جیسی مشکل صورت حال میں راہنمائی کرتا ہے۔ اسے طوفان کی بہت پہچان ہوتی ہے۔ بہت حوصلہ مند یہ ناہدا طوفان میں لانچ کاسگان (سٹیرنگ) خود سنبھالتا ہے۔ ناہدا ماہی گیری کے فن میں طاق اور پختہ ہوتا ہے۔

2- سارنگ (سرہنگ)

اسٹنٹ کپتان ہوتا ہے۔ آگے آگے ہوتا ہے اور جال پھکوا دیتا ہے۔ بہ وقت ضرورت وہ ناہدا کا کام بھی سنبھالتا ہے۔

3- ڈرائیور

لانچ چلاتا ہے۔

4- بانڈاری

یہ محنت کشوں کے اس کنبے کا مسلسل 25-20 دن تک باورچی ہوتا ہے۔

5- خلاصی

اسے ”جاں شو“ بھی کہتے ہیں اور ”ملاح“ کا لفظ بھی اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لانچ میں کم از کم آٹھ نو خلاصی ہوتے ہیں۔ سمندر میں ماہی گیری کی ساری مشقت یہی لوگ کرتے ہیں۔ یہ جال پھینکتے ہیں، نکالتے ہیں، شکار کردہ مچھلی کو جال سے نکالتے ہیں۔ اس مچھلی کو نمک لگاتے ہیں، برف توڑتے ہیں اور مچھلی کو لانچ کے نچلے خانوں میں سٹور کرتے ہیں۔ ”جاں شو“ بہت مشقت کرتے ہیں۔ جال ہر وقت مرمت مانگتا ہے اس لیے کہ منہ زور مچھلیاں اپنی آزادی کی جدوجہد میں اسے پھاڑتی رہتی ہیں۔ پلاسٹک کے سرخ، سفید خوبصورت فٹ بال آپ کو اس کے جال پہ جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ یہ بال سطح آب پر تیرتے رہتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وسیع سمندر میں جال ہے کہاں۔ خلاصی بلوچ ساحلوں کی آبادی کا 50 فیصد حصہ تشکیل دیتے ہیں۔ یہ لوگ شام چار بجے جال پھینکتے ہیں اور رات کے تین بجے نکالتے ہیں۔ پھر اپنا شکار جال سے نکال کر نمک و برف لگا کر سٹور والے تہہ خانوں میں رکھتے ہیں۔ وہ جنگ و جدل کا شکار ہو جانے والے اس

گرمیوں میں بھی اس کا شکار ہوتا ہے۔

لانچ ایک ٹرپ میں تین سے چار ہزار مچھلیاں پکڑتی ہے۔ واپسی پہ جب یہ مچھلی جیٹی پر بولی کے ذریعے بکتی ہے تو حاصل شدہ رقم میں سے سفر کے سارے اخراجات نکالے جاتے ہیں۔ ان اخراجات میں ٹیکس، کمیشن، رشوت، جرمانہ، خوراک، مرمت اور ایندھن وغیرہ شامل ہیں۔ بقیہ رقم آدھی آدھی بانٹ دی جاتی ہے۔ آدھی تو سید مالک لے جاتا ہے، بنا کسی محنت کے، بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ محض اس لیے کہ اس کے پاس حلال حرام کا پیسہ تھا جس سے اس نے آلات پیداوار (لانچ، جال انجن، ونچ) خرید رکھے تھے۔ بقیہ آدھے حصے میں چار حصے ناھدا کے، ڈیڑھ حصہ سارنگ (سرہنگ) کا، ایک ایک حصہ ہر خلاصی کا اور ایک حصہ ڈرائیور کا ہو جاتا ہے۔

اختیارات کے حساب سے مالک سب کا مختار ہے۔ وہ ساری اسمبلی، پوری کابینہ یا کسی بھی فرد کو برطرف کر سکتا ہے۔ ناھدا کو مالک ہی نکال سکتا ہے۔ سارنگ کو نکال دینے کا اختیار ناھدا کو بھی حاصل ہے۔ اور خلاصی کو سب نکال سکتے ہیں بغیر وجہ بتائے، بغیر چارج شیٹ کے، بغیر جواب طلبی اور انکوائری کے۔ جنگل میں تو چلتا ہی جنگل کا قانون ہے، شہر میں بھی جنگل کا قانون اور اب سمندر میں بھی جنگل کا قانون..... حضرت انسان، تجھے خدا عقیل دے، حضرت بلوچ تجھے خدا سمجھائے۔

گو کہ عورتیں گوادریں میں تو کھلے سمندر میں نہیں جاتیں مگر بحیرہ بلوچ کی دیگر بندرگاہوں میں بلوچ عورتیں کھلے سمندر میں باقاعدہ ماہی گیری کرتی ہیں۔ (بلوچ میں صنفِ نازک کا بھونڈا تصور اب تک موجود نہیں ہے)۔

لانچ بیس بچیس دن بعد واپس آتی ہے۔ دو چار دن مرمت، ایندھن، خوراک پانی لینے میں لگ جاتے ہیں اور یہی دو چار دن ماہی گیروں کی سوشل لائف کے ہوتے ہیں۔ ابھی بال بچوں سے ملنے بھی نہیں پاتے کہ پھر سمندر، پھر ماہی گیری، پھر مزدوری، مشقت۔ زمینی دنیا میں انسانوں کی بستی میں محض چار دن؟ کسی کی فاتحہ، کسی کی شادی، تیمارداری..... کیا کچھ ہو سکتا ہے چار دنوں میں، نہ آپ تصور کر سکتے ہیں اور نہ میں بیان کر سکنے کا اہل ہوں۔

ہمارے ماہی گیروں کا بدترین استحصال سرمایہ دار کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے۔ ہمارے یہ خلاصی جو ناھدا کے بھی مقروض ہوتے ہیں اور مالک کے بھی، کشتی پر غلاموں کی طرح وابستہ رہتے ہیں۔ ایک کا قرضہ ادا کرنے اور وہاں سے جان چھڑانے کے لیے دوسرے کی کشتی پر خود کو بیچنا پڑتا ہے۔ مقروض خلاصی کی آزادی و خود مختاری ایسی ہے جیسے مقروض پاکستان کی۔ ہر حکم آئی ایم ایف کا چلتا ہے اور ہم آزاد ہیں۔ 14 اگست کو ہم آزاد ہیں ترانہ بجانے کے لیے، ترانہ سن کر انٹشن کھڑے ہونے کے لیے۔ بقیہ ساری آزادی آئی ایم ایف کی۔

پانچواں باب

بلوچوں کا ویلیو سسٹم

رسم و رواج

مگر اس میں شخصی اور علاقائی طور پر تبدیلیاں بھی کی جاسکتی ہیں۔ نیز اس کی پابندی کرنے، نہ کرنے یا کم کرنے کی ہلکی سی آزادی ہوتی ہے۔ آپ شادی میں دوسو دبنے کاٹیں گے یا محض ایک دبنہ، یہ آپ پر منحصر ہے۔ مگر رواج وہ آئین اور قانون ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ سماج ایسا کرنے نہیں دیتا۔ رواج کا اجر یا سزا سماجی ہوتا ہے۔ جیلیں وغیرہ نہیں ہوتیں۔ جرمانہ بھرنا ہوتا ہے یا پھر موت۔ ہاں، مکمل یا جزوی معافی بھی مل سکتی ہے۔ ویلیوسسٹم منظم صورت میں سرمایہ داری نظام سے قبل بن کر، مشکل ہو کر لاگو ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم انہیں بھیڑ پال اور زرعی معیشت کے حصے میں لا رہے ہیں۔

اس کے عمومی رواج میں انفرادی قبائلی ورائٹی موجود ہوتی ہے۔ بلوچ آزاد و علیحدہ قبائل کا اجتماع ہے۔ اس لیے یہ بات تو طے ہے کہ اس کا رواج الگ قبائل میں الگ ہے۔ مگر چونکہ ہم ابھی ابھی قدیم اشتراکی نظام سے نکلے ہیں اور مجموعی طور پر ماقبل سرمایہ داری پیداواری رشتوں سے منسلک ہیں اس لیے معمولی فرق ہو تو ہو کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا۔

سرمایہ داری گو کہ انہی رسوم و رواج کا ارتقا کرتی ہے مگر وہ اس رفتار سے ایسا کرتی ہے اور اس میں عالمی اجزا اس قدر زیادہ شامل ہوتے ہیں کہ ان کے اطلاق کے لیے باقاعدہ ادارے وجود ہوتے ہیں۔ ریاست کا وجود لازمی بن جاتا ہے۔ وہاں رسوم و رواج بلدیاتی اداروں، صوبائی قومی اسمبلیوں اور سینٹ جیسے اداروں کے اندر وضع ہوتے ہیں۔ انہیں تحریری صورت دی جاتی ہے۔ پھر اُن کی تشریح کے لیے عدالتوں کا الگ ادارہ ہوتا ہے۔ اور نفاذ کرنے کے الگ لاٹھی بردار ادارے۔ بلوچستان میں تو عملاً دو متوازی صورتیں موجود ہیں۔ ایک وہ جو سرکار کے کنٹرول والے علاقوں میں ہے اور دوسرا ہمارے اپنے کوہستان و دیہات میں۔ ان دونوں متوازی صورتوں میں کبھی کبھی نکتہ ہائے اتفاق آتے ہیں اور کبھی کبھی تو بالکل ہی متضاد و مخالف۔ سماجی ارتقا کی سائنس دلچسپ ترین مطالعے کی سائنس ہوتی ہے۔

یوں تو ہر سماجی عہد کا رواج بہت راسخ اور سخت جان ہوتا ہے مگر سر قبیلوی، ماقبل جاگیرداری نظام کے رواج تو بہت ہی جتنی ہوتے ہیں۔ رواج اپنے سماجی عہد میں ایک بہترین

غیر بلوچ محققوں، سیاحوں اور حملہ آوروں نے بلوچوں کی بے شمار خوبصورت صفات کو رشک کے الفاظ میں ڈبو ڈبو کر بیان کیا ہے۔ خود بلوچوں نے ایک زبردست ضخیم مواد اس سلسلے میں پیدا کیا ہے۔

بلوچ کم شورش پسند، کم دھوکے باز اور کم متعصب ہے۔ اس کا قد و قامت نسبتاً پست، جسم کٹھنلا اور دبلا مگر زور آور ہے۔ بلوچ کا چہرہ لمبا اور بیضوی، نقش تنکھے اور ناک باز جیسی ہے۔ اس کے بال سیاہ اور روغن میں تر لہراتے ہوئے، داڑھی اور مونچھیں بڑھی ہوئی ہیں۔

اس کی عورت سر پر چادر اوڑھتی ہے، اس کا چولا ٹخنوں تک ہوتا ہے۔ بلوچ اپنی عادات و خصائل میں خانہ بدوش ہے، اس لیے وہ اپنی عورتوں کو خانہ نشین نہیں رکھتا۔ وہ رکھ رکھاؤ میں زیادہ صاف گوا رکھلا، اور کمینے پن سے مبرا، ہماری عدالتوں کے ہاتھوں بے ایمان نہ ہو جانے کی وجہ سے سچا اور کھرا، قول کا پکا، معتدل مزاج اور باحوصلہ اور ہمت کو اعلیٰ ترین وصف قرار دینے والا ہے۔ (۱) ویلیوسسٹم انگریزی کی اصطلاح ہے۔ بلوچوں میں رسم کا بھی سختی سے خیال رکھا جاتا ہے

انسانی رفیت ہوتا ہے جس کے بغیر سماج کی زلفیں ژولیدہ ہو جاتی ہیں۔

مگر سماج تو جامد چیز نہیں ہوتا۔ یہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ اور پھر ایک جگہ جا کر رواج سماج کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ سماج کی وہ قوتیں جو پیداوار کرتی ہیں وہ جب میسر ٹیکنالوجی کی مدد سے ترقی کرتی جاتی ہیں، پچھلے عہد کے رسوم و رواج کو ایک زنجیر کی طرح محسوس کرنے لگتی ہیں جنہیں توڑے بغیر وہ مزید آگے نہیں جاسکتیں۔ اسی لیے رواجوں کے وہ صرف حصے زندہ رہ پاتے ہیں جو یا تو عمومی عالمگیر سچائیوں کی نمائندگی کرتے ہوں یا پھر مزید کچھ عرصہ تک تدریجی انداز میں تبدیل ہوتے رہنے کی خاصیت رکھتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بلوچ رسومات ساکت و جامد و حتمی و مطلق و مستقل کبھی نہیں ہوتیں۔ زندہ سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ نئی باتیں، نئے قانونی آئینی معاملات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور انسانی معاشرہ اُن کی بابت اصول و قوانین وضع کرتا رہتا ہے۔ پرانا بوڑھا اور بیمار ہو کر مرتا جاتا ہے اور نیا نئے خون کے ساتھ شامل ہوتا رہتا ہے۔

رسم کی بہ نسبت ہمارے رواج روز نہیں بدلتے۔ ایک متعین طریقہ ہے رواج میں ترمیم کرنے کا۔ سردار اور پورے قبیلے کے وڈیروں کا اجتماع (مُجی) ہونا ضروری ہے، حتمی ترمیم کے لیے۔ گو کہ اس ترمیم کی ضرورت بہت عرصے سے محسوس کی جا رہی ہوگی۔ اور اس کے بارے میں پیام و پیغام بہت پہلے سے ہو رہے ہوں گے۔ جرگہ حتمی منظوری دے گا تو رواج میں مذکورہ تبدیلی آئے گی۔ ہاں البتہ کوئی بہت ہی فوری بات ہو تو سردار (اب تو علاقائی سفید ریش بھی) عبوری ترمیم کرے گا..... مگر ایسی جو سماج کو قابل قبول ہو۔

رواج بنیادی طور پر کسی قوم کے سماجی معاشی عہد کا اظہار ہوتا ہے، اس کی پسند کا اظہار، اس کی ممنوعات کا پرتو، اور اس کے سانچوں کا اظہار۔ فرائض و حقوق سے متعلق معاملات سے نمٹنے کے طریقوں کا سیٹ۔ حقوق و فرائض کا یہ سیٹ تحریری نہ تھا، اب بھی یہ تحریری صورت میں موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موجودگی غیر موجودگی محسوس کرنے والی بات ہی نہ تھی۔ سب کو پتہ ہوتا کہ اس کے فرائض کیا ہیں، حقوق کیا ہیں۔ کوئی این جی او نہیں بتاتے تھے۔ یہ تو ماں باپ، چولہے اور محفل میں ہی بغیر احساس دلائے سکھا دیتے تھے۔ غیر محسوس طریقے سے آزادیوں کی موجودگی

جانچتے تھے اور یادداشت و یاد دہانی کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ سچی بات یہ ہے ہم اپنے حقوق و آزادیوں سے اس قدر آشنا ہیں کہ ان کے لیے الگ اصطلاح اور لفظ موجود تک نہیں ہیں۔

اور پھر حقوق و فرائض اتنے پیچیدہ بھی نہ تھے۔ برابر کے انسان ہوا کرتے تھے، کوئی مالک اور آقا نہ تھا۔ انسان ابھی جنس و کماڈٹی نہ بن چکا تھا۔ اسے خریدنا بیچنا نہ جاسکتا تھا۔ حقوق اتنے حتمی، اتنے فطری اور اس قدر محفوظ تھے کہ کسی چارٹر، لکھا پڑھی، سٹامپ پیپر کی بالکل کوئی ضرورت نہ تھی۔

بلوچ رسوم میں اہم بات یہ ہے کہ ان میں اجتماعیت و اشتراکیت بہت ہے۔ یہ انسانی باہمی مدد و امداد، پورے قبیلے قوم کا فائدہ، خوشحالی آبادی اور سلامتی پر مبنی ہیں۔..... وجہ یہ ہے کہ ہم ابھی حال میں قدیم اشتراکیت سے پیدا شدہ ہیں۔ صنعت، منڈی، ٹھگی ابھی نہیں آئی۔

1۔ پیدائش سے جوانی تک

ششغان

انسانی زندگی میں بچے پہ نام رکھنے کی رسم ایک بڑا جشن اور خوش قسمت دن ہوتا ہے۔ یہ رسم دنیا کے ہر کونے اور علاقے میں موجود ہے۔ کہیں اسے زیادہ جوش اور مستی سے منایا جاتا ہے، کہیں یہ سادگی اور خاموشی سے۔ مختصر یہ کہ بغیر نام کے دنیا میں کوئی نہیں رہتا۔ ہمارے علاقے میں نام رکھنے کا باقاعدہ جشن ہوتا ہے۔ بچے کا نام عموماً پیدائش کے چھٹے دن رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے لفظ ”ششغان“ اس دن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بلاوا دینے والے جاتے ہیں، چاروں طرف لوٹ (دعوت) دے آتے ہیں۔ جشن کے دن سے پہلے والی شام کو مویشی ذبح کیے جاتے ہیں اور اس سے پہلے والے دن پانی لکڑی لانے کے لیے خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ مویشی کا گوشت کاٹنے، ہلکڑے بنانے کے بعد متعدد نو جوان گوشت کی حفاظت کرتے ہیں درندوں، کتوں سے۔ وہاں پہرہ دیا جاتا ہے اور صبح چار بجے گوشت چڑھایا جاتا ہے تاکہ سات آٹھ بجے تک کھانا تیار ہو جائے اور ٹولی ٹولیوں میں آنے والے مردوں کو کھانا مل سکے۔ جو شخص بھی باہر سے آتا ہے تو کوئی بزرگ شخص اس سے بلوچی کا رسم ”حال احوال“ کرتا ہے۔ کھانے کے بعد جب اٹھنے لگتا ہے تو

پوچھتا ہے ”بیٹے کا کیا نام رکھا ہے؟“۔

جواب ملتا ہے ”فلاں“۔

”مبارک ہو“۔

”بخت والا ہو جائے شالا“۔

جھنڈ

ششگان کے بعد پھر ”جھنڈ“ کی تقریب ہوتی ہے ”جھنڈ ایر کنگ“۔

بیٹے کے سر پر بالوں کی پہلی فصل جب تیار ہوتی ہے تو بال اتار کر اپنے پیر کے مقبرے پر

لے جا کر ٹانگ دیے جاتے ہیں۔ یہاں جشن منایا جاتا ہے۔ (ششگان کے مقابلے میں ذرا کم)۔

بچپن اور تعلیم

علم تو حیات القلوب ہے۔ یہ انسان کو زندگی اور زندگی کے لاڈ اور ناز کے مزے لینے اور

اس کے مقاصد و مشکلات سے نمٹنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ علم ہر پوشیدہ راز کو بے نقاب کرتا ہے۔

ڈھونڈ کر چھپائی ہوئی، خفیہ رکھی ہوئی چیزوں کو بویاں، بالٹیاں بھر بھر کر باہر لاتا ہے۔ علم وانا انصافی،

علم و استحصال اور علم و پسماندگی کے درمیان ایک دائمی، نہ ختم ہونے والی جنگ برپا ہے۔ اور اس

جنگ میں انسان دوستوں کی خواہش ہوتی ہے کہ علم کی روشنی ہر جگہ پھیلے۔

بے علم ڈرپوک ہوتا ہے اور ڈرپوک ہمیشہ جھک جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ علم سے بہرہ مند ہو

جائے تو پھر وہ بولتا ہے۔ اور جب بولتا ہے تو پھر کچھ بھی کر گزرتا ہے۔

علم وہ روشنی ہے کہ اگر ترقی پذیر زندگی اور کائنات کے ساتھ ہم قدم رہے تو جاننے اور

پرکھنے کے عمل کو آگے بڑھاتی ہے، نامعلوم کے دائرے کو کم کرتی چلی جاتی ہے۔ بہت سی ایسی

”حیرتوں“ کو جو علاقہ نامعلوم کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں، کسرتی ہوئی چلتی ہے۔ اس عمل میں یقین کی اس

درجہ فراوانی ہے کہ وہ حضرات جو علم کی روشنی کے بجائے حیرتوں کے اندھیروں میں پاؤں پسارنے پر

قانع رہتے ہیں۔ روشنی سے اس قدر دور ہو جاتے ہیں کہ وہ اگر اپنی زندگی کے کسی موڑ پر روشنی کی

طرف مڑنا بھی چاہیں تو ایسا کرنے پر قادر نہیں رہتے۔

بلوچستان میں بیرونی مستبد حاکم تو ویسے ہی علم کی روشنی بجھانے میں ہمہ وقت مصروف

رہے ہیں، خود ہمارا اپنا حکمران طبقہ بھی اپنے مفادات کے تحت یہ نہیں چاہتا کہ عقلوں پر سے جہالت

کے پردے ہٹیں اور علم و دانش کی کرنیں پھوٹیں، نشوونما کی راہ کھلے اور خرافات و توہمات کے سیاہ

بادل چھٹ جائیں جو کہ بزدلی و کم ہمتی کا نامبارک مینہ برساتے ہیں۔

ہمارے نصاب میں غیر ضروری مضامین بہت زیادہ ہیں۔ اردو کی بالادستی میں اُسی زبان

کے شاعر اور ادیب پڑھائے جاتے ہیں جو سب کے سب فیوڈل فرسودہ دور کے نمائندے ہیں۔ اسی

لیے عملی زندگی کے تقاضوں اور فطرت کی ضرورتوں کے مطابق نصاب ترتیب دینا بہت ضروری ہے۔

ہماری قوم سائنس اور ٹیکنالوجی میں پسماندہ ہے اور اس طرف توجہ دینا ہوگی۔ حضرت

علی نے فرمایا کہ، ”اپنے بچوں کو اپنی طرح تعلیم نہ دو کیونکہ وہ تمہارے دور اور تمہارے زمانے کے

لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں“۔

زبان کا مسئلہ بھی پڑھانے اور تعلیم کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس وقت

انگلش کے علاوہ دنیا میں کسی زبان کا گزراہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انگریزی تو ہوگی ہی، اردو بن گئی

مقتدرہ، لہذا وہ بھی ضروری ہوگئی۔ پھر عربی کو ضیاء الحق نے کورس میں آن ٹھونسنا۔ ہماری مادری زبانیں

کبھی گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی آتی ہیں اور پھر بھگوڑے، مات کھائے سگ کی طرح دُم دبائے

بھاگ جاتی ہیں اور گم ہو جاتی ہیں۔ دنیا کے دیگر علاقوں کے دانشوروں کی طرح بلوچستان کے

دانشمند لوگ بھی بہت دیر سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ بنیادی تعلیم صرف اور صرف مادری زبان میں

دی جائے۔ یونیسکو کے قوانین میں بھی لکھا ہوا ہے کہ پڑھانے کے حق کا مطلب یہ ہے کہ بچہ خود اپنی

زبان، تہذیب و ثقافت، قومی تاریخ، سرزمین اور قومی رواج اور قدروں سے واقف ہو جائے۔ اور

اس کے بعد دوسری قوموں کے بارے میں جانے۔ مگر ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ ہم انگلش،

اردو، عربی کے گرد و غبار میں اپنی میٹھی دلکش بلوچی زبان گم کر چکے ہیں۔ بلوچی نے انتقام لیا اور جواباً

ہمیں گم کر دیا۔ جب تک ہم اپنی زبان کو جھاڑ پھونک کر صاف ستھرا نہیں کریں گے۔ جب تک اپنے

تعلیمی اداروں اور کورس میں اسے تو قیرو عزت سے نہ بٹھائیں گے، اس وقت تک ہماری ترقی اور

افضل و اشرف زندگی قائم نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہم لوگ بنیادی تعلیم کو مادری زبانوں میں دلانا منظور نہیں کروائیں گے، بنیادی تعلیم کو لازمی اور مفت نہیں بنا دیں گے۔ جب تک اس کی کتاب، کاپی، فیس، جیب خرچ، یونیفارم سب کی ذمہ داری سرکار پر نہ ہوگی اس وقت تک نجات ممکن نہیں۔

تعلیم اب کسی طرح کی سستی کا ہلی، آگے پیچھے ہونے، حیل و حجت سے کام لینے اور اگر مگر کرنے کے پھیڑے برداشت نہیں کر سکتی۔ اب ہماری قوم کے لیے علم و مرگ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ضروری ٹھہرا ہے۔

سانگ (منگنی)

خاندان کو انگریزی میں فیملی کہتے ہیں۔ جو کہ لفظ Familia سے نکلا ہے۔ رومنوں میں شروع میں یہ لفظ شادی شدہ جوڑے اور ان کے بچوں کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ صرف غلاموں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ Famulus کا مطلب تھا گھریلو غلام اور Familia کا لفظ مجموعی طور پر ایک شخص کے سبھی غلاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

یہ بات یقینی ہے کہ ہماری تاریخ میں کئی بیویاں رکھنا بہت بعد میں رواج پا گیا۔ مکران کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً پورے بلوچستان میں کہیں کم کہیں زیادہ ”لب“ موجود ہے۔ سندھیوں میں اس پیسے کا نام ”پھلن مٹھ“ ہے جبکہ پشتونوں میں اسے ”لوڑ“ کہتے ہیں۔

منگنی کی شرائط پر مذاکرات کرنے والے وفد کو ”سانگہ مرکہ“ کہتے ہیں جو کہ ”ربالو“ کے دونوں طرفین کے ساتھ بات چیت کرنے اور شٹل ڈپلومیسی کے بعد وجود میں آتا ہے۔ پہلے ربالو پیغام لاتا، لے جاتا ہے۔

ہر کوئی اپنے جتنے آدمی کے گھر میں رشتہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معتبر عموماً اپنے برابر والے لوگوں سے رشتہ داری کرتے ہیں۔ باقی عام لوگ زیادہ تر اپنے چچا زادوں، ٹکر (Sub-tribe) یا قبیلے کے اندر رشتہ کرتے ہیں کچھ خصوصی حالتوں میں ایک قبیلے کے افراد دوسرے قبیلے کے لوگوں میں منگنیاں کرتے ہیں۔

خاندان کے اندر رشتہ داری اصل میں معاشی انضمام کا بندوبست ہوتا ہے۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ یہ رشتہ داری لانی بانہہ اور لب سے زیادہ پروگریسو اور زیادہ انسان دوستی والی رشتہ داری ہوتی ہے۔ گو کہ یہ ایک ارتقائی مرحلہ ہے مگر خود پس ماندگی کی سیڑھی کے نچلے زینوں میں سے ہے۔ جب تک کہ کم عمری کی منگنی ختم نہیں ہو جائے گی، اس وقت تک منگنی کی ہر شکل نامکمل ہے۔

منگنی کی رسم جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں میڑھ یا مرکہ کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی رشتہ مانگنے والے سفید ریشوں کا وفد لے کر لڑکی والے گھر میں رشتہ مانگنے جاتے ہیں۔ جب منگنی طے ہو جاتی ہے تو ایک بندوق کی گولی داغی جاتی ہے اور گولی چلانے والا بلند آواز میں پکار کر کہتا ہے کہ ”خیر کی فائر ہے، فلاں کے بیٹے کی منگنی کا فائر ہے“۔ منگنی کا فائر ہونے کے بعد مٹھائی بانٹی جاتی ہے، مبارکی خیر مبارکی کا تبادلہ ہوتا ہے۔ لڑکی کو عزیز رشتہ دار عورتیں منگنے پر وکر ہاتھوں میں پہناتی ہیں، جنہیں ”دستین“ کہا جاتا ہے۔ لڑکی پہلے تو انہیں پہننے میں سخت مزاحمت کرتی ہے اور تقریباً تین دستین توڑ ڈالتی ہے۔ مگر بعد میں ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ ہر عورت حسب حیثیت اور حسب رشتہ خوبصورت دستین لاتی ہے اور لڑکی کے ہاتھ میں پہنا دیتی ہے۔ منگنی کا دنبہ کا ثنا ضروری آئٹم ہوتا ہے۔

منگنی بلوچوں میں ٹوٹی ہرگز نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی سلطان راہی، ”اے برات نہیں جائے گی اوئے“ کہہ سکتا ہے۔

سیر (شادی)

ہمیں بالکل معلوم نہیں کہ گیارہ ہزار برس قبل کے مہر گڑھ کا بلوچ کس طرح شادی کرتا تھا۔ قبائلی، فیوڈل اور سرمایہ داری نظام میں شادی اور خاندان انسانی معاشرے کا مرکز اور کلچر و تہذیب کا منبع ہوتے ہیں۔ بلوچوں میں معلوم تاریخ کے وقتوں سے یہ ادارہ مضبوط ہے۔ ہمارے سماجی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس ادارے میں بھی چھوٹی موٹی تبدیلیاں آتی رہیں۔ کہیں لب رہا، کہیں مٹنڈ، لانی بانہہ اور کہیں نیخ۔ مگر اس ادارے کی اہمیت ہر عہد میں برقرار رہی۔ افرادی قوت کی اشد ضرورت کے پیش نظر کم سنی کی شادیاں ہی رہیں۔

شادی کا موسم اور مہینہ باہم مشورے سے پہلے سے مقرر ہوتے ہیں۔ تاریخ ”چاند کی فلاں تاریخ“ ہی گنی جاتی ہے۔ بلوچستان کے کچھ علاقوں میں تاریخ کے مقرر ہونے کے ساتھ ہی

دولہا ”بادشاہ“ کہلانے لگتا ہے۔ اور اس کا سب سے عزیز اور قریبی دوست ”وزیر“ مقرر ہوتا ہے۔ شادی کے جشن کے انتظام، اور اس کے اخراجات مرد کی طرف سے ہوتے ہیں۔ شادی میں شرکت کی دعوت (لوٹ) بھی مرد کی جانب سے دی جاتی ہے۔ ذبح کیا جانے والا مویشی (زیادہ تر بیل، یا ملا جلا یا پھر، امیر لوگ ہوں تو صرف دنبے بکرے ذبح کیے جاتے ہیں)، جلانے والی لکڑی اور پانی کا انتظام بھی دولہا کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

سارے کام اجتماعی طور پر انجام پاتے ہیں۔ لوگ دولہا کو اخراجات میں باہمی امداد کے بطور نقد، جنس یا بھیڑ بکریوں کی صورت میں عطیہ دیتے ہیں جسے ”بجار“ کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک دوسرے کی امداد کرنے کا خوبصورت اور مہذب ترین سسٹم ہوتا ہے۔ ایک طرح کا قرض ہے جو وہ ایک دوسرے کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔

تاریخ سے ایک ہفتہ یا زیادہ دنوں قبل دلہن کو گھر میں بٹھایا جاتا ہے۔ اسے ”ڈھری“ کہتے ہیں۔ اس کی سہیلیاں دن رات ساتھ ہوتی ہیں۔ لڑکیاں شادی کی رات تک بلوہلو، اور لیلیا ژونامی شادی کے گیت گاتی ہیں، گھم، دھریس اور دوسرے قبائلی رقص و کھیلیں کھیلتی ہیں۔

مرد دولہا کی شادی سے چار دن پہلے مکمل طور پر سرگرم ہو جاتے ہیں۔ لکڑی پانی کا انتظام کرتے ہیں۔ ذبح کیے جانے والے مال مویشی کا بندوبست کرتے ہیں۔ پیغام رسالوں کے ذریعے آس پاس دعوتی پیغام بھیجتے ہیں۔ دو تین دن قبل مہمانوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ ان کی خاطر تواضع شروع ہو جاتی ہے۔ محفل اور مجلس منعقد ہوتی ہے۔ ڈومب اپنے سریندا (سارنگی) سمیت آن موجود ہوتے ہیں، فرمائشی گانے گیت بجتے ہیں، مزاح و مذاق اور حال احوال کے تبادلے ہوتے ہیں۔ ایک سماجی، سیاسی حتیٰ کہ معاشی میلہ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ بندوٹوں، کارتوسوں کی تجارت تو یقینی بات ہے۔ نوجوان رقص کی پھیریاں پھرتے ہیں۔

ڈومب کو نوجوان لوگ رقص کے بیچ ایک ایک، پانچ پانچ یا دس روپے دیتے جاتے ہیں۔ اس بخشش کو ”گھور“ کہتے ہیں۔ ڈومب زیادہ تر سریندا بجاتے ہیں۔ دمیر و (طنبورہ) بھی چل جاتا ہے۔ اگر یہ سازندے میسر نہ ہوں تو مجبوری ہے، ٹیپ ریکارڈ کے سیل نئے کرنے پڑتے ہیں

اور جب اس کا والیوم فل ہو تو ”پانی نہ ہو تو تپیم روا“ ہو جاتا ہے۔ اسی پہ رقص رواں رہتا ہے۔ یہاں سے ذرا دور عورتوں کی ”ہالو“ کی نمسگی، ڈبہبی کی مدھر وسندر زیر و بم سنائی دیتی ہے اور انسان کو دل مجبور کرتا ہے کہنے کو..... ”ہر روش ہے روش“ (ہر روز یہی روز)۔

شادی کے دن جھنجھ جاتی ہے دلہن کے گھر۔ دلہن کی سنگی سہیلیاں اور عزیز واقارب جھنج پر مرچوں، آٹا یا پھر گوبر سے حملہ کرتی ہیں۔ عورتیں اس کام کے لیے چھتوں پر باقاعدہ مورچہ زن ہوتی ہیں۔ ان کے ہتھیاروں میں گوندھا ہوا گوبر، آٹے کی تھالیاں یا مرچوں بھرے کٹورے ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہتھیار بے دریغ استعمال کرتی ہیں۔ دشمن (دولہا والے) زیادہ تر کوشش کرتے ہیں کہ گاندھی کی عدم تشدد والی پالیسی رائج ہو اور اس کے اصل مقصد (یعنی واپس دولہا کے گھر تک خیر و امن سے پہنچا جائے) کا حصول ہو۔

جب ایک بار آپ دلہن کے گھر پہنچ گئی تو پھر ساری جنگی فضا کے دیوتا یکدم بھسم ہو جاتے ہیں اور امن کی دیوی کی حاکمیت قائم ہو جاتی ہے۔ دولہا والوں کی طرف سے آئی ہوئی عورتیں دلہن کو زیور گھنے پہناتی ہیں۔ غریب اپنی غربت بھرے گھنے دیتا ہے اور امیر امارت بھرے زیور۔ زیور تو گویا شادی کی علامت ہوتے ہیں۔

دلہن شادی کے زیور اور کپڑے پہننے پہ سخت ترین مزاحمت کرتی ہے۔ وہ آسانی سے بال دھلوانے اور باٹن (اُٹن) لگوانے بھی نہیں دیتی..... اس کی دوشیزگی کی زندگی کے اختتام کی نشانیاں ہیں یہ۔ یہ اس کے ”لڑکی پن“ والی سرحد کے خاتمے اور عورت پن والی سلطنت کی شروعات کی علامتیں ہیں۔ اس کے دل میں بیک وقت نئی زندگی کی خوشخبری بھی ہے مگر والدین کا گھر چھوڑ دینا، اپنی سنگی سہیلیوں سے بچھڑ جانا، اپنے رشتہ داروں، عزیزوں سے جدائی، اور آبائی گھرانے اور علاقے کا پیچھے رہ جانا، اور اپنی ماں اور بہنوں سے جہنم نما جدائی کے رنج، اس کا دل ڈبو دیتے ہیں۔ اس کے آنسو اور آہیں دل کی گہرائی سے نکلتی ہیں۔ خود بھی زار زار روتی ہے اور اپنے ہمدردوں کو بھی دریا دریا رلاتی ہے۔ رونا اس کا کھار سز ہے۔ اس کا دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے رونے پر اسے برا بھلا کہا جاتا ہے۔ بوڑھی عورتیں ”خوشی اور جشن“ کے موقع پر رونے کو بری علامت قرار دیتی

2۔ طرز معاشرت

خورد و نوش

بلوچ سادہ غذا کھاتا ہے۔ کھانے پینے کا کوئی لمبا چوڑا انصرام و انتظام نہیں ہوتا۔ روٹی کو نغن (نَغْن) کہتے ہیں۔ مخصوص پتھر (Sand Stone) کی سل کو تو ا کی طرح تراش کر اسے تو ا کی شکل دیتے ہیں۔ اسے تانفغ کہتے ہیں۔ درگڑی، بسری، پو آ گندم سے پکی روٹی کی اقسام ہیں تانفغ پر، اور جوار باجرہ سے ڈوڈی اور پو آ بنتا ہے۔

ایمرجنسی میں ایک اور روٹی پکائی جاتی ہے اس کو ”کاک“ بولا جاتا ہے۔ یہ آج کل بلوچی ڈشتر کی ایک خصوصیت میں شامل ہے۔ یہاں تو، تانفغ اور تنور کے بجائے جلتی آگ کے کنارے ایک گرم کردہ گول پتھر کے گرد آٹا لپیٹ کر رکھا جاتا ہے۔ باہر سے آگ اور اندر سے گرم پتھر اسے پکا دیتے ہیں۔

ایک خانہ بدوش زندگی میں سالن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ موسم کے مطابق جنگلی سبزی مثلاً میہل اور کیٹنغ وغیرہ کو آگ میں بھون کر نمک لگا کر بطور سبزی استعمال کیا جاتا ہے۔ ابھی ماضی قریب تک سرخ مرچ یا گرم مصالحہ ہم لوگوں کے استعمال میں نہیں تھا۔

پانی عام طور پر بارش کا استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات چھوٹے سے کم گہرے تالاب میں انسان اور جنگلی جانور اکٹھے پانی پیتے ہیں۔ کہیں کہیں میٹھے اور کڑوے پانی کے چشمے بہتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ خشک ہو جاتے ہیں اور لوگ نقل مکانی کر جاتے ہیں۔

لباس

کہنے کو تو ہم پہ سفید کپڑے پہننے اور لمبے بال رکھنے کے اثرات قدیم پارس سے ہیں۔ مگر ہم چونکہ مہرگڑھ کے اہل و عیال ہیں جہاں کپاس (جو کہ سفید ہوتی ہے) کاشت ہوتی تھی۔ لہذا سفید پوشی دراصل وہیں سے آئی ہے۔ بلکہ اس سے بھی قبل جب مہرگڑھ کی کپاس کاشت نہ ہوتی تھی، تب پشم (جو سفید ہوتا ہے) ہی ہمارا لباس ہوا ہوگا۔ بعد میں تو خیر سفید پوشی واقعی ایک امتیازی

صفت بنی۔ معتبر، سردار تو ضرور سفید کپڑے پہنتا رہا۔ زرتشتی مولوی اور قبیلوں کے سردار سفید لباس پہنا کرتے تھے۔

بلوچ کا لباس شلوار اور کڑتی (کرتہ) ہے۔ کڑتی گھیرے دار عظیم الجذہ قمیص ہوتی ہے۔ لیکن اب کڑتی کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے اور دوسری عام قمیص اس کی جگہ لیتی جا رہی ہے۔ ہماری پگڑی بیس گز کی ہوتی ہے۔ اسے بہت خوبصورتی سے سر پر باندھا جاتا ہے۔ اور یہ بہت بارعب اور وضعدار دکھائی دیتی ہے۔

بلوچوں میں سر کے بال بہت لمبے رکھے جاتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی شوقین لوگ جب بیٹھ کر بالوں کا دوسرا سرا پاؤں کے انگوٹھے سے باندھ دیتے ہیں اور سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں، تو ان کے بال اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ جسم تن کر سیدھا ہونے کے باوجود بالوں پر کھچاؤ تک محسوس نہیں ہوتا۔ ان گھنے اور خوبصورت بالوں کے لیے پگڑی ہوتی ہے جو عزت و عصمت کی علامت ہوتی ہے۔ کسی کی پگڑی گرانا بہت بڑا جرم تصور ہوتا ہے۔ اپنی پگڑی کسی کے پاؤں پر رکھنے سے بڑے سے بڑا جرم بھی معاف کیا جاتا ہے۔ بڑی سے بڑی اور خوفناک ترین لڑائی میں اگر پگڑی لمبی کر کے درمیان میں بچھائی جائے تو یہ گویا جنگ بندی کی لائن ہوئی اور کوئی باشرף اور غیرت مند شخص اس پگڑی کو نہیں پھلانگے گا۔ بے شک وہ لڑائی بعد میں جاری رکھے مگر اس سے سیز فائر۔

بلوچ کی بل دی ہوئی مونچھوں کے ساتھ اس کی خوبصورت لمبی ہوئی داڑھی دراصل، انسانی آبادی میں اسے یکتا بناتی ہے۔ داڑھی سخن، قول اور عہد کی نشانی ہوتی ہے۔ ہاتھ داڑھی پر رکھ کر جو قول دیا جائے وہ پھر ہر حال میں پورا کرنا ہوتا ہے۔ چاکر، جاڑو، مرید، بیورغ، ہیوتان اور نوذ بندغ کی قسم بلوچوں کی تباہی کا باعث بنیں۔

تمباکو نوشی، تمباکو خوری

بلوچ چاکر کے دور تک بھنگ پیا کرتے تھے جس کی روایت مست تو کلی تک آگئی۔ کلاسیک شاعری میں جگہ جگہ اس کا ذکر ملتا ہے۔ مست کے بعد البتہ بھنگ ہمارا واحد مشروب نہ رہا۔ کچھ اور چیزیں بھی میدان میں آگئیں۔ شراب بھی پہلے سے چلی آرہی ہے۔

تمباکو البتہ ایک نیا مرض تھا بلوچ معاشرے میں۔ تمباکو کو دراصل پہلے پہلے سپین کے لوگوں نے 1492 میں کیوبا کے لوگوں سے سیکھا اور پھر وہ اسے یورپ لے گئے۔ مشرق میں تمباکو کی عادت پر تگالی لے آئے۔ وہ اسے جنوبی ہند میں لائے۔ بعد میں اکبر کے زمانے میں تمباکو شمالی خطوں میں آیا۔ (2)

تمباکو حقے میں بھی ڈال کر پیا جاتا ہے اور چلم میں بھی جسے ”پوڑ“ کہا جاتا ہے۔ پوڑ کو لکڑی، گپ (گارا)، اور پیش سے خوبصورتی سے بنایا جاتا ہے۔ آڑگیو (چمک) آگ جلانے کا لوکل انتظام ہے جو ابھی بھی استعمال ہوتا ہے۔ پیش کے پودے کی جڑوں پر زرد اور سرخ رنگ کے ریشے ہوتے ہیں جنہیں پوڑ کہا جاتا ہے۔ اسے شورے میں بھگو دیتے ہیں اور خشک کرتے ہیں۔ مری علاقے میں بوآخ نامی پانی کی جھیل میں بھی یہ خاصیت ہے۔ پڑاؤس پانی میں بھگو دیتے ہیں، خشک کرتے ہیں اور پھر ایک خصوصی چمکدار پتھر پر یہ پڑاؤ رکھ کر اس سے ایک لوہا (چمک) زور سے اس طرح مارتے ہیں کہ رگڑ پیدا ہو۔ اور اس سے بننے والی چنگاری سے پڑاؤس لگ جاتا ہے۔

مہمان نوازی

دنیا کے ہر قبائلی معاشرے کی طرح بلوچوں میں بھی مہمان نوازی ایک بہت ہی اہم سماجی فریضہ تصور ہوتا ہے۔ اور ہر سماج اپنی ساخت کے مطابقت میں مہمان نوازی کرتا ہے۔ بلوچ ایک نیم خانہ بدوش معاشرہ ہے۔ ایسے معاشرے میں جہاں دودھ بچنا گرا ہوا فعل تصور ہو، اور جہاں گندم کی روٹی پیسوں پر بیچنے کا تصور نہ ہو تو وہاں ہوٹل اور ریسٹورنٹ کا قیام کہاں ممکن ہوگا۔ اس لیے مسافروں کے کھانے اور رہائش کے لیے ہر بلوچ کا گھر اور خیمہ گویا ایک ہوٹل کا درجہ رکھتا ہے۔ ہر مسافر کا حق ہے کہ راہ گزرتے ہوئے جو خیمہ سامنے آئے وہ ایک وقت کا کھانا وہاں کھا سکتا ہے۔ معزز انداز میں خورد و نوش اور بستر پیش کرنے والا مفت ہوٹل۔ مسافر کا یہ استحقاق ہوتا ہے کہ کھانے کے وقت راستے میں کسی پہاڑ کے کسی بھی جلتے چولہے کا حصہ دار بن جائے۔ اسے محض ”مسافر ہوں“ کہنا پڑتا ہے۔ میزبان اس کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہے اور جو روکھی سوکھی ممکن ہو اسے لادیتا ہے۔

مہمان نوازی غیرت کا باقاعدہ حصہ تصور ہوتی ہے۔ روکھی روٹی سے لے کر سبھی تک جو ممکن ہوا، حاضر کی جاتی ہے۔ خاص مہمان خواہ ایک بھی ہو تو کوشش کی جاتی ہے کہ اس کی تکریم میں دنبہ کاٹ دیا جائے۔ عام لوگوں میں سات مہمانوں کے لیے میزبان دنبہ ذبح کر کے گوشت سے تواضع کرتا ہے۔ مہمان ایک گھر سے صرف ایک وقت کا کھانا کھا سکتا ہے۔ دوسرے ٹائم کا کھانا لازماً اسے کسی اگلے پڑاؤ کے آس پاس کسی دوسرے خیمے میں کھانا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگلے ٹائم کے لیے میزبان اسے روٹی پکا کر دے تاکہ وہ اپنی چادر کے پلو میں باندھ کر لے جائے اور سفر کے دوران جہاں کہیں بھوک لگ جائے کھالے۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ اگلے کھانے کے وقت تک وہ کسی خیمے تک پہنچ پائے گا یا نہیں۔

بلوچ کے لیے مہمان نوازی مقدس اور مہمان کی حفاظت کرنا لازمی ہے۔

مچی (جرگہ)

قبائلیوں کے گروپ کی ایسی میٹنگ جس میں کسی جھگڑے کا قابل قبول حل نکالنے کی کوشش ہو۔ جرگہ اور مرکہ میں ایک دو بڑے فرق موجود ہیں۔ جرگہ ایک بڑا اجتماع ہوتا ہے جس میں ”نکر“ کے بڑے یکجا ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص برابر کی عزت و سٹیٹس رکھتا ہے اور ہر شخص رائے رکھتا ہے۔ ہر بڑے تاریخی موقع پر جرگہ منعقد ہوتا ہے جس میں مسئلے کے پیش ہوتے ہیں۔ یہاں راضی نامے بھی ہوتے ہیں، معاہدے بھی اور جرمانے بھی۔ جرگہ کا فیصلہ ماننا ضروری ہوتا ہے۔ جرگہ آریالوگ کرتے تھے۔ بعد میں انگریز نے اسے ترقی دی اور باقاعدہ ادارے کی شکل دی۔

مرکہ (میڑھ)

ناراض کے منانے اور تصفیہ کرنے کی رسم کو مرکہ کہتے ہیں۔ مرکہ افراد اور گروہوں کے درمیان جنگوں اور جھگڑوں کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ دکھ پہنچنے والی پارٹی سے رابطہ کیا جاتا ہے اور اس سے رواج کے مطابق مرکہ کے لیے راضی ہونے کی درخواست کی جاتی ہے۔ اسے ”دگہ“ دینا، یعنی راستہ دینا کہتے ہیں۔ جب تک مرکہ کو ”دگ“ نہ ملے، لوگ مرکہ کرنے نہیں جاتے۔

اجازت ملنے کی صورت میں مرکہ کے وفد میں علاقے کے بڑے، وڈیرے اور سفید

ریشوں کے ہمراہ سید یا ملا بھی موجود ہوتے ہیں۔ عورت، قرآن اور سردار حسب ضرورت ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ وفد ناراض خاندان کے گھر جاتا ہے اور معافی مانگی جاتی ہے۔ قتل کا مرتکب بہت جنجال مائل تھا اور بہت مصیبتوں اور شرائط کے بعد معافی مل جاتی ہے۔ جو کہ ایک خون ریز علاقے میں رواداری اور بڑے پن کی علامت ہے۔

3- مذہبی معاملات

بلوچ ایک مذہم بہم خد پر عقیدہ رکھتے تھے۔ عبادت منظم نہیں ہوا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں عقیدہ رکھنا اور اسے جاری رکھنا آسان ہوا کرتے تھے۔ نیک اور برے کاموں کو رواج کے کوڈ میں سمجھا جاتا تھا۔ خدا اور انسان کے بیچ کوئی تیسرا شخص (ملا) موجود نہ تھا۔ گوکہ نصیر خان اول ایک بنیاد پرست حکمران آیا مگر اس کے بعد بلوچ دوبارہ اپنے آسان، مہربان اور دوستانہ خدا کو مانتے رہے۔ ضیاء الحق کے آنے تک یہاں لوگ مذہبی نہیں بلکہ قبائلی معاشرت میں رہتے رہے ہیں۔ مسلمان ہونے کے باوجود ان کو اسلام کے کئی بنیادی ارکان سے واقفیت کی ضرورت کبھی نہیں پڑی۔ البتہ مہذب ترین، نرم روادار و شفیق معاشرہ قائم تھا۔ مذہب بالکل غیر دوستانہ نہ رہا۔ میر گل خان نصیر کے بقول، ”بلوچ قوم..... مذہبی معاملات میں توہمات اور مذہبی جنون سے مبرا ہے“ (کوچ و بلوچ: 110)۔ بلوچ مذہبی رسم و رواج اور فرائض سے بے پرواہ لوگ ہیں۔

بلوچ اپنے مذہب میں سادہ ہے۔ اس کے ہاں مذہبی جنون بالکل نہیں ہے۔ ویسے بھی دنیا بھر میں ساحلوں اور پہاڑوں کے لوگ لبرل ہوتے ہیں۔ بلوچستان کا بھی یہی حال ہے۔

دلکش و حیران کن مانٹھا لوجی البتہ موجود ہے۔ ہماری مانٹھا لوجی دنیا کے دیگر علاقوں کی مانٹھا لوجی سے زبردست انداز میں ملتی جلتی ہے۔ مثلاً کہکشاں کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ یہ اُس دنبے کے گرد و غبار ہیں جو دوڑتے ہوئے حضرت آدم کے پاس گیا تاکہ حضرت اسماعیل کے بجائے اُسے ذبح کیا جائے۔ گر یک مانٹھا لوجی میں کہکشاں اُس دودھ کی چھینٹیں ہیں جو دیوی، ہیرا کے پستان سے چھلکنے سے وجود میں آئیں (جب وہ ہنی مون منار ہی تھی)۔ ہماری یہ قدیم مانٹھا

لوجی خواہ جس قدر بھی اپنا گاڑھا پن ختم کر چکی ہو مگر ہمارے رویوں میں کہیں نہ کہیں یہ موجود بہر حال رہتی ہے۔

بلوچستان میں لوگوں کی بڑی اکثریت سنی ہے، شیعہ اور ذگری بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچوں میں ہندو عیسائی اور سکھ مذہب کے پیروکار بھی ہیں جن میں بلوچستان اسمبلی میں ایک ایک ممبر ہوتا ہے۔ یہ عموماً بگٹی، ڈومبکی یا قلات کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بلوچ من حیث القوم ایک بار مسلمان ہوا تو پھر اس نے مذہب بدلا کبھی نہیں۔ وہ عقیدہ برآمد کرنے والا مسلمان بھی کبھی نہیں رہا۔

چونکہ قبائلی علاقوں میں مسجدیں زیادہ نہیں ہیں اس لیے ملا بھی بہت کم ہیں۔ روزہ نماز ان جگہوں پر ہیں جہاں لوگ خیموں کے بجائے مکانات میں رہتے ہیں۔ سید بھی سب باہر کے ہوتے ہیں۔ ملا نکاح اور جنازہ کے لیے ہوتا ہے مگر پیر پرستش کی حد تک مانے جاتے ہیں۔ اولیا کا ذکر ہماری شاعری، ہمارے محاوروں اور روزمرہ گفتگو میں بہت ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ معہ پورا خانوادہ ہم سب کا مرشد ہے، بالخصوص بلوچ شعرا کا۔ اس کے بعد ولی تقریباً ہمارے اپنے مقامی لوگ گزرے ہیں۔ سید باہر کے ہوتے ہیں مگر پیرو ولی ہمارے اپنے۔ شیعہ مرید ہیں۔ گلیٹیوں میں پیر سوہری، بزداروں میں پیر گھنڑوں، کھیتراؤ کے علاقہ میں شاہ محمود، ادھر مستیں توکلی، سومائی، ڈھادر کے دو پاسی، تونسہ میں خواجگان، ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں سخی سرور، نوشکی میں بلانوش، جنوب مشرق میں شاہ نورانی کراچی کا عبداللہ شاہ غازی، خضدار میں راجہ خضدار اور پیر عمر بہت مریدوں والے پیر ہیں۔ چیکب آباد میں پہلوان فقیر، گندواہ کے علاقے میں..... سبی میں شے کٹے۔

اس کے علاوہ قبیلے کا سردار بھی بزرگی و کرامت سے خالی نہیں سمجھا جاتا۔ بحالت جنابت ناپاکی سردار کا نام لینا گناہ عظیم تصور ہوتا تھا۔ جنابت کی حالت میں گندم بو آئی، گندم لاپ، گندم کی روٹی کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

مانٹھا لوجی کی تعمیر بہت مزیدار کی گئی ہے۔ ذرا پیر سوہری کو دیکھیں۔ وہ ایک پیر وزانی نوٹانی تھا۔ ایک چرواہا۔ جب ”چہار یار“ آ گئے۔ اور اُس سے ایک بکری مانگ لی تو پیر سوہری نے

جواب دیا کہ سارے ریوڑ میں اس کی اپنی صرف ایک بکری ہے۔ اور اُس نے خوشی خوشی وہ بکری انہیں دے دی۔ جس کو انہوں نے سچی کر کے کھالیا۔ عوض میں انہوں نے پیر سوہری سے کہا کہ جس وقت مالک اُسے چرواہا گیری سے نکال دے تو وہ اپنا حصہ تقسیم کر کے جدا کر لے۔ اس کا ایسا ریوڑ بنے گا جو پہلے اس علاقے میں نہیں ہوا۔ انہوں نے اسے ایک ڈنڈا بھی دے دیا کہ جب ضرورت محسوس کرے زمین پہ مار دے، وہیں سے پانی نکلے گا۔ اس طرح اسے اپنے ریوڑ کو پانی پلانے کے لیے میلوں کی مسافت طے نہیں کرنی پڑے گی۔

پیر سوہری ایک صبح جب جاگا تو دیکھا کہ ریوڑ ایسی بکریوں سے بھرا ہوا تھا جن کی رنگت نسواری تھی۔ ایسی بکریاں پورے علاقے میں نہ تھیں۔ بلیدی قبیلہ والے آئے اور آ کر پیر سوہری کا سرتن سے جدا کر دیا اور اس کی بکریاں لے گئے۔ مگر پیر سوہری اپنا سراسر اپنے ہاتھوں میں لیے دشمنوں کے پیچھے گیا اور اپنی بکریاں چھڑا لیا۔

بلوچوں کے پیروں کے مزار دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ عورتیں اپنے بال کاٹ کر یا اپنی کشیدہ کاری اور کڑھائی کی چیزیں لا کر مزار پر لٹکا دیتی ہیں۔ یہ منت مانگنے سے پہلے کی رشوت بھی ہوتی ہے اور منت پوری ہونے کے بعد کا شکرانہ بھی۔ اسی طرح زینہ اولاد کے سر کے بال جب پہلی بار اتار دیے جاتے ہیں تو وہ بھی پیر کے مزار پر لٹکا دیے جاتے ہیں۔ کوہ سلیمان سے لے کر سب تک آپ کو جو بھی بڑا، سرسبز اور پرانا درخت نظر آئے تو وہاں خواتین کے گندھے ہوئے بال لٹکتے نظر آئیں گے۔ سایہ دار درخت تو مست کی اوطاق ہوا کرتا تھا۔

بچے کے بالوں کے ساتھ ساتھ پیر کے مزار پر ٹافیوں کی تھیلیاں، بلیڈ، خوبصورت چھوٹے موٹے پتھر، رنگین رومال، الغرض بے شمار چیزیں رکھی اور لٹکا کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی قبر پر حسبِ توفیق قیمتی یا عام سے کپڑے کی چادریں بچھا دی جاتی ہیں۔ یہ کام بالخصوص مست توکلی کی شان والی محبوبہ سمو کے مزار پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

وہاؤگند

”وہاؤگند“ یا خواب دیکھنے والوں کو پیر کا درجہ حاصل ہے۔ زیادہ تر بوڑھی عورتیں اور نیم

مجنون لوگ ہی خواب دیکھنے کے ماہر تصور ہوتے ہیں۔ بارش کے بارے میں خواب دیکھنے والوں کی طرف خصوصاً دیکھا جاتا ہے، اسی طرح دشمن داری، مال مویشی اور زینہ اولاد کی پیدائش میں بھی دلچسپی لی جاتی ہے۔ سائنسی سوچ کی عدم موجودگی اور سائنسی ماحول کی عدم دستیابی کے باعث لوگ خواب پر اچھا خاصا عقیدہ رکھتے ہیں۔

براخواب دیکھنے پر صبح سویرے اس کی مداوائی تدبیر کے بطور خیرات کی جاتی ہے۔ کچھ اور نہ ملایا مالی سکت نہ تھی تو اپنے ہی کنبے میں ”بروخ“، تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک چپاتی کے چھ آٹھ ٹکڑے بنا کر گھر کے افراد میں خیرات کے بطور تقسیم کی جاتی ہے۔

چنشغ

”چنشغ“ یا چھینکنا ایک اور واہمہ ہے جسے عموماً برا سمجھا جاتا ہے۔ لوگ سفر پہ رواں لگی کے وقت کسی کے چھینکنے کے باعث اپنا ضروری تک سفر ملتوی کرتے ہیں۔ سوداگری اور اسی طرح کے دیگر اہم معاملات پہ فیصلوں کو موخر یا منسوخ کیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر نقصان ہونے کا عقیدہ عام ہے۔

پذگوانک

”پذگوانک“ یا چلتے ہوئے شخص کو پیچھے سے بلانا یا پکارنا برا شگون تصور کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ضروری سفر کو ملتوی یا منسوخ کیا جاتا ہے۔

چبو

گھر میں جوتی اتار دیں تو اگر چپلی ایک دوسرے پر چڑھ جائے تو خیال کیا جاتا ہے کہ سفر پر جانا پڑے گا۔ اسی طرح چپلوں کی پوزیشن بھی بہت سارے ممکنہ واقعات و حادثات کی علامت ہوتی ہے۔

چمہ پڑینغ

آنکھ کے پوٹے اگر غیر ارادی طور پر پھڑکنے لگیں تو اس میں کئی باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اگر آنکھ کی اوپر والا پوٹا حرکت کرتا رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اوپر سے بارش کے قطرے

اس پر گریں گے اور اسے بھگودیں گے، یعنی بارش ہوگی۔

اگر خدا نخواستہ پٹلی پلک پھڑکنی شروع ہو جائے تو یہ آنسوؤں کی علامت ہوتی ہے جو بہر حال کسی حادثے اور ہلاکت کا پیش خیمہ تصور ہوتا ہے۔

پونزہ مُشغ

ناک کی کھلی عموماً گوشت کھانے کی پیش بینی کرتی ہے۔ یہ گوشت خوری خوشی کی بھی ہو سکتی ہے اور غم کی بھی۔ اسی طرح اگر کتے والی مکھی (ڈھنگ) آدمی پر آ کر بیٹھ جائے تب بھی گوشت کھانا قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔

ونگہ کیغ

پیڑ کی خارش البتہ ڈنڈے کھانے کی نوید ہوتی ہے اور یہ کسی لڑائی کی پیش گوئی تصور ہوتی ہے۔

پاڈہ تلی ء کیغ

پاؤں کی ہتھیلی کی خارش یا تو گیلی مٹی پر پاؤں رکھنے یعنی بارش ہونے کی نشانی ہوتی ہے یا پھر کسی یار آشنا، یا کسی عزیز رشتہ دار اور یا کسی مہمان کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے۔

دستہ تلی ء کیغ

کوہستانی بھیڑ پال زندگی میں کسی سے ہاتھ ملانے کی نعمت و نوبت شہر کی بہ نسبت بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ ہاتھ کی ہتھیلی میں خارش اس بات کا شگون ہوتی ہے کہ آج کوئی مسافر، کوئی عزیز رشتہ دار، یا دوست سے مصافحہ کرنے کا خوش نصیب موقع ملے گا۔

سڈ کی

بچگی ہمیشہ یہ بتاتی ہے کہ آپ کو کہیں کوئی اداس دل پکار رہا ہے، یا آپ کا کہیں ذکر ہو رہا ہے۔ ڈیہی پڑھیے؛

مہر مہیں ناما

مارسڈ کی زیریاں سیالانی نیاماڈ

(میرا نام نہ لینا۔ مجھے ہم مرتبت دشمنوں کے پیچھے آئے گی)

بڑ دست

مویشی کی بڑ دست یا شانے والی ہڈی پڑھ کر بلوچ بہت ساری پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ اس سے بارش، ہڈی دل، جنگ، خوشحالی، علاقے پر فوج کشی یا کسی بڑے انسان کی موت واقع ہونے کی پیش گوئیاں ہو سکتی ہیں۔ ”بڑ دست ہیں“ کے مطابق شانے کی ہڈی میں موجود نقشہ میں تقریباً 400 مربع میل کے دائرے میں پیش آنے والے واقعات کے اشارے موجود ہوتے ہیں۔ عام طور پر پیش گوئی کے لیے تازہ ہڈی استعمال ہوتی ہے۔

ہیرانی پٹغ

یہ ایک ایسا واہمہ ہوتی ہے جس میں عموماً رات گئے جب کوئی عورت بچے کو دودھ پلانے اٹھ جاتی ہے تو اسے آسمان سے فرشتوں کے ماتم کرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ ہیرا فرشتے تعداد میں تین ہوتے ہیں جو فریاد کرتے اڑتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ یہ کسی بڑے انسان کی موت کا ماتم ہوتا ہے۔ ایک فرشتہ بیٹیاں بجاتا رہتا ہے، دوسرا اس آدمی کا (عورت کا ہرگز نہیں) نام لیتا جاتا ہے اور تیسرا فرشتہ ”ہائے ہائے“ کی آوازیں نکالتا رہتا ہے۔

گہانچ

بلوچ، پرندوں کو شگون کے بطور اچھا یا برا مانتے ہیں۔ وہ مافوق الفطرت پر ایمان رکھتے ہیں اور چانس اور بری بلاؤں پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ گہانچ نامی پرندہ اگر انسان کی دائیں طرف سے گاتا ہوا گزرے تو زبردست خوشی اور خوشخبری ملنے کی نوید ہوتی ہے، مگر بائیں طرف سے اس کا چننا بہت ہی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

ڈوڈو کرا نکغ

”کرا نک کرا نک ڈوڈو و ہشیں حالے بیار“۔ یہ میوزیکل فقرہ ہم بچپن میں سنا کرتے تھے۔ ہمارے پورے خطے میں کوئے کا کائیں کائیں کرنا خوشخبری جانا جاتی ہے۔ لیکن یہ کوا شہر والا بدتمیز کوا نہیں ہے جو ہمیشہ کا ابوالکلام ہے۔ ہمیں اچھی خبر سننے والا کوا زیادہ کالے رنگ کا ہوتا ہے اور کم تعداد میں بھی۔ انسانی عقائد ہیں، دلچسپ ورنگین!!

بینگانی اور آدھ

عموماً تو کتا بھونکتا ہے مگر کبھی کبھی وہ گیدڑ کی طرح چیختا بھی ہے، بالخصوص رات کو، زمستانی رات کو۔ بہت مخوس خیال کیا جاتا ہے۔ کتے کی ویسے بھی کوئی خاص عزت نہیں کی جاتی ماسوائے چرواہے کے کتے کی۔ کتا تو یورپ میں سر پر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔

ذکر

ذکر یا ما، ہم تمام بقیہ بلوچوں کی طرح بہت توہمات والے لوگ ہیں۔ ”ذکر“ سے ان کا نام نکلا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی عبادتوں میں اس کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عقیدے اور مکران میں بلیدیوں کی حکمرانی میں خاصا تعلق تھا۔ اس کے لیے کہ بلیدیوں کی حکمرانی میں یہ عقیدہ خوب پھیلا ہوا پھولا۔ گوادر شہر میں 50 فیصد لوگ ذکر ہیں۔ یہاں چھیروں کی اکثریت ذکریوں کی ہے۔ بقیہ مغربی اور وسطی بلوچستان، اور کراچی میں بھی ان کی بڑی تعداد ہے۔ ان کا پیشوا ”ملئی“ کہلاتا ہے۔ ملئی، موروٹی عہدہ ہے۔

ابھی تک ذکر اور نمازی باہم شادیاں کرتے ہیں۔ قبرستان، البتہ الگ الگ ہیں کہ ”نان بلوچ“، ملا بالآخر یہ نفاق ڈالنے میں کامیاب ہوئی گیا۔ پروپیگنڈہ کے برعکس یہاں مرد الگ عبادت کرتے ہیں اور عورتیں الگ۔ یار بلوچ معاشرہ میں یہ کہاں ممکن کہ مخلوط عبادت گاہیں ہوں۔ کتنے نائرس ہیں وہ لوگ جو یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ 27 رمضان کی رات کو مردوزن بے لباس عبادت نما بد اخلاقی کرتے ہیں۔ ناروا اور نائرس لوگ۔ ذکر یا پس ماندہ، پہاڑی اور غیرت میں بنیاد پرست بلوچوں کا مذہب نہ ہو اور گویا جدید یورپ کا ہو۔ جھوٹے پر خدا کی..... (چلو میں ”مار“ لکھتا ہوں)۔

مردوں کا ذکر خانہ مردانہ وجاہت اور بناؤ سنگھار کا نمونہ ہے جبکہ عورتوں کا ذکر خانہ بلوچ عورت کے سماجی مقام کی طرح بد حال تھا۔

بلوچی میں صبح کی عبادت کو ”باسار“ کہتے ہیں جو ایک گھنٹہ کی ہوتی ہے۔ جبکہ ظہر اور عشا کو ذکر ہوتا ہے۔ جمعہ کو نماز نہیں ہوتی۔ میں نے جب کراچی میں اپنے ایک غیر مسلم دوست کو بتایا کہ

ذکر یا کاسجدہ پانچ منٹ لمبا ہوتا ہے تو اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”جس کے سجدے اس قدر طویل ہوں، میں اس فرقے میں شامل نہیں ہو سکتا“۔

ذکر یا اب ہمارے سنی ملا کے اکسانے اور اشتعال دلانے پر بالآخر ایک واحد مذہب بن جائے گا وگرنہ اب تک تو وہ مختلف علاقوں میں مختلف انداز میں عبادت کرتے ہیں۔ اس کی کوئی مرکزی اور واحد شکل نہیں ہے۔ کوئی بلوچ کہاں پڑا ہوا ہے، کوئی کہیں رہائش پذیر ہے اور رسل و رسائل میں نہیں۔ لہذا ہر وادی نے اپنی الگ ذکر یا گیری قائم کر رکھی ہے۔ جو پوری صاحب کے بارے میں ان میں متضاد باتیں ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ آیا تھا مکران، کچھ کہتے ہیں کہ وہ خود تو کبھی نہیں آیا مگر اس کا کوئی چیلہ شاگرد آیا تھا۔ اسی طرح کچھ کہتے ہیں کہ وہ شیعیت کے قریب ہیں۔ کچھ کو تو کوئی بات معلوم ہی نہیں۔ (ارے بابا اکثریت کو کچھ معلوم نہیں!)۔

بلوچ اپنے عقیدوں میں بہت لبرل ہے۔ مگر جب پشین، قندھار، اور جھنگ، ہزارہ کے سارے ملا اکٹھے ہو کر کلاشکوف سے مسلح ہو کر ذکریوں کی عبادت گاہوں پر حملہ کرنے تربت پہنچیں، کر فیو کی نوبت آئے، کافر، غدار کے فتوے بیٹیں، تو اگلا بھی بلوچ ہے، ضد میں آکر کوئی بھی اعلان کر سکتا ہے۔ اور توبہ ہے بلوچ کی ضد سے!!۔ اسی ضد میں تو اس نے اپنا وطن بلوچستان بیگوں کے حوالے کر کے خود کو شاہ حسین کی پناہ میں جھونک دیا تھا۔

ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا ذکر یا فرقہ میں کون سا ایسا پیغام، سیاسی یا معاشی کشش یا دنیاوی نجات کی بات تھی کہ سارے غلام، چرواہے، ماہی گیر، محنت کش اور نچلے طبقے کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ پنجگور سے لے کر مند اور سیستان تک سارے لوگ ذکر یا ہیں۔ اس لیے کوئی تو سماجی انصاف کی بات ہوگی اس میں۔ اس ذکر یا عقیدے کا سماجی پیغام ڈھونڈنا محققوں کے لیے ایک اچھا خاصا بڑا چیلنج ہے۔

یہاں کے لوگ ایک اور روایت کی پیروی بھی کرتے ہیں جسے مولود کہتے ہیں۔ اس تقریب میں لوگ دائرے میں بیٹھ کر گھنٹہ ڈیڑھ تک اذکار کرتے ہیں۔ یہ تقریب عموماً کسی خوشی کے موقع پر منعقد ہوتی ہے جس کے بعد میزبان حسب استطاعت دعوت کا انتظام کرتا ہے۔ پھر ایک

عجیب مظاہرہ ہوتا ہے۔ ایک لوہے کی زنجیر ہوتی ہے جسے آگ میں سرخ کر کے لٹکا دیا جاتا ہے۔ پھر یہ لوگ ہاتھوں پر تیل ل کر زنجیر پر اوپر سے نیچے لٹکنے کے انداز میں مضبوطی سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اس طرح کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں سے شعلے نکلتے ہیں مگر خود ان کا ہاتھ بالکل بھی نہیں جلتا۔ مولودرات کی تقریب ہوتی ہے۔

مگر ”شے پر جا“ دن رات کو کسی بھی وقت منعقد کی جاسکتی ہے۔ اس میں زنجیری کرتب تو نہیں ہوتا لیکن لوگ وجد میں آ کر اپنے بدن میں سونیاں چبھوتے ہیں، سینے اور پیٹ میں چھرا گھونپ لیتے ہیں۔ لیکن نہ تو انہیں درد کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی زخم کا کوئی نشان باقی رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ خواجہ خدر (خضر) کو مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ سمندروں کی حفاظت کرتا ہے، مگر رہتا ساحلی علاقوں میں ہے۔ جنوبی مغربی چا بہار میں تو اس کے قدموں کے نشانات بھی ”دریافت“ ہوئے ہیں جو وہاں کے لوگوں کے لیے زیارت گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادھر سلیمانی علاقے میں بھی خواجہ خدر کا تصور موجود ہے، مگر اُس جگہ ایک اور اساطیر نے لے لی ہے:

شہ مرید مع اپنے اونٹ کے
بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتا ہے

4۔ ممنوعات

بلوچ کچھ کام ایسے بھی کرتے ہیں جن کا سبب یا افادیت خود انہیں بھی معلوم نہیں ہوتا۔ مگر وہ عقیدے کی مانند بڑی سختی سے ان پر عمل کرتے ہیں۔ مثلاً مری قبیلے میں بجا رانی گردہ نہیں کھاتے۔ نہ وجہ کا پتہ نہ یہ معلوم کہ یہ رسم کب سے آئی، کس نے ایجاد کی؟ بس ایک قسم، ایک حلف کی طرح وہ اس پر قائم ہیں۔ مری قبیلہ ہی میں گزنی لوگ جب پکی ہوئی بجی سیخ سے جدا کرتے ہیں تو گوشت کا جو ٹکڑا اس سیخ پہ چپک کر رہ جاتا ہے اسے بالکل نہیں کھاتے۔ لاشاری بلوچ آٹرو کو ہاتھ نہیں لگاتا جو ایک مزے دار پودا ہے جسے عورتیں بہت شوق سے کھاتی ہیں۔ ایک اس کے ذائقے

کے سبب، اور دوسرا اس لیے کہ چبا کر کھائیں تو میٹھی آواز نکلتی ہے۔

مری کو ادھیری اچھی نہیں لگتی۔ رندا اونٹ کا گوشت نہیں کھاتا۔ کلات کے چشتی سید اندھیرا ہونے کے بعد بھیر کی سری نہیں کھاتے۔ بھلک گردہ نہیں کھاتے۔ لڑاؤ چھڑے آنتیں نہیں کھاتا، عمرانی لمبی گردن والے پانی کے برتن یعنی صراحی کی شکل سے نفرت کرتا ہے۔ جمالی اوپلے جلانے کو برداشت نہیں کرتا۔ بگٹی میں پیش بر لوگ بڑ دست یعنی شانے پر موجود گوشت نہیں کھاتا۔ ہاجیہ بلیدی جانور کا گردہ نہیں کھاتے، واگہ جت فاخہ نہیں کھاتے، کلوار جت کسی جانور کا دل اور کلیجہ نہیں کھاتے۔ اسی طرح بہت سارے لوگ کبوتر اور خرگوش کا گوشت نہیں کھاتے۔

5۔ کھیلیں

آئوٹ ڈور گیمز :

کمان جنگ

تیر کمان سے شکار کیا جاتا رہا ہے۔ نیز اس کی نشانہ بازی کے مقابلے ابھی حال تک بہت مقبول ہوا کرتے تھے۔ یوں تو پہاڑی بکرا، دنبے اور ہرن کو بھاگ کر پکڑنے کا شغل بھی ہوتا رہا ہے۔ میلہ و جشن میں تیر اندازی کے مقابلے منعقد ہوتے تھے۔ تن و توانا رند نشان جنگ (تیر اندازی) کے شوقین تھے۔

مگر پندرہویں سولہویں صدی کے بلوچستان میں تیر کمان اہم بنا، تلوار اہم بنی اور گھوڑا اہم بنا۔ اُس وقت کی جنگوں میں یہی ہمارے ایف 16 ہوا کرتے تھے۔ تیر اور کمان کے تذکروں سے بلوچی کلاسیکل شاعری بھری پڑی ہے۔ جنگوں میں تو ہتھیار ہی یہ اور تلوار ہوا کرتے تھے، اس کے مقابلے بھی روزمرہ کے امور ہوا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اسی کھیل سے تو رند و لاشاری تیس سالہ بلوچ ”سر بُر“ کھیل شروع ہوا تھا۔

انسان کی خون آشامی ہمارا اس قدر قدیم حصہ ہے کہ اس کا خاتمہ کرنا بہت مشکل ہے،

بالخصوص اس صورت میں جب لڑائی یا شکار کو کھیل کا حصہ بنالیا گیا ہو۔

ہمارا کندھا اور ہمارا تیرکمان، ہمارا کندھا اور ہماری بندوق، ہمارا کندھا اور ہماری کلاشتکوف، ہمارا کندھا اور ہمارا راکٹ لانچر..... کیا ہم جنگی دیوتا کی رعیت قرار دیے گئے ہیں؟!

تیرکمان کی نشانہ بازی کی جگہ البتہ کلاشتکوف کی انسان کشی نے لے لی، باقی باتیں وہی ہیں۔

تلوار بازی

تلوار بازی بلوچوں میں کبھی کھیل نہ رہی۔ یورپ میں یہ کھیل ہے۔ اس کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو تلوار خواہ مصری ہو یا، ہندی، اصفہانی ہو یا شیرازی یہ صرف انسانی خون بہانے کے لیے ہوتی ہے۔ تلوار ہماری کلاسیکل شاعری میں بہادر انسان کے بعد دوسری سو پر پاور رہی ہے۔

جانوروں کا شکار

ہم غلیل و پتھر و بندوق کے شکار کی بات نہیں کر رہے کہ وہ تو دنیا بھر میں رائج ہیں۔ نہ ہی ہم پہاڑی دنبے اور ہرن کے شکار کی بات کر رہے ہیں۔ ہم دست و بازو سے خطرناک درندہ نما جانوروں کے شکار کی بات کر رہے ہیں۔ بلوچ کانٹوں بھرے جانور سینج کو اپنی جوار کی فصل کو تباہ کرنے کے جرم میں ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لگڑ بھگڑ کو اس کے بل کے اندر جا کر زندہ سلامت پکڑنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔

کوهه سنغ

پتھر کون کتنا دور پھینک سکتا ہے۔ اچھا شغل ہے جوانوں کا۔ اس کے لیے کھیل کے میدان کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، نہ ہی اس کھیل کے انعقاد کے لیے خاص جشن و تقریب کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جہاں چار چھ نو جوان اکٹھے ہوئے یہ ٹورنامنٹ جم گیا۔

بک

قبائلی بلوچ ایسی کھیلوں پہ عاشق تھے جو کھلے اور وسیع میدانوں میں کھیلے جاسکتے۔ نشانہ

بازی، شکار اور گھڑ دوڑ..... بازو آ زمانا اور کشتی (بک) ”نیم ان ڈور گیمز ہیں اور نیم آؤٹ ڈور“۔ بک میں کپڑے اتارنے ضروری نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کو بچھاڑنے کی کوشش ہوتی ہے۔ عید، شادی اور جشن کے مواقع پر یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی کمر کے بجائے نیفہ سے پکڑ کر کشتی لڑی جاتی ہے۔

دِرک (جمپنگ)

لانگ جمپ میں کھلاڑی دور سے بھاگا ہوا آتا ہے۔ دو آدمیوں نے اپنے کندھوں کی اونچائی میں چادر پکڑی ہوتی ہے۔ کھلاڑی اسے پھلانگتا ہے اس طرح کہ جسم کا کوئی حصہ اس چادر سے چھوئے نہیں۔ اگلی دفعہ چادر مزید اونچائی میں پکڑی جاتی ہے۔ ”جکشی درک“ میں کھلاڑی بھاگ کر نہیں آتا بلکہ وہیں کھڑے کھڑے چادر کو پھلانگتا ہے۔ یہ اونچائی کے درک ہوتے ہیں۔ دراز اذہ درک (لانگ جمپ) تو عالمی طور پر ایک ہی طریقہ سے لگائی جاتی ہے۔

تیلچکائی

تیل چکائی (رسہ کشی) بھی ہوتی ہے۔ جہاں ایک ٹیم میں دس سے لے کر پچاس تک کھلاڑی ہوتے ہیں۔ سلیم خان گی کے بقول اس کھیل میں طاقت اور صبر دونوں ضروری ہیں۔ (3)

ہست

ہست نامی ایک کھیل بلوچوں میں بہت شوق سے کھیلا جاتا ہے۔ یہ گویا کھیل بھی ہے، ورزش بھی اور جواں مردی و قوت کا اظہار بھی۔ ہر ٹیم میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ ایک ٹیم کے کھلاڑی اس طرح کا دائرہ بناتے ہیں کہ ان کی پٹھیں باہم ملے ہوئی ہوتی ہیں اور چہرے بیرونی طرف مخالف ٹیم کی جانب ہوتے ہیں۔ باہر کے ٹیم کے آدمی اندر والوں میں سے کسی کو ہاتھ لگانے کی (خاص کر سینے پر) کوشش کرتے ہیں۔ اندر والی ٹیم کے کھلاڑی ان ہاتھ لگانے والوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاتھ لگانے والا اول تو پکڑائی نہیں دیتا اور اگر پکڑا بھی جائے تو خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر پکڑے جانے کی صورت میں اس وقت تک نہیں چھوٹتا جب تک کہ

”بیل“ (چھوڑ دو) نہ بولے۔ یہ گویا اپنی ہارتسلیم کرنے کا اعلان ہوتا ہے۔

پنجری زیرغ

ایک 5 سے لے کر دس گیارہ سالہ لڑکا اس طرح اکڑوں بیٹھ جاتا ہے کہ ایک گول گھڑی جیسا لگتا ہے۔ کھلاڑی نے ایک ہاتھ سے اسے اٹھا کر اپنے سر تک لے جانا ہوتا ہے۔ وہ کتنی بار ایسا کر سکتا ہے۔ یہی سکور بورڈ ہے۔

ڈنٹی ڈوک

ایک طرح کا گلی ڈنڈا ہوتا ہے۔

لکاں بوٹی

یہ ہو بہو آنکھ پھولی ہوتی ہے۔

کلیڈو

بچوں کا کھیل ہے۔ ایک ٹیم نے آنکھیں بند کرنی ہوتی ہیں۔ دوسری ٹیم مختلف پوشیدہ جگہوں پہ مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں بناتی ہے۔ پھر آنکھیں بند کی ہوئی ٹیم آنکھیں کھولتی ہے، ان ٹیکریوں کو ڈھونڈتی اور مٹاتی ہے۔ مٹ جانے سے بچنے والی ٹیکریاں سکوار بناتی ہیں۔

دستانی مڑا ئیننغ

اسی طرح بازو آزمانے یعنی ”دستانی مڑا ئیننغ“ بھی مقبول کھیل ہے۔ دلچسپ ہے کہ یہ کھیل یورپ و ایشیا میں ہر جگہ مقبول و مشہور ہے۔

گرگاں پسی

”گرگاں پسی“ ورزش اور سانس کو لمبی دیر تک روکے رکھنے کے لیے کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑی ایک دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک کھلاڑی اس دائرہ کے گرد اس وقت تک دوڑتا ہے جب تک کہ اس کی سانس ٹوٹ نہیں جاتی۔ تب اس کی جگہ دوسرا کھلاڑی لے لیتا ہے۔ (4) یہ سارا کھیل آج بھی جاری ہے۔

آدمی دوڑ، گھڑ دوڑ

کھلاڑیوں کے درمیان دوڑ کے مقابلے اور اسی طرح گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے ہیں۔ آدمی شادیوں اور دیگر جشنوں میں دوڑ کے مقابلوں میں دوڑتے ہیں۔ ایسی سماجی زندگی میں جب سماج ابھی ترقی یافتہ نہ تھا، گھوڑے کی اہمیت مرکزی تھی۔ گھوڑی جان سے بھی پیاری تھی۔ ہم اُس دور کی شاعری میں گھوڑی کے لیے بے شمار نام پڑھ سکتے ہیں۔ بے شمار نسل گنوا سکتے ہیں: ایرانی، عربی (تازی)، سمند، ترکی، مُشکی، بور، کمیٹ، مہلب، مل، سہرنگ، کندھی..... سبک رفتار گھوڑی جنگ میں فتح کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔

ان ڈور گیمز:

مرد لوگ ان ڈور گیمز میں چپاری، نوٹز (کتار)، کٹک، ویری، ٹوٹ، بازاری، شیھ ترپ، بھیدی اور بوک (چھدا) کھیلتے ہیں۔

چونک: اب تقریباً نایاب ان ڈور گیم ہے۔ اس سے متعلق باتیں بلوچی زبان میں محاوروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی کھیل کی بساط کو ”ڈر“ کہتے ہیں۔ محاورہ ہے ”بھیدی میں ڈراں“۔ عورتوں کی البتہ ساری کی ساری کھیلیں ان ڈور ہیں۔ ان میں کلٹنغ ہے، لکاں بوٹی ہے۔ آلی بھر کنڈر سنڈھی ٹاکی، ٹوپ، کلیر واور گھمر ہیں۔ چلو پوچ ہے۔

6۔ ادب

لفظ کی اہمیت کوئی بلوچوں میں دیکھے۔ بلوچ کی Sensitivities میں جن عناصر کو مرگ و زیست کی اہمیت حاصل ہے، اُن میں لفظ اہم ترین ہے۔ ویسے بھی انسان نے تباہی کی جتنی خطرناک چیزیں ایجاد کی ہیں ان میں سب سے خطرناک اور طاقتور چیز ”لفظ“ ہے۔ خنجر اور نیزے خون کے دھبے چھوڑ جاتے ہیں، تیروں کو دور سے دیکھا جاسکتا ہے، زہر آخر میں معلوم کیا جاسکتا ہے مگر لفظ بغیر نشان چھوڑے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ بلوچی ضرب المثل ہے کہ: دف کلائے، دف بلائے (منہ کرامت بھی ہے، منہ بلا بھی ہے)۔ یا ”کوری ہنگری شوٹاں مریانی پڈی گلا“ (ہمیں

مربوں کا بعد کا گلہ کور کے انکارے کی طرح جلاتا ہے)۔ یا ”کوش کارینو گلا نہ کار“ (میرا قتل تم پہ جائز ہے مگر مجھ سے گلہ کرنا ناجائز)۔ بات کو بلوچی میں ”ہیز“ یا ”ہوز“ کہتے ہیں۔ اور یہی لفظ قول کے معنی بھی دیتا ہے۔ ”ہوزیں“، یعنی لفظ کی قسم۔

بلوچ ادب کٹھن اور رنگین زندگی کے ہر موڑ کے ہر موسم کی عکاسی کرتا ہے۔ بلوچی ادب راست بازی، راست گفتاری، غیرت و محبت، سخاوت و مہمان نوازی، ہمسایہ کے حقوق کی حفاظت، قول و قرار کی پابندی، عزم و استقلال اور اخلاص عمل کی تعلیم دیتا ہے۔

بلوچ معاشرے میں ادب کا مطلب اب تک صرف ”شاعری“ رہا ہے۔ ادب کی دیگر اصناف میں قصہ گوئی، حال حوال وغیرہ تو غیر محسوس طور پر موجود رہے ہیں۔ مگر بلوچ کا اب تک کا اصل ادب شاعری ہے۔

شاعری کے موضوع یا تو جنگی ہوتے تھے یا بارش اور فطرت والے اور یا پھر عشقیہ۔ یہاں موسیقیت والے اشعار آتے ہیں جس میں لئی لاڑو، ہالو، لولی، ڈی بھی، تاریخی واقعات پر مبنی اشعار، جنگی قصوں، ڈرامہ، طنز و مزاح اور پند و نصیحت کے اشعار ملتے ہیں۔ بلوچی قدیم ادب میں قصیدہ سرائی نہیں ملتی۔ بہت ڈائریکٹ، بہت سچی، رواں اور پر لطف شاعری ہوتی تھی۔

قبائلی نظام والی ہماری شاعری میں غزل وغیرہ نہیں تھے، طویل نظمیں ہوتی تھیں جن میں صرف بحر کا خیال رکھا جاتا تھا۔

بلوچ ادب کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور

سولہویں صدی میں بلوچ بھٹی پال معیشت سے منسلک تھے۔ قبیلوی نظام رائج تھا۔ Shivalery کا دور تھا۔ یہاں شاعری جو ماہ جبینوں کی سیاہ زلفوں کے پیچ و خم میں گم گشتہ اور محبوباؤں کے بدمست کرنے والے حسن میں مست ہو کر شاعر کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلتی تھی۔ وہ آج بھی وادی عشق کے راہ روؤں کے دلوں کو معطر کرتی ہے، آج بھی وہ اسے گنگناتے ہیں۔ محبت اور عشق مجھے معلوم نہیں کہ ہماری اس کتاب کا موضوع ہیں یا نہیں۔ لیکن اس کتاب کو

پڑھنے والا ہر فرد یا تو اس کے کھٹے میٹھے ذائقے کو یاد کر رہا ہوگا، یا پھر زندگی کے اس سبک اندام دور سے گزر رہا ہوگا۔

نیز اس دور کے شعرا ندو لاشار کے درمیان لڑی جانے والی تیس سالہ طویل ترین تاریخی جنگ کی مفصل تاریخ پیش کرتے ہیں۔ جنگ کی ہولناکیاں، انسانوں کا بے دریغ قتل، بہادریوں کے کارنامے، ہزدلوں اور میدان جنگ سے بھگوڑوں پر لعن و طعن، انسانوں کے درمیان نفرتوں اور وحشتوں کے روکنے کھڑے کرنے والے واقعات، جنگ کی پیدا کردہ قحط و بھوک اور پھر جنگ کے نتیجے میں وطن بہ در ہونے والوں کے دلوں میں اپنی سرزمین کی تڑپ کو اس دور کے شعرا نے جس انداز میں پیش کیا وہ آج ہمارے پیش بہا ادبی ورثے ہیں۔ یہ عہد زیادہ تر ڈرامہ کی صنف پر مبنی شاعری کا عہد تھا۔ لگتا ہے کہ ہر شخص اپنی زبانی اپنے کردار کے حصے کی شاعری کر رہا ہو۔ اس قدیم بلوچی شاعری میں شعور کی بلندی، نفسیاتی و داخلی جذبات کا شعور و شناخت، الفاظ اور ضرب الامثال کا لاجواب انتخاب اور سب سے بڑھ کر اس دور کے اقدار اور رواجوں کا مفصل اظہار ایسی باتیں ہیں جو ہم عصر دیگر زبانوں میں آسانی سے نہیں ملتیں۔ الفاظ کی نزاکت اور خوبصورتی، ان کا صاف و ستھرا پن داخلی جذبات کا اظہار اور منظر کشی، اور خیالات کی واضح نقل و حمل کا یہ دور لازماً بلوچی شاعری کا سرچشمہ دور ہے۔

دوسرا دور

بالاج اور جام درک کے اس درخشاں ستارے ہیں۔ بلوچی کلاسیک اس عہد کے بغیر نان بے نمک کی مانند ہے۔

جام درک اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی ہنستی بولتی، چلتی پھرتی زندگی کا گہرا مشاہدہ کرنے اور پھر اسے الفاظ اور موسیقی کے سانچے عطا کرنے والا عظیم فنکار تھا۔ محترمہ سبک کو بھی اس دور میں شامل کیا جانا چاہئے جس کی شاعری میں جام کی طرح رنگ ریزی بدرجہ اتم موجود ہے۔

بالاج کے ہاں پہاڑ بلوچوں کے قلعے ہیں۔ ان کے خزانے یہی کٹھن پہاڑ ہیں، ان کا گزر بسر مزری سے بھرے درے ہیں۔ ان کی سواری ان کی سفید چمپیاں ہیں، ان کا قالین ان کی

سرزمین کا پلو ہے۔ ان کا گدیلا گھاس پھوس اور بیل بوٹے ہیں۔ ان کے بالشت سوکھے ہوئے درختوں کے تنے ہیں۔ ان کے بیٹے بہادر اور جری انسان ہیں۔ ان کے بھتیجے اُن کے تیز خنجر ہیں۔

تیسرا دور

انگریزی تسلط کے دور میں ہمیں اگر ایک طرف مولوی حضور بخش جتوئی اپنے بے پناہ ادبی اور اشاعتی کاموں میں مصروف نظر آتا ہے تو دوسری طرف تو کلی مست، رحم علی، محمد خان گھکھوری، ملا فاضل، ملا بہرام، جوانسال بگٹی اور میر یوسف عزیز گسی، آفاقی شاعری کے آسمان میں محو پرواز دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں مزاحمتی و زرمیہ شاعری اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ طنز و مزاح بھی نہایت اعلیٰ پائے کا موجود ہوتا ہے۔

چوتھا دور

سرمایہ داری عہد کا ادب ہے جو 1917 کے سوویت انقلاب سے لے کر آج تک کے صنعتی، ٹکنالوجیکل اور پوسٹ ٹکنالوجیکل انقلابات کو بھگت رہا ہے۔ یہاں اب شاعری کے ساتھ تیزی سے ابھرتا ہوا نثری ادب بالغ شکل میں سامنے آتا ہے۔

7۔ موسیقی

یہ تو طے بات ہے کہ اپنی مضبوط تہذیبی اقدار کے سبب بلوچ اپنے امیر روایتی ورثہ کو زندہ رکھنے کے قابل رہے ہیں۔ آئیے ذرا اُس موسیقی اور اُس کے آلات کا مختصر تذکرہ کرتے چلیں جس کے بغیر بلوچی شاعری، بلوچی کلچر اور بلوچ کی زندگانی کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

بلوچوں کے سارے سر اور ساز دراصل اس شاعری کے ساتھی ہوتے ہیں جس میں بہادروں کے قصے بیان ہوتے ہیں، حسن و زیبائی کے مجسمے تراشے جاتے ہیں، وفا کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں، جفا کی دل سوز تفصیلیں ہوتی ہیں، نازک رفیقوں کی جلا ڈالنے والی جدائی ہوتی ہے، سو رماؤں کی موت پہ آنسو بہائے جاتے ہیں، مرشد و محبوبہ کی توصیف ہوتی ہے۔ یہ محض گانے کے ساتھی کی حیثیت سے، اور رقص کے لیے آہنگ پیدا کرنے کے لیے نہیں بجائی جاتی بلکہ نفسیاتی بیماریوں کے

علاج کے بطور بھی موسیقی سے کام لیا جاتا ہے۔

بغو

واضح طور پر چرواہے کا ”ساز“ ہے۔ گلے سے خوش الحانی کے ساتھ ”دستانغ“ کی مطابقت میں آواز نکالی جاتی ہے اور ہاتھ کی انگلیوں سے زرخرے کے اوپر سٹرائیک کیا جاتا ہے۔ بیابان ہو، پہاڑ ہو، مویشیوں کی بختی گھنٹیاں ہوں، پہوال کا بغو ہو اور اس کی بازگشت ہو تو سمجھئے آپ بلوچستان میں ہیں۔

شفیلی

ہمارے چرواہے کی بانسری ہوتی ہے۔ مگر بلوچ کی شفیلی بیرونی دنیا کی بانسری سے فرق رکھتی ہے۔ یہ پانی کی عام جھاڑی ”کوندڑ“ (سرکندے) سے چاقوں سے کاٹ تراش کر بنائی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ”سرکاری“ بانسری سے ذرا کم ہوتی ہے۔ اسے نر کی طرح سر کی طرف سے پھونک مار کر بجایا جاتا ہے نہ کہ بانسری کی طرح درمیان کی کسی سوراخ میں پھونک مار کر۔

ڈؤو (Dau)

نر سے باریک و مختصر مگر شفیلی سے لمبا اور موٹا ہوتا ہے۔ اسکی آواز بہت اچھی ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ سری گا بھی سکتا ہے۔ ڈؤو بھی لوگ مقامی طور پر بناتے ہیں۔ یہ دستانغ کا انسٹرومنٹ ہوتا ہے۔

نڈ

یہ شہروں سے خریدا جاتا ہے اس لیے کہ بانس بلوچستان میں نہیں ہوتا۔ یہ بانس کی پتلی کھوکھلی لکڑی ہوتی ہے جس کی لمبائی پونا گز اور قطر آدھ انچ ہوتی ہے۔ نصف لمبائی کے بعد اس میں سوراخ بنے ہوتے ہیں۔ اس کو گلے کی آواز موٹا کر کے بجایا جاتا ہے۔ مگر اُس سے قبل عام بانسری کی طرح دو تین سانسیں چلاتے ہیں تاکہ اپنا منہ، گلا اور نر کی Calibration ہو۔ اسے ”پہو گواٹ“ کہتے ہیں۔ پہو گواٹ بہت ہی میٹھا ہوتا ہے، بہت ہی پسندیدہ، مگر اسے مختصر ہی رکھنا پڑتا

ہے کہ آگے تین چار سو مصرعے جو گانے پڑتے ہیں۔ اور چونکہ ناڑی سری کو چار پانچ سو مصرعے جھگٹنے پڑتے ہیں اس لیے نرسر کی میوزک بہت فاسٹ ہوتی ہے۔

ناڑی درمیان میں بالکل وقفہ نہیں کرتا۔ جب سانس لینا ہوتا ہے تو وہ ایک میوزیکل آواز نکالنے کی آڑ میں سانس لے لیتا ہے۔ سُرّی البتہ ایک آدھ مصرعے جتنا وقفہ اپنی سانس کی درستی کے لیے کر سکتا ہے۔ درمیان درمیان میں وہ دونوں ”آ“ کی آواز مشترک نکال کر اپنے سُرّ ملا لیتے ہیں۔ پورے دستانخ میں ناڑی سری ایک دوسرے کے ساتھ سر ملانے کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔

زندگی بھر گلے پر بہت بوجھ دیے رکھنے کے باوجود گلے کے کینسر کے کیس کم ہوتے ہیں۔ نرسر کا ایک سیشن ڈیڑھ دو گھنٹے کا ہوتا ہے۔ سامعین چنگلیاں بجاسکتے ہیں، ”جی تراباں“ کہہ سکتے ہیں، ایک آدھ موسیقی شناس بوڑھا دونوں میں سے تیز کو کہہ سکتا ہے۔ ”مڑا سنگت کس“۔ بس..... ناڑی سری عام قبائلی لوگ ہوتے ہیں۔ شوقیہ محفل سجاتے ہیں۔ کوئی معاوضہ وغیرہ نہیں لیتے۔ ناڑی سُرّی باہم راز داں اور گہرے دوست ہوتے ہیں۔ محبوباؤں کے مالک۔ ایک دوسرے کے راز داں اور محافظ۔ یہ خود بھی شاعر ہو سکتے ہیں۔

رنگین پوش کے اندر چرب کردہ نر چرواہے کے شوق کی تکمیل کا زبردست وسیلہ ہوتا ہے۔ بس صرف سُرّی کی کمی ہے جو اس کے ساتھ ساتھ گائے۔ اب یا تو کوئی دوسرا چرواہا ملے جسے سُرّ گانا آتا ہو، یا پھر کوئی مہمان مسافر ایسا ملے جو سُرّ گانا جانتا ہو، تو پھر تو جنگل میں منگل ہو جاتا ہے۔ بلوچستان کا پہاڑی وطن، دورہ افتادہ آبادیاں..... یہاں میلہ تو کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ مگر جب ہوتا ہے تو پھر جم کے ہوتا ہے۔

بین (Been)

اسے سندھی میں الغوزہ کہتے ہیں۔ اور بلوچستان کے کچھ علاقوں میں اسے ”دوئی“ کہا جاتا ہے۔ یہ شاید سارے بلوچی سازوں میں سے میٹھا اور شیرین ترین ہوتا ہے۔ باید ہے کہ یہ بچوں اور بڑوں کو سکھایا جائے تاکہ بلوچستان کا یہ زبردست میلوڈی والا ساز بلوچستان کے کوہ و دمن کا زیور

بنار ہے۔ اس پر دستانخ سُرّ کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ اور بغیر سُرّ کے اسے الگ بھی بجایا جاتا ہے۔ دُھن بھی ضروری نہیں کہ دستانخ والے ہوں۔ کچھ ایسی دُھن بھی اس پہ بجائی جاتی ہیں جن کے ساتھ شاعری گائی نہیں جاتی۔ انہیں ”لہرو“ کہتے ہیں۔

شینزار (سیٹی)

یہ تو ہر انسان کے لیے سب سے سستا اور زیادہ بچنے والا ساز ہے۔ اور آلہ موسیقی خود آپ کے اپنے ہونٹ ہوتے ہیں۔ چرواہا تو مزدور ہے۔ اس کی محنت ہی اسے زندہ رکھتی ہے..... اس کے وجود کو بھی، اور اس کے دل اور روح کو بھی۔ محنت انسان کو خود مجبور کرتی ہے کہ اپنی روح اور فن کی ہمیشہ آبیاری کرتا رہے۔ اور اگر چرواہے کی کوئی محبوبہ بھی ہو تو اس کے منہ کو روس اور امریکہ بھی سیٹی بجانے سے نہ روک سکیں۔

دمبیرو (طنبورہ)

یہ عام استعمال ہونے والا میوزیکل انسٹرومنٹ ہے۔ لمبی گردن والا ستار جیسا آلہ ہے۔ یہ مشتمل یہ ساز قدیم ترین ہے۔ اب تو اس کے مخصوص فنکار اور گھرانے بن چکے ہیں۔ یہ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس قدیم انسٹرومنٹ میں سُرّ کی طرح آواز بھاری اور موٹی کر کے گانا نہیں پڑتا۔ مشرقی بلوچستان میں اس کا استعمال بہت ہوتا ہے۔ اب یہ ہر چرواہے کا ساز نہیں رہا بلکہ اب یہ مخصوص اور تربیت یافتہ فنکاروں سے مخصوص ہو چکا ہے۔

سریندا (سروز)

یہ بلوچوں سے مخصوص ساز ہے۔ گو کہ آج یہ کردستان، ایران، افغانستان میں بھی بجایا جاتا ہے۔ نیز پاکستان کے دوسرے علاقوں میں بھی۔ مگر یہ بلوچستان میں بہت مقبول ساز ہے۔ شادیوں، محفلوں کا مقبول سازیوں سمجھے کہ سرور (سریندا) بلوچوں کا قومی ساز ہے۔

میرا خیال تھا کہ سریندا کوئی ہندی سندھی لفظ ہے مگر یہ تو ”سریندہ“ ہے، سُرّ دینے والا۔ چاہیں تو اسے بلوچی کا لفظ کہیں، لیکن اگر علّٰی ماؤں سے ڈر جائیں تو آنکھیں بند کر کے فارسی کا لفظ کہہ دیں، آپ پر کوئی دفعہ نہیں لگے گی۔

یہ قدیم ساز ہے۔ عام استعمال کا لفظ بھی ہے جو بے شمار معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً شور کرنا، بکواس کیے جانا، اعلان کرتے رہنا، جھنجٹ میں ڈالنا، وغیرہ۔

8۔ رقص

رقص کا مجموعی نام ”چاپ“ ہے۔ کچھ لوگ اسے ”دھریس“ بھی کہتے ہیں۔ ساحلی بلوچ کا رقص بالکل ایک نمایاں اور خوبصورت رقص ہوتا ہے۔ اس کا مجموعی نام ”لیوہ“ پڑ گیا ہے۔ حالانکہ رقص کے لیے پورے بلوچستان میں ”لیو“ (Laiv) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ساحل کا رقص تو ڈھل اور سُرنا کے ساتھ ہوتا ہے۔ افریقہ، بلوچ اور جدید طرزوں کو ملا کر اس رقص کی کئی قسمیں بنائی گئی ہیں۔

بلوچی رقص کے میدان میں مکران، ماوند اور نوشکی نے بہت ترقی و تخلیق کی ہے۔ اسے باضاً بطور بنایا گیا، ادارتی شکل دی گئی، ایک سپیشلائزڈ طرز جس نے بلوچ رقص کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ مگر بلوچ کی پہچان تو ”ہمبو“ نامی قدیم رقص ہے۔ بلوچ قبائلی معاشرہ ”ہمبو“ جیسے اس گرم و پر شور و ہم آہنگ طرز کا دلدادہ ہے۔ یہ بالکل افریقی رقص لگتا ہے جس میں رقص کے ساتھ اور اس سے ہم آہنگ منہ سے خوفناک آوازیں نکالی جاتی ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ”ہمبو“ صرف مری گبٹی قبائل میں ہوتا ہے مگر ہمارے خاران کے دوست ضیا شفیق کا کہنا ہے کہ رخشانی علاقے کے کوچیوں میں مردوزن سریندا اور دمیروپہ ”ہمبو“ کرتے ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ وہاں یہ خاموشی سے کھیلا جاتا ہے۔ اسی طرح سمیر بلوچ کا دعویٰ ہے کہ زخرے سے نکالی جانے والی آوازوں کے ماسوا یہ رقص نوشکی میں بھی کیا جاتا ہے۔ یہ بہت تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ اسے بچانے کی سخت ضرورت ہے۔ بے شک رقص کنندگان کو انتہائی تکلیف دہ اور تھکا دینے والی آوازیں نکالنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ مگر اس بہت ہی خوبصورت رقص کو بچانا بہت ضروری ہے۔

سہ تاپ، ہشت چاپ سب کی سب ”چاپ“ کی قسمیں ہیں جو بلوچ قبائلی معاشرے کے خوبصورت اور دیکھنے سے تعلق رکھنے والے ڈانسز ہیں۔

یہ بہت ہی میٹھا اور پُرسوز ساز ہے۔ قدیم بلوچی شاعری میں اس کے لیے ”شاغ“ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ یورپی وائلن جیسا آلہ ہے۔ اس کا بڑا حصہ تو لکڑی کا ہوتا ہے۔ اس میں پانچ تار ہوتے ہیں۔ ان تاروں میں درمیان موٹی تار کو ”زرتار“ کہتے ہیں۔ اس کو بجانے کے لیے دائیں ہاتھ میں ایک کمان کی طرح کی قوسی شکل کی لکڑی ہوتی ہے۔ جس کے دونوں سروں کو عموماً گھوڑی کے دُم کے بالوں سے باہم ملاتے ہیں۔ اسے گج یا گز کہتے ہیں۔ یہ آلہ فنکار لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ آرٹسٹ آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہے، سریندا اپنی گود میں رکھتا ہے اور سامعین کی طرف رخ کر کے اُسے بجاتا ہے۔ مست تو کلی کا بھائی پیرک سریندا بجانے میں ماہر تھا۔ اس کی جواں مرگی پر مست نے اس کے ہاتھ کے ”وش گوانک“ (سریندا) کے لیے حسین ترین شاعری کی۔ ایسا موسیقی بھرا مرثیہ شاید ہی ملے۔

چنگ

یہ بھی بلوچستان کے ہر علاقے میں بجایا جاتا ہے۔ یہ نوجوانوں کی جیب میں سما جانے والا ساز ہے اور قیمت میں بھی ان کی پہنچ میں ہوتا ہے۔

بنجو

بلوچی سازوں میں نسبتاً بہت نیا ہے۔ مگر یہ وسیع پیمانے پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ تقریباً ایک میٹر لمبا ساز ہے۔ اچھی واضح آواز۔ اس میں ٹائپ رائٹر جیسے کی بورڈ ہوتے ہیں۔ بنجو تو آج کے دور میں تاج محمد تاجل کے نام کے ساتھ گویا لازم و ملزوم ہے۔ مری قبیلے میں وڈیرہ سہراب خان سومرانی بہت خوبصورت بنجو بجاتا تھا۔ بہت سے لوگ بالخصوص میوزیکل گروپس اس کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں۔

ڈھل

بھاری بھر کم ڈرم ہے جس کے دونوں سرے چڑے سے ڈھکے ہیں۔ یہ عموماً سُرنا کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔

سُرنا

کہانی گری انگاروں میں

میں باہر

میوے پک گئے ہیں

ہم نے میورنامی میوہ کھایا

کل صبح سرخ پوش قافلہ گزرے گا

تمہیں دکھاؤں گا

ہماری ابتدائی لوک کہانیوں میں ہمیں زرتشتی عہد سے لے کر بدھ ازم تک جیسا زمانہ ملتا ہے۔ جہاں بس فطرت ہے اور انسان ہیں۔ فطرت کی مہربانیاں ہیں اور انسان ہے۔ اور فطرت کی قہرمانیاں ہیں اور انسان ہیں۔ راکھشس ہیں، انسانی جنگ و استقلال کے مظاہر ہیں۔ ان کہانیوں میں دکھایا گیا ہے کہ فطرت کی ہر شیطانی موت سے نکلنے کے بعد انسان ہی کامیاب و سرخرو ہوتا ہے۔ انسانی آبادیوں سے ہزاروں میل دور عبادت میں مصروف فقیر ہیں، جوگی ہیں، بھائی چارہ ہے، باہمی مدد و امداد ہے اور ایک غیر طبقاتی معاشرہ قائم ہے، جہاں نیکی ہی نیکی ہے۔

بعد ازاں جب بلوچ بادشاہی نظاموں کے ساتھ رابطے میں آئے تو پھر یہ لوک کہانیاں اُس عہد کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ بھٹی، بادشاہ صرف مغل درباروں میں ظلِ الہی نہیں ہوا کرتا تھا، وہ تو اپنا نظریاتی عکس قدیم بلوچی ادب میں بھی ڈالتا رہا۔

”پیشہ بادشاہ ہے۔ بادشاہ خدائے جنیدیں کہ آزماں گوں بے تو نزیں آ دشتی، ہر کس وٹی زمیں ٹوٹا بادشاہیا کنگیں.....“

بلاشبہ بادشاہ کے باغی بھی ہوتے ہیں، جو اسے لاکارتے ہیں، اس کی حکمرانی کو چیلنج کرتے ہیں مگر بلوچ کہانی کا اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ بادشاہ کا زیادہ ہمدرد رہتا ہے اور بادشاہ اُس کا بلجا و مادی۔ بادشاہ واقعتاً باپ کی طرح کا طرزِ عمل رکھتا ہے اور رعیت کو واقعی اولاد گردانتا ہے۔ لہذا وہی اس کا ہیرو رہتا ہے۔ وہ جو باغی ہوتا ہے اس کے پاس کوئی عوامی پروگرام نہیں ہوتا۔ بس ایسے ہی

9۔ لوک کہانی

بلوچی ادب کا ابتدائی ارتقا شاید خوبصورت انداز میں ہماری لوک کہانیوں میں موجود ہے۔ بلوچی فوک کہانیاں اپنی لطافت، تغزل اور بُت میں ادب کا حسین ترین حصہ ہیں۔ بلوچوں کی کہانیاں بہت شہرت رکھتی ہیں جو قصہ گوؤں کی طرف سے انتہائی مہارت کے ساتھ سنائی جاتی ہیں۔

بوڑھی عورتیں یا مرد، بچوں کو رات کو سوتے وقت کہانی سناتے ہیں۔ لمبی زمستانی راتیں بھلا بغیر کہانی سنائے گزرتی ہیں! لہذا بلوچ کے ہاں کہانی شاعری جتنی ہی قدیم ہے۔ اور دونوں نے ساتھ ساتھ چل کر الگ صنفوں کی صورت اختیار کر لی۔ حالانکہ دونوں بنیاد میں ایک ہی تھے۔ شاعری میں کہانی بیان ہوتی تھی اور کہانی کو شاعری میں بیان کیا جاتا تھا۔

انسانوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہوتے رہنے اور دوسرے انسانی گروہوں سے ثقافتی لین دین نے کہانی کو بھی بہت امیر بنادیا۔

مشغول رکھنے کی اس صنف میں دیومالائی باتیں بھی تھیں اور ہماری زمین پہ موجود مادی حقیقتیں بھی۔ مگر ایک بات عیاں ہے کہ کہانی کا ایک اخلاقی سبق ضرور نکلتا تھا۔ بلوچ کہانی ہمیشہ سے میوزیکل رہی ہے۔ اس کا ابتدائی باقاعدہ شعر نما ہوتا تھا۔ درمیان درمیان میں بھی کبھی اصل اور کبھی مجہول فقرے بار بار استعمال کر کے اسے دلچسپ بنایا جاتا تھا اور اس کا خاتمہ بھی بہت خوبصورت الفاظ میں ہوتا تھا:

قصہ میں جہرا
میں پڑھ درہ درہ
پیکر درڈ بر
ماواڑتہ میور
بانگہا سرگندی ایس لڈے گزی
تسرا ڈسنانسی

باغی ہوتا ہے۔ سوچ میں نابالغ، نا تجربہ کار..... پھر یا تو شکست کھا کر وہ بادشاہ کا مطیع ہو جاتا ہے یا کامیابی کی صورت میں خود ظلِ الہی بن جاتا ہے۔ اُس دور کے کہانی ساز کو اور کوئی متبادل میسر ہی نہیں تھا۔ بادشاہت ہی طرزِ سلطنت ہوتی تھی۔ وہ اور کچھ نہ دیکھتا تھا، نہ سوچ سکتا تھا۔

البتہ ہماری لوک کہانیوں میں نیچر کے خلاف انسان کی جدوجہد بھی موجود ہے۔ بادشاہ اپنی اُرد کے ساتھ جنگل جاتا ہے اور اس سارے سفر میں نیچر اور انسان کی لڑائی موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح لکڑ ہارا اپنے حوالے سے نئے نئے اوزار اور وسائل کے ساتھ نیچر پر فتح مند ہوتا جاتا ہے۔ کسان کا شکاری کی نئی نئی اقسام اور آلات وضع کرتا رہتا تھا اور ہر لحاظ سے فطرت کو اپنا مطیع بناتا جاتا ہے۔ چرواہا جنگلی حیوانات کو پالتو بناتا جاتا ہے، اور درندہ (کتا) کو چوکیدار۔ وہ اپنے دشمنوں (بھیڑیوں، گیدڑوں، لومڑیوں، گوحوں) کے خلاف نئی نئی ٹیکنالوجی سے مسلح ہوتا رہتا ہے۔ وہ گھاس، اس کی اقسام اور چراگا ہوں کی موجودگی کے علوم حاصل کرتا جاتا ہے۔

اس دور کا کہانی کار درندوں، پرندوں، درختوں اور پتھروں کو بھی اپنی کہانی کا کردار بناتا ہے، ان سے باتیں کرواتا ہے، اُن سے انسان کی طرفداری یا دشمنی کرواتا ہے، انہیں آپس میں محبت یا عداوت میں دکھاتا ہے۔

بعد کی لوک کہانیوں میں وطن، آزادی، قبضہ گری، حب الوطنی کی باتیں نظر آتی ہیں۔ گو کہ ابھی تک وطن بادشاہ کا ہی ہے مگر کہانی کار اپنی اور اپنے عوام کی شناخت بھی کچھ کچھ اپنی سرزمین سے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ادھر ہی ہمیں غلام اور لونڈی کا ذکر بھی ملتا ہے اور اُن کی حالتِ زار کا تذکرہ بھی۔ مدھم، دھندلا.....

10۔ حالِ حوال

خانہ بدوش اور مالدار کی سخت ماحول میں، وسیع طور پر دُور دُور بکھرے ہوئے بلوچ اپنی بقا کے لیے کیوئی کیشن کے ایک نیٹ ورک پر انحصار کرتے ہیں۔ بلوچ عوام عمومی طور پر سیاسی فیصلوں کی بہ نسبت چراگا ہوں، پانی کی جگہوں، اور دوسرے لوگوں اور کیمپوں کی نقل و حرکت کے

بارے میں اطلاعات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اطلاعات کے اس نیٹ ورک کو ”حالِ حوال“ کہتے ہیں۔

حالِ حوال کا تبادلہ انسان کی ایک عالمگیر عادت ہے۔ انسان اپنی دلچسپی کے امور کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے۔ حیوان اور انسان کی سرحدوں کو واضح کرنے کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھنے والی چیزوں میں سے ایک ”حالِ حوال“ ہے۔ اگر حالِ حوال اور اطلاعات کا تبادلہ نہ ہو تو ترقی یافتہ ساری انسانیت لگڑ بھگڑوں کی ٹولیوں میں بدل جائے۔

بلوچ کا حالِ حوال اس کی اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔ بلوچ کو نہ تو حالِ احوال کی ایجاد کے زمانے میں کسی خلائی جہاز میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، نہ اُسے اس زمانے میں بنڈوگ کانفرنس کی شرائط یاد رکھنی تھیں اور نہ ہی ریسرچ کی دنیا میں پیش رفتوں کا جائزہ لینا تھا۔ اس نے تو مسافر اور راہی سے یہ معلوم کرنا ہوتا تھا کہ وہ کس سے ملا، اُس کا سفر کیسے کٹا، مویشی کا نرخ اور ریٹ کیا چل رہا ہے، غلہ کس بھاؤ میں مل رہا ہے، فصل کی حالت کیسی ہے، گڑ اور پتی کی قیمت کیا ہے، سردار اور سرکار کی سیاست و سیاحت کی کیا خبر ہے، بیمار یوں کی آمد و رفت، ”بھائی بندی“ کے جھگڑے جھیلے، ”پچازادوں“ کے آپسی قتل و قاتل، ”ہم قوموں“ والی سیاسی سیاہ کاری کی چال و رفتار..... یہ تھیں بلوچ کی ”دوراندیش“ آنکھوں کی منزل و بصیرت۔ البتہ ان سب باتوں سے ضروری بات تھی بادل برسات کی، چراگاہ و گھاس کی۔ وہ آج بھی باقی ہر حال و خبر کو بے کار سمجھ سکتے ہیں مگر مال اور مالدار کے بارے میں کسی بات کو چھوٹی بات نہیں گن سکتے۔ مالدار کی اس کی ضرورت اور اس کی زندگی ہے۔ اس کے بارے میں ہر بات کو وہ دل کے کانوں سے سنتا ہے، اس انداز میں کہ اس کا منہ کھلا ہوا ہوتا ہے، آنکھیں حالِ سنانے والے پرکھی ہوتی ہیں اور وہ مکمل طور پر ”ہمہ تن گوش“ اور بت کی طرح ساکن ہو جاتا ہے۔

حالِ حوال لازم ہے کہ خود بلوچ کی طرح سچ ہو، اُس کی گندھی ہوئی خوبصورت داڑھی کی طرح حسین ہو، اس کی روح کی طرح سادہ اور اس کے دل کی طرح صاف ہو۔ تازہ ترین خبر کا پھیلانا حالِ حوال کا اصل مطلب ہوتا ہے۔ اس رواج کی پیروی کرنا ہر ”شلوار پہننے کی عمر کے مرد“ پر

فرض ہوتا ہے۔ نہ تو حال طلب کرنا کوئی شرم کی بات ہے اور نہ حال نشر کرنا کوئی احسان یا بوجھ ہے۔ حال ایک امانت ہے جسے آگے ہی پاس کرتے رہنا چاہیے۔ اور یہ ٹریفک ایک طرف نہیں ہوتا۔ یہ ایک قسم کا تبادلہ ہے اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان انفارمیشن سبک رفتاری سے پھیل جاتی ہے۔ گو کہ حال حوال کی سرحدیں اور رقبہ بہت محدود ہوتا ہے مگر پھر بھی لوگ اس کی وجہ سے تازہ ترین تبدیلیوں سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ اور انفرادی طور پر یا مل کر React کرتے ہیں۔

بلوچ اپنی ضرورتوں کی خبریں سننے اور انہیں ایکسچینج کرنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ یعنی حال حوال کی خاطر اسے ایک نا دیدہ اور بھوک قوم کہا جاسکتا ہے۔ یہ بھوک قرونوں سے اس کے اندر موجود ہے۔ اس کے دل کی رگ رگ پیاسی ہے حال حوال کے لیے، یہ پیاس اس کے جینز کے اندر جذب ہے۔ اصل میں یہی بھوک ہے جو بلوچوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کسی راغبیر کو ”بے حال“ نہیں چھوڑتے۔ ہر سلام کہنے والے شخص کا حال لینا لازمی ہے ورنہ سخت بے رواجی ہو جائے گی۔ سلام کہنے والے شخص کے تئیں اس کا حال طلب نہ کرنا گویا اُس کو کمتر درجے کا شخص قرار دینا ہوتا ہے۔ جس کے بڑے تباہ کن نتائج نکلتے ہیں۔ لہذا سارا بلوچ اس کا پابند ہے۔

خیر خیریت پوچھنے کی ترتیب بھی بالکل میوزیکل انداز میں وضع کی ہوتی ہے۔ خاص کر اگر لوگ زیادہ ہوں تو ایک ہی آواز میں یوں بولتے ہیں جیسے ساون کے بادل گرے ہوں۔ بلوچ کا خیریت پوچھنا بھی دبدبہ اور بڑے پن سے بھرا ہوا ہوتا ہے، کسی دوسرے سماج میں تحکم اور فوجی کاشن جیسا خیریت پوچھنے کا انداز شاید ہی ہو۔

کچھ وقفے کے بعد میزبان اس سے پیاس کے بارے میں لازمی طور پر پوچھتا ہے۔ اور پانی پلانے کے بعد اس سے حال مانگتا ہے۔ پھر وہ اپنی خبریں شروع کرتا ہے۔

سلام اور خیر خیریت پوچھنے کا سلسلہ ایک قاعدے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً سوار شخص پہل کر کے پیادہ کو سلام کہتا ہے، بلندی کی طرف سے اترائی کی طرف آنے والا شخص، آنے والا شخص بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کہتا ہے۔ بلوچوں میں سلام کہنے کے لیے کمسنی اور بزرگ سنی کی اہمیت نہیں ہے۔ عورت کو کوئی بھی سلام نہیں کہتا۔ سلام کہنا اگر رواجاً لازم ہوتے ہوئے بھی نہ کہا

جائے تو احتجاج کا حق حاصل ہے حقدار کو۔ اور احتجاج کی حد اور سرحد اور انداز و شمار بلوچ وطن میں متعین نہیں ہے۔

سلام کہنے والے شخص کا حال لینا ہر حال میں ضروری ہے، خواہ آپ کو حال اور خبر کی ضرورت ہو یا نہ ہو، یا حال سنانے والے شخص کا موڈ ہو یا نہ ہو، رواج تو بہر صورت پورا کرنا ہی ہے۔ گھٹے دو گھٹے کے لیے بھی باہر گئے تو واپسی پر خبروں کا بلیٹن ضرور ہوگا۔ اس رواج کو اس قدر دلائل کے زور سے مضبوط بنایا جاتا ہوتا ہے، اس قدر قصے بنانا کر بلوچ رواجوں کو مستحکم کیا گیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک قصہ یہ ہے کہ ایک شخص محفل میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے باہر چلا گیا پیشاب کرنے۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو محفل کو سلام کہا۔ اب دس پندرہ منٹ کے فراق کا کیا حال حوال؟ لہذا لوگوں نے اس سے حال نہیں لیا۔ اس شخص نے احتجاج کیا کہ میرا حال کیوں نہیں لیتے؟ محفل کے لوگوں نے کہا کہ ”بھائی ابھی ابھی تو یہاں سے گئے ہو، کیا حال لیں؟ تمہارے پاس کونسا دہلی کا کوئی حال ہے؟“ بہر صورت اس کا حال لیا گیا۔ اس نے حال میں بتایا کہ ”میں پیشاب کرنے گیا تو کھڈے میں ایک لاش پڑی دیکھی“۔ کم آبادی والے بلوچستان میں لاش بہت بڑی خبر ہوتی ہے۔ لہذا یہ مثال صدیوں سے ایک ڈھال بن گئی حال حوال والے رواج کے لیے۔ اگر کوئی حال نہ لے تو فوراً اس قصے کو دہرایا جاتا ہے۔

ایک، دو یا تین مسافر یا راغبیر کئی اطراف سے بہ یک وقت آجائیں تو ”پہلے آؤ، پہلے پاؤ“ کے اصول پر باری آنے پر حال حوال دیتے جاتے ہیں۔ میزبان بغیر کسی رکاوٹ کے ہر ایک کو Deal کرتا رہتا ہے۔ البتہ جواب میں میزبان کا حال تو ظاہر ہے کہ ایک ہی شخص نے لینا ہوگا۔ رواج یہ ہے کہ حال لینا آخری شخص کا ”حق“ بن جاتا ہے۔ اگر وہ خود خدائی خدمتگار بن کر کسی اور کو اپنا حق عطا کر دے تو الگ بات ہے، ورنہ سارے لوگوں سے اجازت لیتا ہے اور جوابی حال میزبان سے وصول کر کے ”رسید لکھی“۔ اب جس وقت یہ بہت ہی فارل فریضہ پورا ہو جائے تبھی دونوں فریق ذرا سا Relax ہو جاتے ہیں۔ گردن کی پھولی ہوئی رگیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہیں، چہرے کا سرخ ہونا کم ہونے لگتا ہے۔ چلم پینا جاتا ہے۔ ”آسمان واپس اوپر چلا جاتا ہے اور

زمین واپس نیچے آتی ہے۔“ ہنگامی حالت ختم ہو جاتی ہے۔ حال حوال کا ختم ہونا سمجھو کہ جنگ میں ذاتی بہادری دکھانے کا مرحلہ ہوتا ہے اور خیر خیریت سے جب یہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے تو ظاہر کہ آدمی فتح کے احساس میں شکر اور چین کا سانس لیتا ہے، اس لیے کہ بہت دفعہ کئی لوگ بڑے مجموعوں کے اندر بالکل بند ہو جاتے ہیں۔ وہ حال کہنا شروع تو کرتے ہیں۔ مگر پھر اچانک ان کی بولتی بند ہو جاتی ہے اور وہ ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتے۔ بہت سے سفید ریش افراد، باتونی، گپ شنپی، محفل و دیوان کے لوگوں کا منہ اس طرح بند ہو جاتا ہے جیسے مری میں میٹھکانی کے جادو سے دشمن کی بند و قیں چلنا بند ہو جائیں۔

فرض کرو کہ الف نے ب کو اپنا حال دیا۔ مگر ب سے حال لینا بھول گیا، تو صاحب اسے رواجاً ایک دنبہ جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ یا پھر صدق دل کے ساتھ بلند آوازی سے ایک غیر مستحسن آواز، غیر مستحسن جگہ سے نکالنی ہوگی۔ تاکہ ساری دنیا کو خبر ہو جائے۔ (بلوچ کے استحقاق کے مجروح ہونے کی اتنی بڑی سزا!)۔

بلوچ کا حال شروع سے لے کر آخر تک اللہ کی بزرگی، نعمتوں پہ شکر، خیر کی دعا کے کلمات اور جی و جان سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ بلوچ بہت ہی خوبصورتی اور ترتیب کے ساتھ الفاظ کو پروتے جاتے ہیں۔ مثلاً ”جی خدا کو جس نے نبی پیدا کیا“ وغیرہ۔ خیر کا ورد سمجھ میں آ جاتا ہے کہ جنگ بلوچ کی سب سے بڑی دشمن ہے، اور اُس کی Antidote ہے خیر۔ اس لیے بلوچ کے حال حوال سے اگر لفظ ”خیر“ نکال دیں تو گویا پھر کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ بلوچ جس قدر بھی خیر اور امن مانگے، خیر اور امن اسی قدر دور بھاگتے جاتے ہیں۔ بلوچ کہتا ہے ”روٹی، روٹی نایاب ہوتی جاتی ہے۔ بلوچ کہتا ہے، ”سکھ“، ”سکھ قریب نہیں پھٹکتا۔“ مثلاً منظور ہوں ہماری دعائیں اور ہم پہ امن کی نہ تھمنے والی بارش دائمی طور پر ہم جھم کرتی رہے۔

یہ حال حوال ”خیر“ کے الفاظ سے شروع ہو کر خیر ہی کے کلمات پر ختم ہوتا ہے۔ جہاں Passive نہیں بلکہ جوش اور جاندار انداز میں دونوں فریق حال حوال کو اختتام بخشنے ہیں۔ حال دینے والا آخر میں کہتا ہے:

”اور خیر ہے۔“

حال لینے (سننے والا) لمبی تان میں جواب دیتا ہے:

”خیر ہو جائے، کہ اچھا میوہ بھی خیر کا ہوتا ہے“

(اس بلوچ جملے کا نعم البدل تو لا کر دکھاؤ!)

ہمارے حال حوال کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ گھنٹہ بھر لمبے حال حوال کو شروع کرتے وقت بلوچ کہتا ہے، ”میں نے خبر کوئی سنی نہیں“ یا ”میں کسی سے ملا نہیں“۔ مطلب تو یہ ہے کہ میرے پاس کوئی حال سنانے کو نہیں ہے مگر پھر بھی وہ پورے ایک گھنٹے تک تازہ اور ضرورت کی خبریں براڈ کاسٹ کرتا جاتا ہے۔ اور وقفے وقفے میں کہتا جاتا ہے کہ، ”میں نے کوئی خبر نہیں سنی“۔

بڑے بڑے مجموعوں، محفلوں، دیوانوں میں حال لینا کسی بھی فرد کے لیے اعزاز اور سٹیٹس کی بات ہے، اور حال دینا ایک ناموس کی بات ہے۔ ایسی جگہوں پر ہر عام و خاص آدمی نہ تو حال دے سکتا ہے اور نہ لے سکتا ہے۔ ایسی جگہوں پر حال حوال کرنے والا شخص حکمران خاندان کا فرد ہوتا ہے۔ گو کہ ہر چرواہا حال حوال کا ماہر ہوتا ہے مگر قبائلی بیوروکریسی کی موجودگی میں وہ اس وقت صرف ”جی آپ“ کہے گا جب ”بڑا“ اسے کہتا ہے کہ ”تمہیں بھی حال حوال کرنے کی پیشکش کی جاتی ہے۔“

بہر حال بلوچ عوام دور دراز آباد ہیں، ملکی، علاقائی اور بیرونی دنیا کے حالات سے باخبر ہونے کا کوئی وسیلہ نہیں۔ نہ چھٹی، نہ ٹپال، نہ ڈاک نہ تار، نہ انسٹافون و موبائل اور نہ ٹی وی۔ لہذا عوام نے اپنا متبادل راستہ بنا دیا جس کا نام انہوں نے حال حوال رکھا۔ اس کے بیٹن دن میں بہت بار بہت سے سیشنوں سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اور میرٹھا خان مری نے برحق طور پر اس رسم کو ”کثیرالورد“ کہا۔ (5)

11- گالی

گالی تو چرواہے کی روزمرہ کی ایجاد ہے۔ اور اس میں سیشٹلیٹی میں بکری استاد ہوتی ہے۔

بھیڑ چونکہ شریف جانور ہے اس لیے اسے زیادہ تنگ نہیں کرتی، اس لیے چرواہا اس کی بہت عزت کرتا ہے۔ مگر بکری چونکہ بہت بے آرام جانور ہوتی ہے اس لیے مقدر میں زیادہ اور اخلاق میں گندی سے گندی گالی اسی کو پکڑتی ہے۔

12- نظام انصاف

پیراڈو

جرائم کی دنیا کے ساتھ بلوچ اپنے دیسی طریقوں سے نمٹتا ہے۔ ان میں سے ایک بہت بڑا طریقہ ”زندہ جنگ“ ہے، یعنی قدموں کا کھوج لگانا۔ اس کے ماہر ہوتے ہیں جو کبھی موروثی ہوتے ہیں کبھی ماہر۔ یہ لوگ مطلوبہ گھوڑے، اونٹ، درندے وغیرہ سے لے کر آدمی (چور ہو یا قاتل) کے پاؤں کے نشان کو شناخت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کی چال، اور رفتار سے اُس کا قبیلہ، ذیلی قبیلہ، خاندان تک بتاتے بتاتے خود اُس مجرم کا نام بتا دیتے ہیں۔

آسہ جنگ

منصف کو بلوچی میں شراب کہتے ہیں۔ سرمایہ دار نہ پاکستانی عدالتی نظام کے برعکس قبائلی نظام میں سوائے سردار کے، منصف اوپر سے نازل نہیں ہوتا۔ بلکہ منصف وہی شخص ہوتا ہے جسے دونوں فریق باہمی رضامندی سے منتخب کریں، جس پر دونوں فریقوں کو اعتماد ہو۔ اور وہ جسے فیصلے کا اختیار دیتے ہیں۔

وہ فریقین کا بیان باری باری سنتا ہے۔ فریقین پابند ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بیان میں مداخلت نہ کریں بلکہ تحمل سے دوسرے کے دلائل سنیں اور اپنی باری پر اپنا بیان جس قدر چاہیں تفصیل سے بیان کریں۔ شراب اگر ضروری سمجھے کہ اسے مزید انفارمیشن کی ضرورت ہے تو وہ فیصلہ ملتوی کر کے گواہ وغیرہ سے اپنی تفتیش کر لیتا ہے۔ وگرنہ اگر مقدمہ سیدھا سادہ ہو تو وہ وہیں فیصلہ سنا دیتا ہے۔ ”فلانے! تم ملامت ہو“ اور سزا بھی وہیں بیٹھے بیٹھے سنا دیتا ہے۔ جو عموماً جرمانے کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ جہاں دیدہ اور غیر جانبدار منصف اپنی مرضی سے ”یہ منجور، یہ نامنور“ نہیں

کہتا۔ وہ پابند ہے کہ آئین وقانون (رواج) کے مطابق فیصلہ دے۔ اس لیے کہ فیصلہ تو فوراً بعد عوامی ملکیت بن جاتا ہے۔ منصف کا وقار، نام، اور شہرت داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ اس فیصلے کی اپیل سردار کے پاس ہی ہو سکتی ہے۔

جو بات بلوچ میں خصوصی تکریم و ستائش کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کسی سے کہہ دو کہ میرا تم سے فلاں بات پر تنازعہ ہے اور مجھے ”شراب“ (منصف) کے پاس پلو، شرا، یا انصاف دے دو، تو وہ انکار کبھی نہیں کرے گا بلکہ اپنے دلائل اور سچائی کے ذریعے اپنی بے گناہی ثابت کرے گا۔ ضرب المثل ہے کہ ”جو آدمی شرا سے انکار کرے، وہ شرا (انصاف) کا بیٹا ہی نہیں“۔ اور یہ بڑی گالی تصور ہوتی ہے۔

تمام قدیم معاشروں میں متنازعہ معاملات کا فطرت کے مظاہر کی مدد سے فیصلہ ہونے کی روایتیں موجود ہیں۔ اور اُن میں آگ اور پانی سب سے اہم ہیں۔ یہ دونوں بہت سے علاقوں کے خدا، یا، دیوتا رہے ہیں۔ لوگ سیکڑوں برسوں تک اُن کی پرستش کرتے رہے ہیں۔

انہی طاقتور اور کارآمد مظاہر سے لوگ جھگڑوں کی صورت میں قسم کھانے، قسم دلانے، یا پھر منصف کے بطور کام لیتے چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً قدیم فیوڈل یورپ میں، بلوچوں کی طرح ملزم اپنی صفائی آگ اور پانی سے گزر کر کرتا تھا۔ ہمارے کچھ قبائل میں تو ”آس آف“ کی عدالت باقاعدہ ایک ادارہ ہے۔ قتل سے لے کر معمولی چوری تک ملزم اپنی صفائی آگ میں ”نہ“ جل کر گزرنے یا پانی میں ”نہ“ ڈوب کر ہی ثابت کر سکتا ہے۔ آگ اور پانی بہت مقدس تصور ہوتے ہیں۔ آتش پرستی ہمارے جینز میں جو شامل ہے۔ کیسے؟!

یوں ہے کہ اگر آپ شاہنامہ دیکھیں تو وہاں آگ میں ڈالنے کا عہد، کیکاؤس کا بتایا گیا ہے۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ سینا کو چودہ سال تک راونڑا خوا کر کے رکھ لیتا ہے۔ جب وہ آزاد ہو کر اپنے شوہر رام کے پاس واپس آ جاتی ہے تو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسے راونڑا نے نہیں چھوا، اُسے آگ پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ واقعہ رامائٹ کی سب سے مقبول کہانیوں میں سے ایک ہے۔ جس نے پورے ایشیا کی Mythology کو متاثر کیا۔ پھر، شاہ لطیف کے ”شاہ جو رسالو“ میں

بچوں کی محبوبہ سسی کو بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے آگ پر سے چلنا پڑتا ہے۔ وہ عمر ماری کی داستان میں بھی اس ”آس“ کا ذکر کرتا ہے جہاں ماری کو اپنی پاکیزگی اور عصمت ثابت کرنے کے لیے ایک امتحان سے گزرنا پڑا۔ وہاں آگ سلگائی گئی اور اس میں لوہے کی سیخ کو گرم کیا گیا اور جب وہ گرم ہو کر سرخ ہو گئی اور بجلی کی طرح چمکنے لگی تب ماری کو اُسے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر انگاروں پر ننگے پاؤں چل کر دکھانا پڑا۔ فیوڈل یورپ میں اہلئے ہوئے پانی میں ڈالے ہوئے لوہے کے ایک ٹکڑے کو انگلیوں سے باہر نکالنا پڑتا تھا۔ یا اپنی زبان پر آگ سے سرخ کی ہوئی سرخ سلاخ رکھنی پڑتی تھی۔

بلوچ سماج میں، رواج کے بطور صرف گئی قبیلے میں ملزم کو ننگے پیر جلتی آگ میں گھس کر اس پر چلنا پڑتا ہے۔ باقی قبائل میں یہ مرض موجود نہیں ہے۔ بگٹی میں بھی یہ پہلے عام نہ تھا، مگر شہید نواب اکبر خان گئی نے اس کی اچھی خاصی حوصلہ افزائی کی۔ اور اسے میڈیا وغیرہ میں دکھا دکھا کر اسے مشہور کر دیا۔ چونکہ یہ رواج گئی قبیلہ سے باہر موجود نہیں ہے، اس لیے معلومات لینے میں بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس خاص رسم کے لیے تقریباً ایک دس گز لمبا نالہ کھودا جاتا ہے اور اسے جلتے ہوئے انگاروں سے بھر دیا جاتا ہے۔ یہ نالا انگاروں سے اس قدر پیک ہوتا ہے کہ پاؤں ٹخنہ تک انگاروں میں دھنس جاتے ہیں۔ نالے کے دونوں سروں پر ایک چپٹا پتھر رکھا جاتا ہے۔ اک نامی پودے کے پتے انگاروں پر پھینک دیے جاتے ہیں..... ملا تین بار آگ کے چاروں طرف طواف کرتا ہے اور ”پیر“ نامی پودے کے سات پتے اس کے اندر یہ ورد کرتے ہوئے پھینکتا جاتا ہے کہ، ”جس طرح یہ پتے جلتے ہیں، ملزم اگر مجرم ہے تو اس کے پاؤں بھی اسی طرح جلیں“۔ پھر دو دنبے ذبح کیے جاتے ہیں اور جو نبی ذبح کیے جانے والے دنبوں کا خون بنے لگتا ہے، ملزم آگ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر ملزم جلنے اور ritual کو درمیان میں ختم کرنے پہ مجبور نہ ہو تو اس کے پیر دیکھے جاتے ہیں اور وقفہ وقفہ سے اس کے پیروں کے تلووں پر خون یا پانی پھیکا جاتا ہے تاکہ اگر اس کے پاؤں پر معمولی سا چھالا بھی بنا ہو تو وہ واضح نظر آ سکے۔

یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ پارس اور سنسکرت رواجوں سے آئی ہوئی یہ منحوس رسم اپنی

پیدائش کی جگہوں میں تو مرگئی مگر ہم میں یہ وحشت زندہ رہی۔ اس بات میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ ”آس“ سے فیوڈل کی اتھارٹی بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات بھی تاریخی اہمیت والی ہے کہ آج تک کسی بلوچ سرسرا یا دیرہ کے خاندان کے کسی بھی فرد کو آگ پر نہیں چلایا گیا۔ یہ ہمیشہ غریب لوگ ہیں جو آگ کا بوجھ اپنے ننگے پیروں تلے ڈھوتے رہتے ہیں۔

کولمبو میں تعیناتی کے زمانے میں پہلو نرودا نے یہ عمل خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نرودا نے اسے یوں لکھا..... ”1929 کی ایک رات..... میں ہجوم کو اکٹھا ہوتے دیکھتا ہوں۔ یہ مسلمانوں کی چھٹی کا دن ہے۔ وہ گلی کے وسط میں جمع ہو گئے ہیں۔ وہاں ایک گڑھے میں کوئلے دہک رہے ہیں۔ ذرا نزدیک ہوتا ہوں۔ راکھ کی پتلی تہہ کے نیچے جلتے انگاروں کی حدت سے میرا چہرہ تہمتا ہے۔ اچانک حیران کر دینے والا ایک شخص نمودار ہوتا ہے۔ سرخ اور سفید رنگ ملے وہ چار لوگوں کے کندھوں پر سوار سرخ لباس میں ملبوس ہے۔ اور وہ جیسے عالم نما میں اللہ اللہ چیختا ہوا جلتے ہوئے کوئلوں پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔

”سارا مجمع اس منظر میں گم ہے۔ جادوگر کوئی نقصان اٹھائے بغیر جلتے کوئلوں پر سے گزر گیا۔ تب ایک اور آدمی ہجوم کو چیر کر آتا ہے اور اپنے چپل اتار کر اسی طرح ننگے پیروں دیکھتے انگاروں پر چلتا ہے۔ اسی طرح رضا کارانہ طور پر لوگ آگے آتے ہیں اور جلتے انگاروں پر چلتے رہتے ہیں۔ کچھ آگ کے وسط میں رک کر اللہ اللہ کا ورد کرتے ہیں اور روٹے کھڑے کر دینے کی حد تک چیختے ہوئے اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف کرتے ہیں“۔ (6)

708 ق۔ م کے قریب مغربی ایران میں ماد حکومت قائم ہوئی۔ اس کا پایہ تخت موجودہ ہمدان تھا۔ اُس زمانے میں کرد بلوچ ”آہورا“ کی پرستش کرتے تھے۔ ”ہور“ کا مطلب ہے، آگ اور ”آ“ کا مطلب ہے: آیا..... ”وہ حقیقت جو آگ سے دائی ہے“۔ جب بلوچوں نے توران اور کرمان میں سکونت اختیار کی تو انہوں نے اپنے مذہب کو رواج دیا۔ توران کی بت پرستی متروک ہو گئی۔ کرد بلوچ دن میں تین بار آگ کی پرستش کرتے تھے۔ وہ اپنی عبادت گاہ کو ”آرینم“ کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے آتش کدہ۔ آتش کدہ کے معبد کو آری وان کہتے ہیں۔ شہروں اور

دیہاتوں میں آتش کدہ ہوا کرتے تھے۔ بلوچ کردوں کے حکمرانوں نے دو بڑی عبادت گاہیں کیکان (موجودہ نال) اور خضدار میں ”آرین زوراک“ اور ”آرین حلوان“ کے نام سے تعمیر کی تھیں۔ جو کدہ زوراک اور کدہ حلوان کی چوٹیوں پر بنائی گئی تھیں۔

بلوچ آج بھی آگ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہمارے محاوروں اور ضرب الامثال میں آج بھی آگ کی طرف پیر کرنے، آگ کی طرف تھوکنے، آگ کی طرف ہاتھ کے پنچے سے لعنت بھیجنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ ہمارا بچہ بھی غیر ارادی طور پر آگ کی تکریم کرتا ہے۔ موجودہ دور کے ناکام شدہ عدالتی نظام کے ہاتھوں ”آگ“ کو ایک غیر ضروری مقام یہ مل رہا ہے کہ وہ ہمارا چیف جسٹس بھی بن بیٹھی ہے۔ یہ آگ کی جانب سے ایک ناقابل قبول تجاویز ہے جس نے بہر حال ختم ہونا ہے۔ مگر آگ کی حرمت کرنے کی خصلت بلوچ میں قرونوں تک جاری رہے گی، اس لیے کہ یہ ہمارے اجداد کا مذہب تھی۔

اسی طرح نیچارہ اور پندران کے علاقہ میں کئی پہاڑوں، چٹانوں اور قبرستانوں میں زرتشتی آثار موجود ہیں۔ خاران اور ماشکیل میں بھی زرتشتیوں کے آثار اور قبریں اس خطے میں اس مذہب کی موجودگی کی دلالت کرتے ہیں۔ کوئٹہ (شال) میں سرینا ہٹل کی تعمیر کے دوران تہہ خانوں کی کھدائی کے وقت ایسے آثار دریافت ہوئے جن سے زرتشتی معتقدات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

آفہ جنغ

آگ کی طرح پانی بھی کچھ بلوچ قبائل کا سپریم کورٹ رہا ہے۔ ملزم کو اپنی صفائی کے لیے پانی میں جانا ہوتا ہے۔ پانی کی ایک گہری جھیل میں ایک لمبی سوٹی ڈال دی جاتی ہے۔ ملزم کو اس ڈنڈے کے سہارے جھیل میں اترنا ہوتا ہے۔ اس کو اپنا سراس وقت تک پانی کے اندر رکھنا ہوتا ہے جب تک کہ دو منصف ایک مقررہ جگہ تک دوڑ لگا کر واپس جھیل کے کنارے تک آجائیں۔ اگر ملزم کا دم دوڑنے والوں کی دوڑ ختم ہونے سے قبل گھٹ جائے اور وہ سانس لینے کے لیے اپنا سر باہر نکال لے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ پانی نے اسے مجرم قرار دے کر اسے اپنے اندر رہنے نہیں دیا۔

یہ رسم بھی کچھ چھوٹے قبیلوں میں مروج ہے۔ بڑے اور وزن دار قبیلوں میں ”پانی

شریف“ سے چیف جسٹس کا کام نہیں لیا جاتا۔

13۔ دستار و داڑھی

بلوچ ویلیو سسٹم میں ضروری ہے کہ دستار و داڑھی کو بطور شان و وقار عزت دی جائے۔ اگر منت سماجت کی آخری حدود کو چھونا ہو تو اُس کی داڑھی یہ ہاتھ رکھ کر یا اپنی دستار اتار کر اس کے پیروں پہ ڈال کر عرض کریں تو ایک باوقار بلوچ بہت کچھ تنج کر بھی اس کی التجا منظور کرے گا۔ وہ پورا کرے گا۔ اگر دشمنی کی انتہا کرنی ہو تو اس کی داڑھی پکڑیں یا نوچیں، یا پھر اُس کی پگڑی گرا دیں یہ گویا موت جتنی دشمنی کو دعوت دینا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی قول دینا ہو تو اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جو قول دیا جائے گا وہ بہت ہی معتبر گردانا جائے گا۔

اگر دو گروہوں یا قبائل میں خون ریز جنگ ہو رہی ہو اور کوئی بلوچ اپنی پگڑی اتار کر لمبائی میں بچھا دے تو کوئی بھی شمشیر زن اُس کو پھلانگ کر دوسری طرف حملہ نہیں کرے گا۔ یہ گویا جنگ بندی کا تیرہ ہدف نسخہ ہوا کرتا تھا۔

کوئی بہت بڑی منت (جی ہاں غیر معمولی منت) مانگتی ہو تو داڑھی مونڈ دی جاتی ہے۔ بہت ہی گری ہوئی دشمنی میں بھی کسی کی داڑھی مونڈ جاتی ہے۔ مگر اس طرح کے معاملات بہت ہی انتہائی اقدامات ہوتے ہیں جو کہ شاذ و نادر ہوتے ہیں۔

14۔ بیماری کے عقائد

ہُدو

بلوچوں کو جھاڑ پھونک پر بھی بہت اعتقاد ہے۔ دم کرنے کو جھاڑ کہتے ہیں جبکہ تھوک مارنے کو ”ہُدو“ کہتے ہیں۔

جھنڈ جنغ

کچھ لوگ مریض کے پاس آ کر موسیقی کی دھنوں پہ ناچتے ہیں اور ناچتے ناچتے بے ہوش ہو جاتے ہیں، ہوش میں آ کر وہ بتا دیتے ہیں کہ آیا وہ کرامت کے زور پر مریض کو ٹھیک کر سکتا ہے یا نہیں (انہیں ”شیھ“ کہتے ہیں)۔ اس عمل کو ”جھنڈ جنغ“ کہتے ہیں۔

تعویذ

ملا کی عدم موجودگی، یا کم کم موجودگی کے باعث تعویذ والا معاملہ کوئی زیادہ نہیں ہے۔ اس کے حصول کے لیے دور دراز سفر کر کے مشہور ملا کے پاس جایا جاتا ہے۔ تعویذ صرف بیماری کے علاج کے لیے نہیں لیا جاتا بلکہ اس سے بچاؤ کے لیے بھی۔ تیج بند والا تعویذ رکھنے والا شخص جنگ میں زخمی ہونے سے بچ جاتا ہے۔ تعویذ زن بازی میں کامیابی کے لیے بھی لیا جاتا ہے۔ المختصر باور یہ کیا جاتا ہے کہ یہ زندگی کے تمام معمولی اور غیر معمولی حادثات کا تریاق ہے۔ اسے روزانہ پانی میں بھگو کر پیا بھی جاتا ہے اور تین یا سات پوشوں میں لپیٹ کر گلے، یا بازو میں باندھ بھی دیا جاتا ہے۔

جاگرو

مریض کی تیمارداری اور بالخصوص اُس کی سخت حالت میں اس پر شب بیداری انسانی بھائی چارے کی ایک زبردست مثال ہوتی ہے۔ رشتہ دار، ساتھی معتمد اور احباب دوست تشویش، مشوروں اور سوالوں کے ساتھ مریض پہ سخت رات جاگ کر گزارتے ہیں۔

علاج معالجہ

بلوچ کا علاج معالجہ مانتھا لوجی اور بہت ہی ابتدائی سائنسوں کا مجموعہ رہا ہے۔ بہت ہی عملی مگر بہ یک وقت بہت ہی مافوق الفطرت.....

داغ: بلوچ بہت ساری معلوم اور نامعلوم بیماریوں کے لیے لوہا گرم سرخ کر کے پیٹ، سر، یا گردن کو داغتا ہے۔ ٹائیفاؤڈ، جگر کی بیماریاں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اب آٹھ دس سال سے داغ دینے کا کوئی کیس یا واقعہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ سائنس کی روشنی بھاری ہوتی جا رہی ہے۔ اور علاج کا ہسپتال والا طریقہ تیزی سے رواج پاتا جا رہا ہے، گوکہ اچھے ہسپتالوں کی کمی ہے، علاج پرائیویٹ اور

مہنگا ہو چکا ہے اور عام آدمی کی قوت خرید بہت گھٹ چکی ہے۔

پوست: فالج، صفراء، بخار اور دیگر درجنوں بیماریوں کے لیے مخصوص عمر کی بھیڑ یا بکری ذبح کر کے مریض کو کھال پہنائی جاتی ہے۔ اس آنے کی صورت میں کھال جسم کے ساتھ مکمل طور پر چٹ جاتی ہے اور پسینہ آ جاتا ہے۔

کرہ شید: ٹی بی کے لیے گدھی کا دودھ پلایا جاتا ہے۔

اوجھ: بہت سے لوگ لاغر کرنے والی بیماریوں کی صورت میں گائے کی اوجھری میں موجود غلاظت کے اندر مریض کو دو تین گھنٹے تک لٹا دیتے ہیں جسے ”اوجھ“ کہتے ہیں۔ کئی بیماریوں کے لیے گندم کی گرم روٹی یا مرغی کوٹ کر سر پر باندھ لی جاتی ہے۔

ماندری: ”ماندری“ سانپ کے کاٹے کو اپنے دم چھو سے بھی ٹھیک کر سکتا ہے اور علاج سے بھی۔ لُند، مشک، سرخ، کالا اور کوہرا۔ اگر کسی کو سانپ کاٹے تو مرغی کے چوڑے پکڑ کر اس کی مقعد کو انسانی جسم کے سانپ کاٹنے والی جگہ پر رکھا جاتا ہے۔ مرغی کا چوڑہ اپنی مقعد سے زہر چوس لیتا ہے اور خود مر جاتا ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس چوڑے اس طرح مر جاتے ہیں، انسانی جسم سے زہر چوستے چوستے۔

جن کشغ: ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا عورت کو لائٹیوں سے بری طرح پیٹ کر اس کے ”جن“ نکالے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرچوں کی دھونی دے کر بھی اس کے جن بھگائے جاتے ہیں۔ پیراھی: مریض کی صحت مندی کے لیے پیر کے نام پر دنبہ، بکرا یا بیل ذبح کیا جاتا ہے یا ایسا کرنے کا عہد کیا جاتا ہے، اس کو ”پیراھی“ کہتے ہیں۔

دانست درد: 1000 سال قبل مسیح میں جہدیم ایشیائی باشندوں یعنی Assyrians نے تصور کر لیا تھا کہ دانست کا درد ایک کیڑے سے ہوتا ہے تو انہوں نے اس کے خلاف ایک منتر پڑھنا شروع کیا؛

جب آؤ دیوتا نے آسمان پیدا کیا اور آسمان نے زمین پیدا کیا اور زمین نے دریا پیدا کیے اور دریاؤں نے لہریں پیدا کیں اور لہروں نے دلدلی زمین پیدا کی اور دلدلی زمین نے کیڑا پیدا کیا۔

دوبارہ نکالتے ہیں اور اپنے آبائی قبرستان (جیرانز) میں تکریم کے ساتھ دفن کرتے ہیں۔

آس روخ

بلوچی زبان کا لفظ ہے جو آس بمعنی آگ، اور روخ بمعنی روشن (جلانا) ہے۔ کسی عزیز کی موت پر بلوچ تین یا سات دن تک چولہا نہیں جلاتا۔ سوگ میں کہ آگ اور اندھیرا، روشنی اور تاریکی انسانی سماجی زندگی کے استعارے ہیں۔ اس دوران پڑوسی اور دیگر عزیز اور دوست غم زدہ گھرانے کے لیے چائے کھانا لاتے ہیں۔

معینہ مدت کے ختم ہونے پر حسبِ توفیق ایک خیرات کی جاتی ہے جو عوام الناس کے لیے ہوتی ہے۔ اس خیرات کو، اور اس کے نتیجے میں گھر میں دوبارہ چولہا جلنے کی رسم کو ”آس روخ“ کہتے ہیں۔ یہ لفظ ایک ضرب المثل بھی ہے جہاں دشمن کی موت کی خواہش میں اُس کا ”آس روخ“ (موت کی خیرات) کھانے کی خواہش کی جاتی ہے۔

بلوچوں میں چالیسواں نہیں ہوتا لیکن پہلی برسی ضرور ہوتی ہے جسے ”سال“ بولتے ہیں۔ (اور یہی سال صرف اور صرف برسی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بلوچوں میں سالگرہ نہیں، ہوتی)۔

حوالہ جات

1- میکلیگن ای ڈی، روز ایچ اے۔ ترجمہ: یاسر جواد۔ ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا۔ 2004۔ بک ہوم لاہور۔

صفحہ 66

2- مبارک علی، بازار اور دوسرے مضامین۔ 1998، نگارشات، ٹمپل روڈ لاہور۔ صفحہ 73

3- گی، سلیم خان، بلوچی ادب..... بلوچی ثقافت۔ 1990، صفحہ 122

4- ایضاً۔ صفحہ 125

5- مری، مٹھا خان۔ ثقافت اور ادب وادی بولان میں، بزم ثقافت کوئٹہ، صفحہ 135

6- پہلوزودا/انور زاہدی۔ یادیں۔ 1996۔ غفران پبلی کیشنز لاہور۔ صفحہ 95

7- ساگاں، کارل۔ Cosmos۔ 1998۔ ایکس لندن۔ صفحہ 12

کیڑا روتے ہوئے اسی یوتا کے پاس گیا۔ ”آپ مجھے کھانے کے لیے کیا دو گے؟ آپ مجھے پینے کے لیے کیا دو گے؟“۔ ”میں تمہیں، خشک انجیر دوں گا اور زردالودوں گا“۔ ”میں ان کو کیا کروں گا خشک انجیر کو، زردالو کو! میرا درجہ بلند کرو اور دانتوں اور مسوڑھوں کے بیچ رہائش دے دو.....“۔

”او کیڑے چونکہ تم نے یہ کہا تھا کہ دیوتا تمہیں اپنے ہاتھ کی قوت سے مار ڈالے شاید دوسرے درجے کا بیڑا اور تیل ملاؤ تین دفعہ منتر پڑھو اور دوائی دانت پر رکھو۔“ (7)

یہ سارے علاج معالجے، تعویذ، ٹوٹکے مریض کی عیادت کے موقع پر ایجا دا اور سیلیکٹ کیے جاتے ہیں۔

عیادت

عیادت کا رواج بلوچ بھائی چارے میں اہم مقام رکھتا ہے۔ مریض کے عزیز واقارب جمع ہو جاتے ہیں، مریض کے اطراف ایک محفل جیسا مجمع لگا رہتا ہے۔ رات کو رت جگا یعنی ”جاگرو“ ہوتا ہے۔ گپ شپ، ہنسی مذاق، شور شرابا اور یہیں پر فقیروں اور پیروں کی کرامات کی تعریف، مرض میں احتیاط اور پرہیز کی داستانیں، طبیبوں کی دانائی، جڑی بوٹیوں کی اقسام، خوردنی اشیاء کی گرمی سردی، جونک، نسنے اور ہر طرح کے ٹوٹکوں پر کھلے عام بحث چلتی رہتی ہے۔ اور مریضوں پر یکے بعد دیگرے ہر نسخہ استعمال ہوتا رہتا ہے۔

15۔ موت کی رسوم

میت

بلوچ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اپنوں کی میت ہمیشہ اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہو۔ جنگ کے بھڑکے شعلوں میں بھی بلوچ اپنی میت نہیں چھوڑتے۔ اُسے کسی بھی طرح محفوظ رکھتے ہیں۔ اگر ساتھ لے جانا اُس وقت ممکن نہ ہو تب وہ اسے پتھروں میں عارضی طور پر دفن کر لیتے ہیں جسے ہم گرو (Grav) کہتے ہیں۔ ”امانت“ رکھی ہوئی میت کو ہنگامی حالت ختم ہونے کے بعد آکر